چھوٹی سوویت قومیتوں کے افسانے جن کی کوئی تحریری زبان اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے نہیں تھی

''رادوگا'' اشاعت گھر
ماسکو

فہرست

صفحہ

مرتبہ : یوگینیا اسبوویتس
ترجمہ : تقی حیدر
ڈزائن : آندرئی کوستین

ОНИ ОБРЕЛИ ГОЛОС

Рассказы писателей народов РСФСР, не имевших письменности до Великой Октябрьской социалистической революции

на яз. урду

They Found Their Voice
in Urdu

سوویت یونین میں شائع شدہ

O $\frac{70500-192}{031(01)-83}$ 724—82 4702010200

دوستی اور اخوت کا جھرمٹ

کچھ سال پہلے مجھے ہوائی جہاز کے ذریعے گروزنی سے ایلیست تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر سے پہلے میں شمالی قفقاز کی تقریباً ساری جمہوریوں کا سفر کر چکا تھا۔ میں بکسان کی گھاٹی اور کوہ البرز کی ترائی میں جا چکا تھا، دومبائی کی اور داغستان کے پہاڑی علاقے کی سیر کرچکا تھا، تیریک اور جارجیائی فوجی راستہ دیکھ چکا تھا۔ قفقاز کے تندرو اور پرفضا پہاڑوں کے بعد، طوفانی دریاؤں اور بیباک قفقازی ہریالی کے بعد قلماقیہ کے بےآب‌وگیاہ استیپ میں پرواز کرنا، مجھے ایسا لگا کہ: ناسمجھی کی حرکت تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ ویران استیپ میرے قفقاز کی خوبصورت اور دلچسپ سیاحت کے تاثرات کو خراب کر دےگا۔ لیکن ان دنوں استیپ میں بھی بہار آئی ہوئی تھی۔ تاحد نظر لالہ و کوکنار سے ڈھکا ہوا وہ کسی افسانوی، رنگ برنگے پھولوں والے قالین کی طرح بچھا ہوا تھا جس کے اردگرد قدیم ٹیلوں نے حاشیہ سا بنا رکھا تھا۔ اور استیپ کے خوشبودار سبزے میں بسی ہوئی تیکھی ہوا بیک‌وقت سرشار بھی کرتی تھی اور تازہ دم بھی۔ قلماقیہ کے استیپ نے نہ صرف یہ کہ سیاحت کے

دیکھے جو وھاں کے لوگوں کے لئے باعث مسرت ھیں اور جن پر انھیں بجا ناز ھے۔ آزاد انسان اپنے علاقے کی آزادی اور دولت کو دیکھ کر کس قدر خوش ھوتا ھے۔ یہ حسن، آزادی اور زندگی کی بنیادوں کی استواری مصوروں، رقاصوں اور موسیقاروں کے لئے وجدان کا خاص سرچشمہ ھیں۔ وہ اس بےحساب اور لازوال عوامی دولت کو اپنے آپ میں سموکر اور اسے اپنے محبت‌بھرے دل کے نہاں‌خانوں سے گزار کر احسان‌مندی کے ساتھ پھر عوام ھی کو لوٹا دیتے ھیں۔ لوٹاتے ھیں وہ گیتوں اور کتابوں کی صورت میں، رقصوں اور تصویروں کی صورت میں، جن کے بغیر صحیح معنوں میں عوامی زندگی کا تصور ھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس مختصر سی کتاب میں بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں سے بحرالکاھل کے ساحلوں تک اور بحیرۂ ابیض کے ساحلوں سے قفقاز کے برف‌پوش پہاڑوں تک وسیع و عریض روسی فیڈریشن میں بسنے والی قوموں کی بےانتہا متمول، کثیرپہلو اور رنگارنگ زندگی کی جھلکیاں ملتی ھیں۔ یہ حقیقت بہ‌جائے خود بہت معنی‌خیز ھے کہ اس کتاب میں اٹھارہ ادیبوں کے افسانے شامل ھیں جو اٹھارہ قوموں اور قومیتوں کی نمائندگی کرتے ھیں۔ آوار اور چوکچی، کباردینی اور یوکاگیر، قراچائی اور بریات، یاقوت اور مانسی، دارگینی اور اودیگے — ان کے درمیان ھزاروں میل کے فاصلے حائل ھیں، زبان کے اعتبار

تاثرات کو خراب نہیں کیا بلکہ انھیں دوبالا کر دیا۔

پھر اس کے بعد میں بریاتیہ گیا، جھیل بائیکال میں آبی جہاز پر سفر کیا جو بےمثال جھیل ھے اور اس کے نباتات و حیوانات بھی اسی طرح بےنظیر ھیں، جس میں تین سو سے زیادہ ندیاں اور دریا گرتے ھیں اور صرف ایک طوفانی اور تندمزاج دریائے انگارا نکلتا ھے۔ قفقاز کے پہاڑ جتنے بلند اور قلماقیہ کے استیپ جتنے وسیع و عریض ھیں اتنا ھی بائیکال کا پانی گہرا اور صاف و شفاف ھے جس سے بریات جمہوریہ کے ساحل دھلتے ھیں۔

خوش‌قسمتی سے بہار ھی کے دنوں میں مجھے ھیرے جواھرات کی سرزمین یاقوتیہ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ھوا۔ ھماری زمین کے انتہائی شمالی حصے کو جاڑوں کی طویل مدت میں تحمل سے کام لینے کے صلے میں گرمیوں کے مسلسل دنوں کا انعام ملا تھا۔ تائیگا میں ھم نے طلوع سحر کا سماں دیکھا۔ اس کی خاموشی اور پاکیزگی مسحورکن تھی۔ اس کے لامحدود حسن، یک‌گونہ حیا اور جھجک کو دیکھ‌کر انسان دم بخود رہ جاتا ھے، انگلیوں کی پوریں ٹھنڈی پڑ جاتی ھیں۔

مجھے اپنے ناپیدا کنار روس کے دوسرے علاقوں چوواشیہ، اودمورتیہ، توِوا اور بشکیریہ کا سفر کرنے کا بھی موقع ملا ھے۔ ھر جمہوریہ میں اس کے اپنے لاجواب دریا اور پہاڑ، جنگل اور استیپ

سوویت ریاست نے، جو خانہ‌جنگی کی وجہ سے بربادی، مفلسی اور محتاجی میں مبتلا تھی، کارخانوں اور فیکٹریوں کے ساتھ ھی ساتھ انتہائی تیز رفتاری سے اسکول تعمیر کئے، حروف تہجی مرتب کئے، مدرس تیار کئے اور زندگی کے پرانے تصور پر فیصلہ‌کن وار کیا۔ سوویت اقتدار کے اولیں ناظم، جیساکہ انھیں ھونا چاھئے تھا، اولیں معلم اور روشن‌خیالی کے پیامبر بھی تھے۔ اس عظیم محنت کے ثمرے ہزار چند ھوکر ملے۔ تیسری ھی دھائی میں بہت سی دورافتادہ قومیتوں میں اولیں ادیب نمودار ھو گئے۔ اپنی قوموں کے زبانی قصے کہانیوں اور گیتوں کو بنیاد بناکر اور روسی نیز عالمی ادب کے وسیع تجربے کو اپناکر اولیں مصنفین نے قدم بہ قدم فنکارانہ نظر، زندگی کی فنی سمجھ اور تحریر کی تہذیب حاصل کی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کی جگہ ادیبوں کی نئی پشت نے لےلی جو جوان تھے، تعلیم و تربیت رکھتے تھے اور متجسس تھے۔ اس پشت کو اپنے اپنے ادب کو ایک زینہ اوپر لے جانا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو جنگ میں حصہ لے چکے تھے اور کچھ نے محنت کے محاذ پر پختگی حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنی قومی روایتوں سے قطع تعلق نہیں کیا لیکن سطحی‌پن اور نمائشی انداز کو یکسر ترک کر دیا۔ ایک نظم کے بعد دوسری نظم اور ایک کے بعد دوسرے طویل افسانے کی تخلیق کرنے میں ان کا قلم مضبوط‌تر اور تواناتر

سے، قومی رسم و رواج اور روایات کے اعتبار سے وہ الگ الگ ہیں لیکن اپنی سرزمین سے، اپنے عوام سے، اپنے واحد اور ناقابل تقسیم سوشلسٹ وطن سے محبت ان سب کو متحد کرتی ہے۔ یہ فرزندانہ محبت زیرنظر مجموعے کے ہر افسانے میں رچی بسی ہوئی ہے۔

اس ایک جلد میں آپ کو ادیبوں کے ناموں کا پورا ایک جھرسٹ ملےگا: رسول حمزاتوف، علیم کیشاکوف، احمدخان ابوبکر، یوری ریتخیو، سیمیون کوریلوف، سالچک توکا، یووان شیستالوف، ولادیمیر سانگی، گینادی کراسیلنیکوف... ان مصنفین کی کتابیں سوویت قارئین میں ایک عرصے سے مقبول ہیں اور ان میں سے بہتوں کی تصنیفات کے ترجمے دوسرے ملکوں میں بھی کثیر تعداد میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان ناموں کے بغیر کثیرقومی سوویت ادب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا حالانکہ ان قوموں کی تحریری زبانیں صرف چند دھائیاں پہلے، عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد ہی وجود میں آئی ہیں۔ تحریری زبان کی وجودپذیری سے بالغ و پختہ تخلیقی ادب تک کا راستہ بہت کٹھن اور خاردار ہے۔ بہت سی قوموں کو یہ راستہ طے کرنے میں صدیاں لگ گئیں۔ نئے تحریری ادب کا جنم اور تیزرفتار ارتقا سوویت اقتدار کے سب سے نمایاں کارناموں میں سے ایک ہے۔

چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے ادب کے بارے میں سوچنے سے پہلے ضرورت اس کی تھی کہ انھیں لکھنا پڑھنا تو سکھایا جائے اور بالکل ہی کمعمر

برداشته هوئے که انهوں نے اپنا ساز توڑ ڈالا، گاؤں سے چلے گئے اور پھر برسوں تک وهاں نہیں آئے۔ پھر وہ اس گاؤں تب آئے جب انهیں یه خبر ملی که اس نوعمر اسکولی طالب علم کے والد جنگ میں مارے گئے۔ بوڑھے جہاں گشت مغنی اس بے سہارا خاندان کے سرپرست بن گئے۔ تیرہ‌ساله لڑکا بوڑھے مغنی سے اس طرح مانوس هوگیا جیسے وہ اس کے سگے دادا هوں اور اس نے ان کے گیتوں کو قلمبند کیا۔ یه جرأت اور محبت کے گیت تھے جو سارے عوامی تہواروں میں گائے جاتے تھے۔ اور جب اسکولی طالب‌علم احمدخان ان پڑھ بوڑھے مغنی کو ان کے گیت پڑھ کر سناتا تو وہ حیران رہ جاتے۔ انهیں کسی طرح یقین هی نه آتا که ان چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں جیسی شکلوں میں، جو نظر بھی مشکل سے آتے هیں، انسانی دل کے کرشمے یعنی گیت کو ڈھالا جا سکتا ہے۔

نوعمر احمدخان اگر بچپن هی سے دھات پر نقاشی کرنے کا فن نه سیکھتے تو کوباچی‌والے هی نه هوتے۔ اس گاؤں میں پرانے زمانے سے مرد کی زندگی شروع هونے کا دن اس دن سے گنا جاتا تھا جب انسان ٹھیئے کے پاس کھڑا هوکر اپنا یه نیک کام سیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ احمدخان ابوبکر نے اس فن میں پہلا سبق اپنے والد سے لیا تھا اور سات سال سے ٹھیئے کے پاس کھڑے هوکر کام کر رہے تھے۔ ان کا پہلا کام کان

ہوتا گیا۔ ان کی کتابوں کے صفحات سے عوامی
زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ابھریں، کھرے انسانی
کردار نمودار ہوئے جن کی عکاسی ہر پیچیدگی
کے ساتھ اور ساری اخلاقی دولت کے ساتھ کی گئی تھی۔
حقیقی زندگی ان کے افسانوں، طویل افسانوں
اور ناولوں کے لئے اچھی بنیاد فراہم کرتی ہے۔
دارگینی نثرنگار احمدخان ابوبکر داغستان کے پہاڑی
گاؤں کوباچی میں پیدا ہوئے جو اپنے سناروں اور
دھات پر نقش بنانےوالوں کے لئے مشہور تھا۔
قدیم پہاڑ، ان پر چھائے ہوئے جنگلی پھلدار
پیڑوں کے جنگل، برف جیسے ٹھنڈے پانی کے
چشمے، پہاڑی چراگاہیں اور طرح طرح کے پھولوں
کی فراوانی — یہ سب کنگنوں، انگشتریوں اور طوقوں
پر باریک اور پیچیدہ آرائشوں میں ڈھل جاتا تھا۔
اس بچے کی پیدائش کے وقت جو آگے چل کر
ادیب بننےوالا تھا، مشہور جہاں گشت مغنی اورارا
کے احمدخان اس پہاڑی گاؤں میں آ پہنچے اور
اس بچے کا نام انھیں کے نام پر رکھا گیا۔ بوڑھے
مغنی اس بات سے بہت ہی خوش ہوئے اور انھوں
نے دعا دی کہ بچہ بہت بڑا عوامی مغنی بنے۔
بچے کے عزیزوں کو یہ بات بہت بری لگی۔ وہ تو
یہ چاہتے تھے کہ بچہ بڑا ہوکر نقاش بنے۔ ان
لوگوں کو مکر و ریا کی عادت تو تھی نہیں،
انھوں نے یہ بات بوڑھے مغنی سے بھی کہہ دی اور
ان کو یہ بہت برا لگا۔ بوڑھے مغنی اتنے دل

دوسرے رشتے داروں کو بھیجیں۔ بوڑھے مغنی پڑوس کے بچوں کے پاس گئے جنھوں نے اس کتاب کے صفحات پڑھ کر انھیں سنائے اور انھیں یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ اس کے خاص کردار تو وہ خود اور ان کی جان پہچان کے لوگ ہیں۔ کوباچی کے لوگ اپنے ہم‌وطن پر بڑا ناز کرتے ہیں چاہے وہ اس بات کو تسلیم نہ کرنا چاہیں۔ ان کی چچازاد بہن نے ان کو جواب دیا تھا کہ ''کتاب تو کسی بھی دکان میں خریدی جا سکتی ہے، تم ایسا طوق بنانے کی کوشش کرو جیسا کسی نے کبھی نہ دیکھا ہو''۔ لیکن ہم‌وطن کوباچی والے دوسروں سے بہتر جانتے ہیں کہ پہاڑ والوں کے بارے میں ایسی مسرت بخش اور زندگی سے بھرپور کتاب صرف احمدخان ابوبکر ہی لکھ سکتے ہیں۔

احمدخان ابوبکر کے شہری مکان میں، جو مخچ قلعہ میں ہے، لکھنے کی میز کے پاس ہی ایک ٹھیئا رکھا ہے جس پر نقاش کے تمام اوزار جمع ہیں۔ اور احمدخان کبھی میز پر کام کرتے ہیں اور کبھی ٹھیئے پر اور زندگی کی حیرت‌انگیز خوبصورتیوں کی تخلیق کرتے ہیں۔

قارئین کی کانفرنسوں میں، مزدوروں اور اجتماعی کسانوں کے ساتھ ملاقاتوں میں، اسکولی بچوں اور طالب علموں کے درمیان انھیں اکثر تقریر کرنی پڑتی ہے اور ریڈیو اور ٹیلی‌ویژن پر بھی وہ

کے آویزے تھے جو جنگلی بابونہ کی شکل کے تھے۔ اس میں بہت کچھ خامی تھی لیکن بہرحال یہ آویزہ تھا اور اسے کسی لڑکی کے کان میں پنھایا جا سکتا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور کیسی کیسی آرائشیں انھوں نے تخلیق کیں، گلاب اور انگور کا خوشہ، دھنک اور چاند، پہاڑ اور ابلتے ہوئے چشموں کا موہوم سا خاکہ اور... کنگن اور انگوٹھیاں، کردھنی اور طوق لوگوں کے لئے خوشی کا سامان بنے، ان کی زینت ہوئے اور نوجوان کاریگر اپنے کام سے خوش اور مطمئن ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے انسان کا ناقابل تسخیر مقدر اور لوگوں کی پیچ درپیچ دنیا اپنی طرف متوجہ کرتی تھی اور وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ یہاں نقاش بےبس ہے۔ اس کا بار تو صرف الفاظ اٹھا سکتے تھے، تازہ، طبعزاد، عوامی الفاظ۔ اور احمدخان نے بڑے تحمل اور استقلال کے ساتھ نیا فن سیکھا۔ انھیں بوڑھے مغنی احمدخان کے گیتوں اور لوک کہانیوں سے مدد ملی، ماسکو کے ادبی انسٹی‌ٹیوٹ نے ان کی مدد کی لیکن اس نئے پیشے میں ان کی کامیابی میں سب سے زیادہ اہمیت خود ان کی روزانہ کی، صبح سویرے سے رات گئے تک، محنت کی، محاکات کے حامل الفاظ کی انتھک تلاش کی تھی۔

اپنی کتاب کی اولیں جلدیں انھوں نے بوڑھے مغنی احمدخان کو اور اپنے گاؤں کوباچی کے
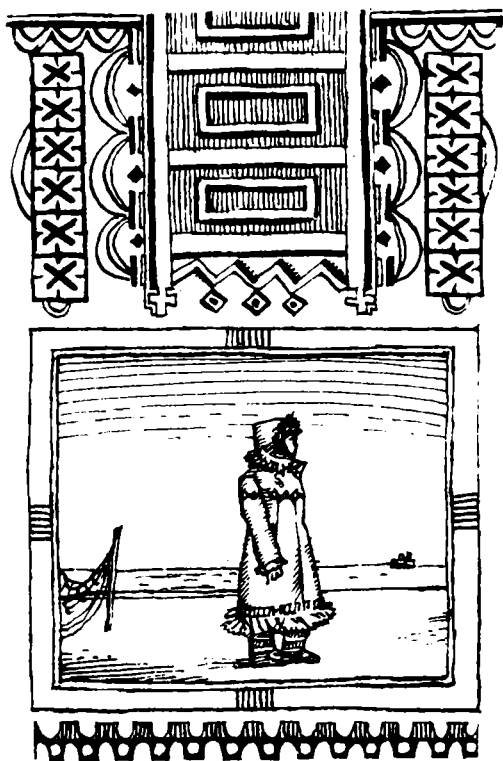
یوری ریتخیو

بادبان

اکثر آتے رہتے ہیں۔ اور پھر صرف اپنے آبائی داغستان ہی میں نہیں بلکہ ماسکو، لینن گراد، کیئف اور ہمارے وسیع و عریض ملک کے دوسرے دسیوں شہروں میں جہاں انہیں کتب‌خانوں اور کلبوں میں مدعو کیا جاتا ہے اور جانے کتنی جگہوں پر خود ان کا تخلیقی تجسس انہیں کھینچ لےجاتا ہے۔

سچے ادیب کی تخلیق بھی یکتا ہوتی ہے، اتنی ہی یکتا جیسے اس کی شخصیت اور اس کی جہاں‌بینی۔ اب قارئین کے سامنے اس مجموعے کے ایک ادیب کے مقدر کی مثال پیش کر دینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں سبھی ادیب عوام کی توجہ کا مرکز ہیں۔ اس کتاب کے بہت سے مصنف اپنی اپنی جمہوریوں میں شہری یا اعلی سوویت کے رکن ہیں۔ رسول حمزاتوف اور علیم کیشاکوف تو ہماری ریاست کے بلندترین ایوان، سوویت یونین کی اعلی سوویت میں اپنے عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادیبوں کو عزت و احترام، شہرت اور عام اعتماد حاصل ہے۔

اس کتاب کے مسودے کو پڑھ کر مجھے ایسا لگا کہ میں پھر انہیں علاقوں میں پہنچ گیا ہوں اور اپنے پرانے دوستوں سے ملا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین بھی ہماری جمہوریوں کی زندگی سے روشناس ہوکر خوش ہوں‌گے۔

میری تمنا ہے کہ آپ کو ان دور دیسوں کا سفر اور وہاں کے باشندوں سے تعارف مبارک ہو!

دور سے سنائی دینے کی وجہ سے مدھم ہو گئی ہو۔
بڑے سے اسٹیج پر کرسیاں موسیقاروں کا انتظار کر رہی تھیں اور دور کے ایک کونے میں ڈبل باس* دیوار سے ٹکے کھڑے تھے جیسے کام شروع کرنے سے پہلے آرام کر رہے ہوں۔
بلوریں فانوسوں کی روشنیوں میں ڈوبا ہوا، سفید ستونوں‌والا ہال دھیرے دھیرے بھرتا جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑکر دیکھا کہ لوگ کرسیوں کی قطاروں کے پیچھے پچھلی دیوار تک بالکل سٹے ہوئے کھڑے تھے۔
روشنیاں ہلکی ہوئیں اور اسٹیج کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس روشن ہو گیا، موسیقی کے اسٹینڈ جگمگا اٹھے، جھانجوں پر چنگاریاں سی دمک اٹھیں اور بڑے ڈھول پر چڑھی ہوئی موتیا سفید جھلی پر ہلکی سی آب دوڑ گئی۔
اسٹیج کی پشت پر کے دو دروازوں پر پڑے ہوئے سرخ مخملیں پردے کھلے اور دو قطاروں میں موسیقار اسٹیج پر آنے شروع ہوئے۔
اس خوبصورت ہال میں آنے کا یہ میرا پہلا موقع نہ تھا۔ لیکن اس خاص رات کو میں ہمیشہ سے زیادہ ہیجان میں تھا اور کنسرٹ شروع ہونے تک

---

* ڈبل باس ـــ وائلن کے زمرے کا سب سے بڑا ساز۔ ایڈیٹر

لینن گراد کی سڑکیں ایک سفید دھند سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ دھند سر بلند عمارتوں پر چادر کی طرح لپٹی ہوئی تھی، ٹیلی گراف کے تاروں پر ٹنگی ہوئی تھی اور پارکوں اور باغوں پر چھائی ہوئی تھی۔ گریبوئیدوف نہر پر بنے ہوئے اطالوی پل پر دھند کی نقاب میں سے جھلملاتی ہوئی لالٹینوں کے گرد ایک دمکتا ہوا ہالہ بن گیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی قصے کہانی کی تصویر ہو۔

میں نے پل پار کیا اور راکوف اسٹریٹ پر فلہارمونک سوسائٹی کی طرف چلا جہاں اتنی دور سے بھی نظر آ رہا تھا کہ صدردروازے پر ایک بھیڑ جمع ہو گئی ہے، اس امید میں کہ شاید ٹکٹ مل جائے۔

میرے بائیں ہاتھ کو کلا چوک میں پالے سے جم جانےوالی برف سے ڈھکے ہوئے پیڑوں کے بیچ میں پوشکن کا ایک کانسے کا مجسمہ نصب تھا...

میں نے اپنا اوورکوٹ کلوک روم میں جمع کرایا اور سیڑھیوں سے چڑھ کر بائیں طرف کی بالکنی پر آ گیا۔

نیچے اسٹال سے جہاں لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے، ایک شور سا اٹھ رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے سمندر کی اٹھتی ہوئی بلند لہریں ساحل سے ٹکرا رہی ہوں اور ان کی آواز کہیں

سیاہ کوٹ کے پچھلے دامن ان کے پیچھے لہراتے
رہے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بھینچے ہوئے تھے
اور ان کی تنی ہوئی انگلیوں کی بےصبری میں
ایک خاص طاقت سی لگ رہی تھی۔ وہ اپنے مقام
پر آ گئے اور انھوں نے اپنی چھڑی اٹھائی۔

موسیقی سنتے ہوئے میں نے اپنے پچھلے چند
دنوں کے تاثرات کی، روسی میدانوں کی پہنائی
اور برف سے ڈھکے ہوئے گہرے سبز جنگلوں کی
گہرائی کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی۔

اور اچانک میرے احساس کی گہرائیوں سے
ایک اور تصویر ابھری — ایک بہت بڑا سفید بادبان
جسے سمندری ہوا نے پھیلا دیا ہو۔ مجھے خود
تعجب ہوا کہ یہ تصویر کیوں میرے ذہن میں
آئی۔ کیا اس لئے کہ اس ہال کے سفید ستون کچھ
کچھ لپیٹے ہوئے بادبانوں سے ملتے جلتے تھے؟ یا
موسیقی میں سمندر کی سی آواز تھی؟ نہیں، کوئی
اور ہی بات تھی۔ کوئی سچ‌سچ کا واقعہ تھا۔
کبھی بہت پہلے ہوا تھا اور اب اچانک میرے
حافظے میں ابھر آیا تھا۔ یقیناً یہ میرے تحت شعور
کی یاد تھی تب کی جب میں نے یہ سمفنی پہلی
بار اپنے لڑکپن میں سنی تھی، جب "فلہارمونک
سوسائٹی" کے معنی بھی مجھے نہ معلوم تھے اور
جب میری ساری دنیا میرے آبائی گاؤں اوئیلین کے

کا ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ میں یوں
ساز کے تار کی طرح تنا ہوا غالباً اس وجہ سے
تھا کہ میں نے بہت دنوں سے سمفنی آرکسٹرا نہ
سنا تھا۔ اور دوسری چیز یہ تھی کہ میں ابھی
ابھی میخائیلوفسکویے سے واپس آیا تھا جہاں کل
ہی برف سے ڈھکے ہوئے پارک میں گھومتا پھرا تھا،
جانے کتنی بار پتھر کی سیڑھیوں پر چڑھ کر
پوشکن کی قبر پر نصب سنگ‌سرمر کی لوح تک
گیا تھا۔ وہاں سے روسی دیہات کا حیرت انگیز
منظر دکھائی دیتا تھا، اور برفانی سرد نیلگوں
ہوا میں جنگل کی دوسری طرف کے گھروں کے
اوپر دھوئیں کی کلغیاں نظر آتی تھیں۔ اس
جگہ کو چھوڑنے کا میرا جی نہ چاہتا تھا۔ اور
اب میں یہ امید کر رہا تھا کہ یہاں آکر چائیکوفسکی
کی پہلی سمفنی سنوں‌گا تو تصور میں روس کے
اسی عجیب و غریب سادہ و بےتصنع حسن کی ایک
جھلک پھر سے دیکھ سکوں‌گا جسے میں نے پوشکن
پہاڑیوں کے کھیتوں اور جنگلوں میں دل‌وجان سے
محسوس کیا تھا۔ جتنے دن میں نے وہاں گزارے
تھے وہ فروری کے سورج کی دمک میں، برف کی
جگمگاہٹ میں اور گہرے سبز جنگلوں کے جادو
میں ڈوبے ہوئے تھے...

تالیوں کی گونج مجھے خیالوں کی دنیا سے
زمین پر لےآئی۔ موسیقی کے کنڈکٹر تیزی سے
چلتے ہوئے اپنے مقام کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے

چچا کو اچھو لگ گئی، انھوں نے اپنا مگ سنبھال کر میز پر رکھا اور پوچھا:

''تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کچھ کہا نہیں، صرف پوچھا تھا کہ فنکار کے کیا معنی ہوتے ہیں؟''

چچا نے جواب دیا، ''مجھے نہیں معلوم''۔

میں نے سوچا کس قدر تعجب کی بات ہے۔ میرے چچا تو اتنا زیادہ جانتے ہیں۔ وہ تو روسی بھی بول سکتے ہیں، مشکل سے سہی تو کیا ہوا، اور اجتماعی فارم کی میٹنگوں میں اتنی اچھی تقریر کرتے تھے، اور رات کو جب چربی کے دیے میں بتی جل کر گل ہو جاتی تو وہ مزے سے روحوں سے بات کرتے تھے، انھیں کی زبان بولتے تھے اور اپنا طنبور ہلاتے رہتے تھے۔

جہاز آنے میں دو دن تھے یعنی یہ پتہ چلانے کے لئے کافی وقت تھا کہ ''فنکار'' کے معنی کیا ہوتے ہیں۔

عام طور سے جہاز ہر قسم کا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں لاتے تھے۔ مثلاً پچھلے سال وہ مشینیں لائے تھے جن پر ہمارا اخبار ''سوویت اوئیلین'' چھپتا ہے۔ ہر بار جب جہاز آتا تو گاؤں میں بہت سی نئی اور انوکھی چیزیں نمودار ہو جاتیں: گراموفون، تیل کے اسٹوو، ٹوٹ کے بند ہو جانے والی چھریاں اور پتہ نہیں کیا کیا۔

سرے پر بنے ہوئے یارانگاؤں* کے گھیرے میں محدود تھی۔

ان دنوں میں ھمارا گاؤں سمندر میں دھنسی ہوئی خشک زمین کی ایک پٹی پر بنے ہوئے یارانگاؤں کی دو قطاروں پر مشتمل تھا۔ لکڑی کی بس تین عمارتیں تھیں جو ھمیں بہت ھی زبردست لگتی تھیں۔ ایک ضلع سوویت کی عاملہ کمیٹی کی عمارت تھی جو پہاڑ کے دامن میں بنی تھی، دوسری میں اسکول تھا اور تیسری چھوٹی سی گول عمارت میں ساحلی جھیل کے پاس جنرل اسٹور تھا۔

ریڈیواسٹیشن اسکول میں تھا۔ ایک دن میں وھاں جھنجھناتے ہوئے تاروں کے نیچے کھڑا تھا کہ ریڈیوآپریٹر کو چچا سے کہتے سنا: "ایک جہاز آ رہا ہے، اور اس پر فنکار آ رہے ھیں۔"

میں یہ تو جانتا تھا کہ جہاز کیا ھوتا ہے لیکن یہ بالکل نہ سمجھ پایا کہ اس پر کیا آ رہا ہے۔ اس دن رات کے کھانے کے بعد جب چچا اپنے تام چینی کے بڑے مگ سے چائے پی رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ "فنکار کے کیا معنی ھوتے ھیں؟"

---

* یارانگا — چوکچی لوگوں کے خیمے نما گھر جو لکڑی کے ڈھانچوں پر کھالیں چڑھا کر بنائے جاتے تھے۔ ایڈیٹر

''وہ بس دن بھر ٹھہریں گے،، اسکول کے هیڈماسٹر
نے جواب دیا۔ وہ لینن گراد کے رهنے والے تھے اور
وئیلین میں روسیوں میں اکیلے آدمی تھے جو
چوکوت زبان بولتے تھے۔
''کچھ لوگ آخر خوش قسمت هوتے هیں نہ،
ساری زندگی بس ساز بجاتے هیں!،، ریپل نے صاف
صاف رشک کے ساتھ کہا۔ انھیں معلوم هوا تھا
کہ موسیقاروں کو آرکسٹرا میں ساز بجانے کے لئے
تنخواہ ملتی هے۔
اس دن میرے چچا نے فیصلہ کیا کہ اپنے
یارانگا پر نئی کھالیں چڑھا دی جائیں جو زمین
میں گڑی هوئی والرس کی پسلیوں پر پھیلا کر سکھا
دی گئی تھیں اور اب کافی دنوں سے تیار تھیں۔
جب پرانی کھالیں اتاری گئیں تو همارا یارانگا
بالکل ننگا هو گیا اور اس کا دھوئیں سے کالا
ڈھانچہ نظر آنے لگا۔ گھر کے اندر دھوپ بھر
گئی، کتے کا اون نظر آنے لگا جیسے انسانی پاؤں
نے روند روندکر کچے فرش میں بٹھا دیا تھا اور
گرمیوں کی مستانی هوا دروازے پر پڑے هوئے
سمور کے پردے سے اٹکھیلیاں کرنے لگی۔
پڑوسی میرے چچا کی مدد کو آ گئے اور
سب نے مل کر کام جلد هی ختم کر دیا۔ اب
یارانگا کے اندر بہت آرام‌دہ اور پرسکون هو گیا
تھا۔ سورج کی خوشگوار دمک اوپر کے روشندان
میں سے اندر گھس آئی۔ چھت پر چچا کے چلنے

اور بہت سے نئے لوگ بھی اوئیاین میں رھنے کے لئے آ گئے — ضلع سوویت کی عاملہ کمیٹی کے صدر، ریڈیوآپریٹر، بیکری کے نگراں جن کا نام تھا پاولوف اور اسکیمو دکاندار ایمو۔

گاؤں سے قطبی اسٹیشن جائیں تو بیچ میں ایک ہوا ٹربائن پڑتی تھی۔ اسے بھی ایک جہاز ھی لایا تھا۔

جس دن میں نے ریڈیوآپریٹر سے خبر سنی تھی اس کے دوسرے دن میں نے دریافت کیا کہ فنکار بھی لوگ ھوتے ھیں۔ مزے کی بات تھی۔

جہاز کے آنے کا وقت جیسے جیسے قریب آتا گیا ویسے ویسے آنےوالے فنکاروں کی باتیں زیادہ ھونے لگیں اور ان کے بارے میں کچھ تفصیلات بھی معلوم ھوئیں۔ ایک چیز پر سب کو حیرت تھی کہ لوک ساز بجانےوالے اتنے بہت سے موسیقاروں کو اوئیلین جیسے چھوٹے سے گاؤں میں لانے کی کیا ضرورت تھی جہاں ایک اکارڈین بجانےوالے سے، جو قطبی اسٹیشن میں مستری تھا، ان کا کام مزے میں چل جاتا تھا؟

"پتہ نہیں، شاید وہ لوگ یہاں بس جانے کا منصوبہ بنا رھے ھوں؟"، ریپل نے پوچھا جو پہلے شمن* تھے اور اب اجتماعی فارم کے شوقیہ فنی حلقے کے نگراں تھے۔

---

* شمن — ٹونے ٹوٹکے کرنےوالے قبائلی مذھبی پروھت۔ ایڈیٹر

طرف دوڑتا ہوا چلاتا جا رہا تھا اور وہاں لوگ ایک وھیل کشتی میں سوار ہونے شروع ہو گئے تھے۔
پورے گاؤں سے لوگ دوڑتے ہوئے آ گئے۔ بوڑھے گویے رینتی گیرگین بھی، جن کی آواز جاتی رہی تھی اور جنھیں دکھائی بھی بہت کم پڑتا تھا، اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں پر چلے آ رہے تھے۔ انہیں جہاز نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ سیٹی کی آواز کو پکڑنے کے لئے ادھر ادھر مڑکر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔
جہاز کنارے کے قریب آ گیا اور ہم عرشے پر جمع لوگوں کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اتنی دور سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سے چہرے فنکاروں کے ہیں اور خیر مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ اور عام آدمیوں میں فنکاروں کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے۔
ہماری اجتماعی فارم کی وھیل کشتی جہاز کے سیاہ ڈھانچے کے مقابلے میں ایک سفید نقطے کی طرح لگ رہی تھی۔ اب وہ وہاں سے چلی، جیسے وھیل کا بچہ اپنی ماں سے الگ ہو رہا ہو، اور ساحل کی طرف روانہ ہوئی۔ اس میں بہت سے مسافر تھے اور یہاں سے بھی نظر آتا تھا کہ بوجھ کی وجہ سے کشتی کا پیٹا کافی پانی میں دھنس گیا تھا۔
میں نے آنکھیں گڑو دیں، اس امید میں کہ

کی اور چھیدوں کو سیل کے پکھوڑے کی ھڈیوں
سے بند کرنے کی آواز آ رھی تھی۔ پھر ان کے
تنومند ڈیل کی پرچھائیں نے روشنی کو ڈھک
لیا اور مجھے ڈر لگنے لگا کہ وہ انجانے میں نئی
کھال میں دھنس جائیں گے اور سارا مزا کرکرا
ھو جائے گا۔

لیکن سب کچھ ٹھیک ٹھاک ھو گیا۔ چچا
نے بغیر کسی گڑبڑ کے کام ختم کرلیا اور ھم
سب چائے پینے بیٹھے۔

چچا نے اپنے مددگار دوستوں سے کہا کہ ”اگر
جہاز آ گیا ھوتا تو میں تم لوگوں کی خاطر
مدارات سچ سچ آگ جیسے پانی سے کرتا نہ کہ
چائے سے۔“

میں بیچ میں بول پڑا، ”لیکن جہاز پر تو فنکار
آ رھے ھیں۔“

اور اچانک، جیسے میری ھی آواز کی گونج
ھو، دور سے سیٹی کی بڑی لمبی آواز یارانگا
کے دھوپ سے دمکتے ھوئے روشندان میں گھس
آئی۔

”یہ جہاز ھے! فنکار آ رھے ھیں!“ میں نے
چلا کر کہا اور بھاگ کر باھر چلا گیا۔

پہلے تو مجھے افق پر صرف دھواں دکھائی دیا
اور اس کے بعد جہاز کا سیاہ ڈھانچہ پانی کے
اوپر ابھرنا شروع ھوا۔

”فنکار آ رھے ھیں! فنکار!“ میں ساحل کی

ئز حیرت کی بات یہ ہے کہ آرکسٹرا کے لیڈر
۔ کی بات سمجھ گئے۔
رینتی گیرگین انھیں لےکر چھ بڑی چٹانوں کے
پ۔ آئے جو زمین میں دھنسی ہوئی تھیں اور
بہن ہمیشہ سے تھیں۔ انھیں مقدس سمجھا جاتا
تھ ۔ شمنوں کے کرتوتوں کے خلاف جب ہمارے
ئوں میں سہم چلی تو یہاں سے لکڑی کے بت تو
کنھاڑ پھینکے گئے لیکن ان چٹانوں کو ایسے ھی
چھوڑ دیا گیا اس لئے کہ وہ بہت بھاری تھیں
ور زمین میں اتنی گہرائی تک دھنسی ہوئی تھیں
کہ انھیں گرانا یا کھودنا بہت مشکل تھا۔
رینتی گیرگین نے آرکسٹرا کے لیڈر کو بتایا،
''ہم اپنے گیت یہاں گاتے ھیں۔،،
ضلع عاملہ کمیٹی کے کارکن پیورا نے بوڑھے مغنی
کے ان الفاظ کا ترجمہ کیا۔
آرکسٹرا کے لیڈر نے چٹانوں کو دیکھا، پھر
سمندر کو اور ساحلی جھیل کی آئینے جیسی سطح
کو دیکھا جہاں سے گرمیوں کی خوشگوار ہلکی
ھوا کے جھونکے آ رہے تھے، اور بولے:
''بڑی اچھی جگہ ہے! ہم بھی اپنی پیش کش
یہیں کریں گے۔ ،،
رینتی گیرگین نے کہا، ''ہم آپ کے لئے زمین
پر بادبان بچھا دیں گے۔ ،،
''بہت ھی اچھا ہوگا!،، آرکسٹرا کے لیڈر نے کہا۔
وھیل کشتی موسیقاروں کو جہاز سے لانے چلی گئی

ان لوگوں میں فنکاروں کو پہچان لوں گا۔ لیکن کشتی جیسے جیسے پاس آتی گئی ویسے ویسے میری یہ اسید کم ہوتی گئی کہ میں اوئیلین آنےوالے غیرمعمولی سہمانوں کوسب سے پہلے پہچان لوں گا اس لئے کہ یہ تو سبھی دیکھ رہے تھے کہ اس میں کے لوگ معمولی چوکچی اور روسی تھے۔

انھیں میں فنکار بھی تھے لیکن انھیں میں نے نہیں پہچانا۔ ہیڈماسٹر نے ان میں کے خاص فنکار کی طرف اشارہ کیا — جو آرکسٹرا کے لیڈر تھے۔ وہ نوجوانوں کی سی پھرتی سے اچک کر ساحل پر آ گئے اور منتظر لوگوں کو انھوں نے سلام کیا۔ ان کا چہرہ دبلا اور لمبوترا تھا۔ ان کے بال سفید تھے اور ان کے نوجوان چہرے پر عجیب سے لگتے تھے۔ وہ کنکری‌دار ساحل پر تیزی سے چل رہے تھے اور ضلع عاملہ کمیٹی کے صدر ان کے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے۔ وہ لوگ لکڑی کی تینوں عمارتوں کو دیکھنے گئے اور انھوں نے گیماکوت کا بڑا یارانگا بھی دیکھا۔

کسی نے کہا، ''وہ لوگ کوئی اتنی بڑی جگہ دیکھ رہے ھیں جس میں سارے فنکار سما جائیں۔''

یہ سن کر رینتی‌گیرگین بھیڑ کو چیرتے ہوئے آرکسٹرا کے لیڈر کے پاس پہنچے اور ان کی آستین کو کھینچتے ہوئے چوکوت زبان میں بولے، ''میرے ساتھ آئیے!''

جہاز کا کپتان بھی باربار فکرمندی کے ساتھ دکھن کی طرف دیکھتا تھا جدھر سے ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔

مقدس چٹانوں کے پاس بنچیں، کرسیاں اور تپائیاں لائی گئیں اور بچھے ہوئے بادبانوں کے آگے ان کی قطاریں لگا دی گئیں۔ بادبانوں پر موسیقاروں نے اپنی ٹوٹ‌والی کرسیاں جمانی شروع کردی تھیں۔

رینتی گیرگین نے آرکسٹرا کے لیڈر کے کھڑے ہونے کے لئے وھیل کی ریڑھ کا گولا بنا کر رکھ دیا۔

آخر کنسرٹ شروع کرنے کے لئے ہر چیز ہو گئی۔

لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آرکسٹرا کے لیڈر وھیل کی ریڑھ پر کھڑے ہوئے اور انہوں نے وہ چھوٹی سی پتلی سی چھڑی اٹھائی جو اپنے دائیں ھاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔

میں سامنے کی ایک صف میں تھا۔ یہ سیاہ سوٹ اور سفید قمیصیں پہنے ہوئے موسیقار چنلوکوین کگرے پر کی پرندوں کی بستی کی سمندری بطخوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ہوا نے آرکسٹرا کے لیڈر کے سفید بالوں کو بکھرا دیا اور زمین پر بچھے بادبانوں کے کنارے پھڑپھڑانے لگے۔

آرکسٹرا بجنا شروع ہوا۔ پہلی آوازیں ہزاروں پرندوں کی پکار کی طرح تھیں جیسے ہوا دور

اور اس عرصے میں رینتی گیرگین کی نگرانی میں مقدس چٹانوں کے پاس زمین پر دو سفید بادبان بچھا دئے گئے۔

* * *

دکھن سے ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ ساحلی جھیل کی ہموار سطح پر سوجیں بننے لگیں۔ سمندر سے آنےوالی جھاگ‌دار لہروں کا زور کم ہو رہا تھا اور وھیل کشتی میں آنےوالے مسافر جب کودکر ساحل پر اترے تو ان کے جوتے بھی نم نہیں ہوئے۔ وہ سب پچھلے لمبے دامنوں‌والے سیاہ کوٹ، پتلون اور آنکھوں کو چکاچوند کرنےوالی سفید قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ اس لئے سبھی ایک جیسے لگتے تھے۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں ساز ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے! کسی سیاہ لکڑی کے بنے ہوئے وائلن اور ہر قسم کے بگل اور پائپ، کچھ لکڑی کے اور کچھ پیتل کے۔ سابق شمن ریپل بڑے بڑے ڈھولوں کو دیکھ کر تو سکتے میں آ گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ان گنت ڈھول اور طنبور دیکھے اور بجائے تھے، وہ ان کے مختلف سائزوں اور آوازوں کو جانتے تھے لیکن اس طرح کی کوئی چیز تو انھوں نے دیکھی ھی نہیں تھی۔

موسیقاروں کو معلوم ہوتا تھا جلدی تھی اور

دکھنی ہوا زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس نے موسیقی سننے‌والوں کی پیٹھ پر دھکے لگائے اور اپنی آواز اونچی کرکے انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے لگی۔ لیکن لوگ صرف روسی موسیقی کو سن رہے تھے، ہوا کی آواز پر کوئی بھی نہ مڑا، ساحلی جھیل کو کسی نے بھی نہ دیکھا جو دبی دبی موجوں سے اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے مقدس چٹانوں کے سامنے کھڑے ہوئے ہم سب لوگوں کو موسیقی نے اٹھا کر سمندروں کے اوپر، راس دیژنیف کے پہاڑوں سے بلند، چوکوت ٹنڈرا کے اوپر پہنچا دیا، افق دور سے دور تر ہوتا گیا اور ساری اننت دنیا ہمارے سامنے پھیل گئی۔ ایسا تھا گویا سمندر کے اندر دھنسی ہوئی ہماری خشک زمین کی پٹی اور اس پر نصب ہمارے یارانگیے ایک بڑا سفید بادبان‌والا جہاز بن گئے ہیں۔

بوڑھے رینتی گیرگین میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ میں نے ان کو دیکھا، وہ تو پہچان ہی میں نہ آتے تھے۔ ان کی نگاہیں مقدس سیاہ چٹانوں کے اس پار، سمندر کے اس پار دور کسی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کی گٹھیلی بھوری انگلیاں، جو قطبی بیدمجنوں کی جڑوں کی سی لگتی تھیں، ان کے سونٹے کو پکڑے ہوئے تھیں۔ ان کے ہونٹ کچھ بدبدا رہے تھے، ان کا سارا دھڑ تن

اڑائے لئے جا رہی تھی۔ نہیں، یہ نہیں۔ پرندے مخالف ہوا سے جدوجہد کر رہے تھے۔ چاروں طرف دور تک سمندر پھیلا ہوا تھا لیکن سامنے بہت فاصلے پر خشکی تھی، دھندلا سا نیلگوں کنارا، جو پرندوں کو بلا رہا تھا، انھیں طوفان سے پناہ دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ آوازیں لمحہ بہ لمحہ تیزتر ہوتی جا رہی تھیں اور اب وہ بڑی مسرت کے ساتھ خشکی اور سمندر پر گونجنے لگیں۔

اور ہوا اپنی منزل کی طرف تیزی سے لپکتی رہی، پرندوں کی فاتحانہ آواز کو سمندروں کے اوپر اڑاتی ہوئی بےاورچھور ٹنڈرا میں پہنچاتی رہی جہاں روپہلی لوسڑیاں اور جھبرے بالوں‌والی اولورین گھومتی پھرتی تھیں، اور کائی اور چھوٹی چھوٹی کھڑنک گھاس سے ڈھکے ہوئے دلدلی علاقے سوئے پڑے تھے۔ رینڈیر اپنی سینگوں کو اٹھاتے اور نامانوس آوازوں کو سنتے۔ کہاں سے آ رہی تھیں یہ آوازیں؟ یہ کنارے تو صدیوں سے ایک ھی جیسی آوازیں سنتے آ رہے تھے لیکن یہ تو کوئی نئی چیز تھی۔ موسیقی تنگ وادیوں میں پھیل کر پہاڑی چوٹیوں پر چڑھ گئی اور پھر وھاں سے لڑھکتی ہوئی رینڈیر پالکوں کی چھاؤنیوں میں آئی اور دریاؤں، جھیلوں کے کنارے نصب ان کے یارانگاؤں میں بھر گئی۔

* * *

موسیقاروں کو اسی شام کو جانا تھا۔ جب سورج سمندر میں ڈوب گیا تو وھیل کشتیوں پر بادبان چڑھائے گئے۔

میں نے جب ان بادبانوں کو دیکھا، جنھیں ڈوبتے سورج نے رنگ دیا تھا، تو میری روح میں وائلن بجنے لگے۔ بوڑھے مغنی رینتی گیرگین میرے برابر ھی کھڑے تھے۔ دکھنی ھوا زوروں پر تھی اور بادبانوں کو پھلائے ھوئے وھی نغمے گنگنا رھی تھی جو اس نے ابھی سنے تھے۔

رینتی گیرگین زیرلب کچھ کہہ رھے تھے اور میں نے ان کے الفاظ سننے کی کوشش کی۔

''اس کو کہتے ھیں زندگی! یہ ھے سچی زندگی!''، ھوا کی بھنبھناھٹ میں مجھے سنائی دیا۔

* * *

اس بات کو ۲۰ سال سے زیادہ ھو چکے ھیں۔ میرے لئے اور میرے ھم‌وطنوں کے لئے وہ دن ھماری زندگی کے سب سے حیرت‌انگیز دنوں میں تھا۔ ایک عرصے سے اوئیلین ایسا ھو گیا ھے کہ پہچانا ھی نہیں جاتا۔ اب وھاں ایک بھی یارانگا نہیں رہ گیا اور اجتماعی فارم کے کلب میں اتنا بڑا اسٹیج ھے کہ اس پر پورا سمفنی آرکسٹرا بیٹھ سکتا ھے۔ اور ھو سکتا ھے کہ روسی نغمہ‌نگار پیوتر ایلیچ چائیکوفسکی کی موسیقی جس کا عنوان ھے پہلی

گیا تھا اور وہ زیادہ لمبے، زیادہ مضبوط اور کم بوڑھے لگ رہے تھے۔

ہوا اسٹینڈوں پر رکھی ہوئی موسیقی کی کتابوں کو پھڑپھڑا رہی تھی لیکن موسیقار اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے اور اپنی جادوئی آواز پیدا کرنے میں مگن تھے۔

کسی کو بھی یہ خیال نہ رہا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ سورج انچون پہاڑی کے اوپر پہنچ گیا تھا اور اس کی ترچھی کرنیں ہمارے یارانگاؤں کی قطاروں کو روشن کر رہی تھیں، پیتل کے بگلوں پر شعلے لہکا رہی تھیں اور وائلنوں کی پالش کی ہوئی لکڑی پر پڑ رہی تھیں۔

موسیقی زمین پر بچھے ہوئے بادبانوں میں بھر گئی اور یہ بادبان موسیقاروں کو آواز کی خوبصورت لہروں کے دوش پر لے چلے۔

ایسی کوئی چیز اوئیلین میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جب موسیقی کی آخری آوازیں ماند پڑیں تو بھیڑ نے تحیروتعریف میں ابھرکر سانس لی۔ کسی نے تالیاں بجائیں اور باقی لوگ اس میں شریک ہوگئے۔ آرکسٹرا کے لیڈر وھیل کی ریڑھ پر سے اترے اور تھکے ہوئے انداز میں انھوں نے اپنا سفید بالوں والا سر جھکاکر تعظیم کی۔ رینتی گیرگین ان کے پاس پہنچے اور اپنا ھاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

''یہ سچی زندگی تھی!،، انھوں نے کہا۔
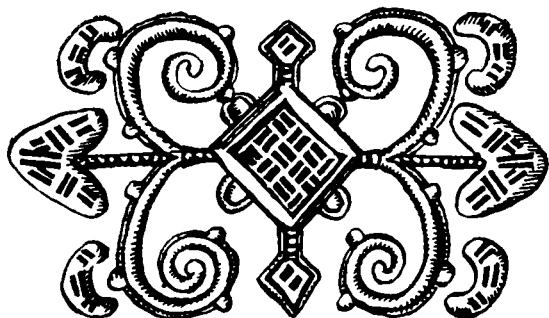
علیم کیشاکوف

سفید پہاڑوں سے دکھائی دینے والا منظر

(سوانحی ناولٹ سے باب)

سمفنی جی مائنر میں (''جاڑوں کے سپنے،،، ترتیب موسیقی نمبر ۱۳) نے میرے هم‌وطنوں کو اکسانے میں اپنا رول ادا کیا هو که وہ مستقبل کو زیادہ جرأت کے ساتھ دیکھیں اور اس تھوڑی هی سی مدت میں اپنی زندگی کو بالکل نئے سرے سے بنا ڈالیں...

* * *

کنسرٹ سے میں اس راستے واپس لوٹا جس سے میں آیا تھا۔ دھند اب بھی عالیشان عمارتوں کو اپنی لپیٹ میں لئے تھی اور پیڑوں پر پالے سے جم جانےوالی برف سرسرا رهی تھی۔ دیر تک میں روسی میوزیم کے سامنے پوشکن کے مجسمے کے پاس کھڑا رها اور میری روح اور میرے خیالات موسیقی سے بھرے هوئے بادبانوں کے سہارے کہیں دور چلے گئے۔

ایک بار اور سارا دم لگایا تو معلوم ہوا کہ بے برگ و گیاہ چٹانوں اور دبیز منجمد برف کے درمیان پہنچ گئے جہاں سے ندیاں نکلتی ہیں اور جہاں پہاڑی بکریاں رہتی ہیں۔ اس جگہ سے راستہ آدمی کو چوٹی کی طرف لے جاتا ہے، دل کی دھڑکن بہت تیز ہوجاتی ہے، قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ چڑھائی اس وقت شروع کی تھی جب مونچھیں سیاہ بھجنگ تھیں اور اب داڑھی سفید بھک ہے....

میرا بچپن ایک دور کی چوٹی کے اس طرف پڑا — ایک ایسے بچھیڑے کی طرح جو غول سے الگ ہو گیا ہو۔ رہ رہ کر اس کی شکایت‌آمیز دبی دبی ہنہناہٹ مجھے جگا دیتی ہے...

میں سفید پہاڑ پر کھڑا ہوں اور جو راستہ میں نے طے کیا ہے اس کی دوردراز نیلگوں دھند میں آنکھیں گڑو کر دیکھتا ہوں۔ میرے سامنے برف کی آسمانی کلاہ پہنے ایک چوٹی ہے جو اور بھی اوپر کو جاتی ہے۔ اگر میں اس پر چڑھ جاؤں تو اور بھی دور تک دیکھ سکوں گا۔

پہلی کتاب ایک نئی دنیا سے آشنا کرتی ہے۔

جب ہمارے گاؤں میں ایک کباردیائی اسکول کھلا تو میرے بھائی رشید نے اپنا لوہارخانہ بند کر دیا اور پہلی کتاب سنبھال لی۔

تھوڑے ہی دنوں بعد ہم نے ایک اس سے بھی

زندگی ایک پہاڑ پر اوپر کی طرف جاتے ہوئے انجان راستے پر کبھی نہ ختم ہونےوالی چڑھائی ہے۔ یہ راستہ پہاڑی دامن میں ایک وسیع ہموار میدان سے شروع ہوتا ہے جب آسمان پر بادلوں کا نام‌ونشان بھی نہیں ہوتا، باغوں اور پھلواریوں میں صبح کی اوس اور چڑیوں کی چہچہاہٹ ہوتی ہے۔ جیو اور خوشیاں مناؤ!

پھر پہلے قدموں کی نوبت آتی ہے، سفر کا احساس، دور دیسوں کے لئے قصوں کہانیوں کے سورماؤں کی روانگی، اور یہ دریافت کہ دنیا صرف اپنا پہاڑی گاؤں ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ پہلی بار سر چکرا دینےوالی بلندیوں کا، پہاڑی جھیلوں اور آسمان سے باتیں کرنےوالی برفپوش چوٹیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ مہم‌جوئی کا جذبہ دل پر طاری ہو جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے زندگی لامتناہی ہے اور آدمی آنےوالے کل سے بےنیاز ہوکر سینگ کے جام سے اسے بھر گھونٹ پیتا ہے۔

اور اوپر پہاڑی چراگاہیں ہوتی ہیں جن کے بیچ بیچ ڈھیلے پتھروں اور روڑیوں‌والی ڈھلانیں ہوتی ہیں۔ تنگ پگڈنڈی باربار کھڈ کی کگر سے چپک چپک جاتی ہے، زندگی کی بہترین چیزیں ابھی تک بادلوں کے اس پار ہوتی ہیں، بلندی دیکھ‌کر اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی ہے۔

کا یقین نہیں آیا۔ بوڑھے بلیاتسو نے مذاق میں کہا، ''تمھارا مطلب ہے کہ میں چاھوں تو اس کے سارے باشندوں سمیت اسے چرا سکتا ھوں؟،،
والد نے جواب دیا، ''جب تم خود اسی پر رہتے ھو تو اسے چرا کیسے سکتے ھو؟،،
بلیاتسو ھمارے گھرانے کے بڑے اچھے دوست تھے، بلکہ گاؤں بھر کے چہیتے تھے۔ کبار دیہ والے کہتے ھیں کہ اگر کوئی شخص اپنی حاضرجوابی سے لوگوں کو خوش رکھ سکتا ھے تو وہ سونے میں تولنے کے لائق ھے۔ بلیاتسو ایسے ھی آدمی تھے، جس محفل میں بھی ھوتے اس کے روح و رواں ھوتے۔
اس سال اسکول جانا میری قسمت میں نہیں تھا۔ گھریلو کام کرنے اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے گھر پر اور کوئی تھا ھی نہیں۔
گرمیوں میں ماں اکثر مجھے شہر کے بازار میں نئی پیاز بیچنے بھیج دیتیں۔ پورا گھرانا شام بھر یہ ھرا سودا جمع کرتا، اس کی گڈیاں بناتا اور انھیں ایک ٹوکری میں جما کر رکھتا۔ صبح سویرے ھی ماں مجھے اٹھا دیتیں اور کہتیں پانچ کوپیک کی دو گڈیاں پیاز بیچنا۔ بازار پہنچتے ھی میں سبزی والوں کے بیچ میں کہیں بیٹھ جاتا اور زور زور سے آوازیں لگاتا ''پارا پیت،، جو ''جوڑی کے لئے ٥ کوپیک،، کے روسی الفاظ کی ٹوٹی پھوٹی

زیادہ حیرت‌انگیز خبر سنی کہ نالچیک میں ایک ایسا اسکول کھلنےوالا ہے جہاں ''سارے علوم،، کی تعلیم دینے کے علاوہ طالب‌علموں کو کھانا بھی ملےگا اور بالکل نئے کپڑے بھی ملیں‌گے۔ ظاہر تھا کہ بھائی وہاں جانا چاہتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے گائے کی دیکھ‌بھال کرنے کے لئے گھر پر رہنا پڑےگا۔ مجھے یہ بات اچھی تو نہیں لگی لیکن اس پر اعتراض کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔

والد نے مجھے اطمینان دلایا، ''جی چھوٹا نہ کرو، ایک دن تم بھی اسکول جاؤگے،،۔ ان کا منصوبہ تھا کہ مجھے اس بورڈنگ اسکول میں بھیجیں‌گے جو باکسن میں سرخ چھاپہ‌ماروں کے بچوں کے لئے کھولا جائےگا۔ علاقائی عاملہ کمیٹی نے ہر ضلع میں اس طرح کے اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس سال گرمیوں میں والد ٹیچروں کے لئے ایک تشدیدی کورس میں شرکت کرنے نالچیک گئے۔ اور جب اسکولی سال شروع ہونے سے پہلے پہلے وہ واپس آئے تو اپنے ساتھ کچھ بصری امدادیں، درسی کتابیں، پنسلیں اور کاپیاں بھی لائے۔ ان سے ملنے کے لئے گاؤں کے سارے لوگ آئے۔ والد نے دیکھا کہ لوگ اسکولی گلوب کو حیرت اور تعریف سے دیکھ رہے ہیں تو انھیں بتایا کہ ہماری زمین ایسی ہی ہے لیکن کسی کو ان کی بات

وہ شام کو آکر مجھے پڑھا دیا کریں۔ اس طرح میں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ اور جب آخرکار میں اسکول میں داخل ہوا تو مجھے سیدھے ہی دوسری جماعت میں لے لیا گیا۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ اسکول جانے کا حق میں نے سچ سچ جیتا تھا۔ ایسا ہوا کہ ایک دن شہر سے کچھ نوعمر پانیر ہم گاؤں کے لڑکے لڑکیوں سے دوستی کرنے کے لئے ہمارے گاؤں آئے۔ ان کی پوری قطار نیلی نیکر، سفید قمیصیں اور گلے میں لال رومال باندھے ڈھول کی تال پر مارچ کرتی اور گاتی آپہنچی۔ میں نے جیسے ہی انہیں گاتے سنا اور میرے ساتھیوں نے ان غیرمعمولی مہمانوں کے بارے میں ہمیں بتایا ویسے ہی میں نے ڈھونڈکر اپنی نئی پتلون نکالی جو ماں نے میرے اسکول جانے کے لئے سنبھال کر رکھی تھی اور اسے بغیر کسی سوچ بچار کے فوراً چڑھا کر باہر بھاگ گیا۔ گاؤں کے مٹی سے اٹے ہوئے پھٹے حال لڑکوں کا ایک پورا جھنڈ نوعمر پانیروں کی قطار کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ پورا دن ہم نے ساتھ گزارا، گیت گاتے، کھیلتے اور چشمے میں نہاتے، باوجود اس کے کہ پانی خاصا ٹھنڈا تھا۔ شام کے قریب نوعمر پانیروں کے لیڈر نے ہم سب کو جمع کیا اور کہا کہ ان کے جانے سے پہلے ہم سب مل کر ''انٹرنیشنل،، گائیں گے۔ گیت ہمیں پسند آیا حالانکہ ہم روسی بالکل نہیں سمجھتے تھے۔

شکل تھی۔ اس سے میرا نام ھی پڑگیا ''پارا پیت''۔ بکری سے جو کچھ ملے اس میں سے مجھے ۵ کوپیک آئس کریم یا پاؤ بھر سفید روٹی کے لئے نکالنے کی اجازت تھی۔

جاڑوں میں میرے ذمے دوسرے کام ھوتے، گائے اور بکری کو چرانے لے جاتا۔ پڑوسنیں بھی مجھ سے کہتیں کہ ان کی گائے پر بھی نظر رکھوں اور وہ دن بھر کا ایک کوپیک مجھے دیں گی۔ میں تیار ھوجاتا لیکن ملتا ملاتا کچھ نہ تھا۔ ایک پڑوسن پر جب میرے بیس کوپیک چڑھ گئے تو انھوں نے کہا، ''میرے پاس جمع ھیں، تمھاری دلھن کے لئے جو روپیہ دینا پڑے گا اس میں ملادوں گی۔''

شادی کو تو ابھی بہت دن پڑے تھے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت اب تھی اس لئے کہ مجھے اس سرکاشیائی بنڈی کے لئے استر خریدنا تھا جو ماں نے میرے لئے بنائی تھی۔ استر کے بغیر گھر کا بنا ھوا کپڑا چھلنی کی طرح لگتا تھا اور ھوا میں اڑتا تھا۔ پہاڑی ڈھلان پر مویشی چرانے والے ھم لڑکوں کو کوئی چیز اگر گرم رکھتی تھی تو یا تو بھاگ دوڑ کے کھیل جو ھم کھیلتے تھے یا پھر الاؤ جو ھم تب جلاتے جب بارش ھوتی یا برف گرتی۔

میرے بھائی اسکول جاتے تھے۔ والد نے ان سے کہا کہ دن میں جو کچھ اسکول میں پڑھیں

غرض یہ کہ کباردیہ کے لوگوں نے اسکولی تعلیم کو سچ سچ قبول کر لیا تھا۔

۱۹۲۳ء کے آخر میں والد سوویتوں کی کل یونین کانگرس میں شرکت کرنے کے لئے ماسکو گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد یہ خبر آئی کہ لینن کی وفات ہو گئی۔ کسی کو یقین نہیں آیا۔ ''جب پشیماخو آئے گا تو ہمیں پوری بات بتائے گا۔'' اور واقعی جب والد لوٹ کر آئے تو پورا گاؤں ان سے ملنے اور کانگرس کا، لینن کا اور جنازے کی آخری رسوم کا حال سننے کے لئے آیا۔ گاؤں والوں نے سوگ کے کپڑے پہنے۔

میں گاؤں کے اسکول میں دو سال رہا۔ میں جہاں رہتا تھا وہاں جس کسی نے بھی ''دو جاڑے'' اسکول میں گزارے ہوں وہ پڑھا لکھا آدمی بلکہ اس لائق بھی سمجھا جاتا تھا کہ ''منشی'' بن جائے۔ اس پیشے کو گاؤں والے علم و فضل کی معراج سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ گاؤں والوں کے خیال میں اگر کوئی شخص جو کچھ خود لکھے اسے پڑھ سکتا ہو تو پھر اور زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

ایک بار میرے علم کی بڑی سخت آزمائش ہوئی۔ اس زمانے میں محبت نامے لکھنے کا بڑا

گھر واپس آ کر میں نے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ اپنی نئی پتلون کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ میں شہر سے آنےوالے نوعمر پانیروں کی طرح لگنا چاہتا تھا۔ ماں تو رونے لگیں لیکن میں نے انھیں اسی وقت بتا دیا کہ میں نے اسکول جانے کا فیصلہ کر لیا ھے اور والد نے میرا ساتھ دیا۔

ہم کباردیائیوں نے ان اسکولوں کی تعمیر کے لئے فنڈ جمع کرنے میں نت نئے طریقے استعمال کئے۔ مثلاً ایک گاؤں میں شادی کے سہمانوں سے درخواست کی گئی کہ وہ دستور کے مطابق دولہا دولہن کو تحفے دینے کی بجائے اسکول کی تعمیر کے لئے نقد رقم دے دیں۔ دولہا دولہن سے کہا گیا کہ ان کے بچے جب اسکول میں داخل ہونے کی عمر کے ہوں گے تو انھیں جماعت میں سب سے آگے مقام‌اعزاز پر بٹھایا جائے گا اور اگر ان کے بچے نہ ہوئے تو وہ خود انتخاب کریں گے کہ ان جگہوں پر وہ کسے بٹھانا چاہتے ھیں۔

اس عرصے میں نالچیک‌والے اسکول نے، جو لینن سے موسوم تھا، اعلان کیا کہ لڑکیوں کو بھی اسکول میں داخل کیا جائے گا۔ اس زمانے میں اپنی بیٹی کو بورڈنگ اسکول میں داخل کرانا آدمی کے سیاسی شعور کا بہترین ثبوت سمجھا جاتا تھا۔

لڑکی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے کہا، ”صابون سجھے کیسے کہہ سکتا ہے، پھر سے پڑھو!“

جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اسے تسلی دینے کی خاطر کہا، ”معمولی صابون نہیں، خوشبودار“۔ بس بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سے وہ لڑکی میرے پاس نہیں آئی۔

۱۹۲۶ء میں میں علاقے کے صدر مقام باکسن گیا اس بورڈنگ اسکول میں داخل ہونے جو سرخ چھاپہ ماروں کے بچوں کے لئے کھولا گیا تھا۔ میرے علاوہ وہاں دو اور بچے تھے جو ضلع نالچیک ہی کے گاؤں کے تھے۔

دور دیسوں کے سفر

ایک رات میں نے عجیب خواب دیکھا۔ اگلی صبح کو میں نے اپنی ماں سے بتایا۔ وہ خوابوں کی تعبیر بتانے کا سلکہ رکھتی ہیں بلکہ وہ تو خوابوں سے لوگوں کی قسمت کا حال بھی بتا دیتی ہیں۔ خواب میں میں نے دیکھا کہ میں ریل کی پٹری پر کھڑا ہوں اور اپنے ہاتھوں سے ایک دھنک کا سرا پکڑے ہوئے ہوں۔ میں ابھرتے ہوئے سورج کی طرف گھوڑسوار یا ریل گاڑی سے بھی زیادہ

زور تھا۔ لڑکیاں ''تحریری،، اظہار عشق کا مطالبہ کرتی تھیں چاہے لڑکا لڑکی دونوں پڑوسی ھی ھوں اور روز ملتے ھوں۔ پھر بھی لڑکا اگر لڑکی سے محبت کرتا تو اسے محبت‌نامے لکھنے ھی پڑتے جنھیں لڑکی اپنی سہیلیوں کو دکھاتی اور تعویذ کی طرح اپنے پاس رکھتی۔

ایک دن ایک پڑوسن لڑکی نے مجھ سے وہ محبت‌نامہ پڑھنے کو کہا جو اسے پہلی بار ملا تھا۔ وہ خود نہیں پڑھ سکتی تھی۔ مجھے ساتھ لےکر باغ کے آخری سرے پر گئی اور اس نے کہیں سے کاغذ کا وہ جان سے عزیز پرزہ نکال‌کر دیا اور مجھ سے پڑھنے کو کہا۔ میں نے خط کو کھولا۔ وہ روسی میں لکھا ھوا تھا۔ لڑکی بےحد اشتیاق کے ساتھ منتظر. تھی کہ میں محبت کے جادو بھرے الفاظ کی ترجمانی کروں۔ مجھے اس کی تیزی سے چلتی ھوئی سانس سنائی دے رھی تھی۔ صاف ظاھر تھا کہ وہ سمجھتی تھی کہ میں تو ''اس سے بھی زیادہ تیزی سے پڑھوں‌گا جتنی تیزی سے مرغیاں اناج چنتی ھیں،، لیکن مجھ سے تو پہلا لفظ ''میلیا،، (میری پیاری) بھی مشکل سے پڑھا گیا اور میں رک گیا اس لئے کہ مجھے اس کے معنی نہیں معلوم تھے۔ مجھے ایک اور لفظ معلوم تھا — ''میلا،، (صابون) اور بوکھلاھٹ کے مارے رک رک کر میں نے کہا، ''اس نے تمھیں صابون کہا ھے۔،،

تھے۔ تیرک کو پہاڑ پر چڑھانا تھا اور یہ لوگ کہتے کہ ''ندی کوئی گھوڑا تھوڑا ہی ہے، پہاڑ پر کبھی چڑھ ہی نہیں سکتی،، ۔ جو لوگ رجائیت پسند تھے وہ ان کی بات نہ مانتے اور کہتے کہ اگر سوویت اقتدار چاہےگا تو ندی پہاڑ پر چڑھ جائےگی۔ پانچ سال بعد تیرک واقعی پہاڑ پر چڑھ گئی جہاں سے وہ ایک سرنگ میں چلی گئی اور سنچائي کی نہروں کے وسیع جال کے ذریعے اپنا پانی کھیتوں میں انڈیلنے لگی۔ تیرک کی گھاٹی کی زمین کی پیاس پہلی بار بجھی اور وہ زرخیز بن گئی۔

سنچائی کے نظام کا افتتاح بڑے عالیشان طریقے سے ۱۹۲۹ء میں یوم‌مئی کے موقع پر ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کباردینو بلکاریہ کا بچہ بچہ اس عظیم واقعے کو دیکھنے کے لئے تیرک کے کناروں پر امنڈ پڑا ہے۔ شمالی اوسیتیا، چیچن اینگوشتیا اور داغستان سے پڑوسی بھی آئے تھے۔ آندریئی آندریئف کو، جو بعد کو کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکرٹری اور اس کے پولٹ بیورو کے ممبر ہوئے اور اس وقت خطہ‌واری پارٹی کمیٹی کے سکرٹری تھے، رسم افتتاح ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اب تیرک کا پانی ان پیٹوں میں بہنے لگا جو انسان نے کھودے تھے۔ صرف ندی کا دھارا نہیں بدلا تھا، ایک پوری قوم کا مقدر بدل گیا تھا۔ اجتماعی فارم، ٹریکٹر، بجلی کاری،

تیزی سے دوڑتا جا رہا ہوں، منہ پر ہوا کے تھپیڑے لگ رہے ہیں اور میرا دم پھول رہا ہے۔

ماں نے سمجھایا، ''بیٹے، تم دور دیسوں کے سفر پر جاؤگے۔ ریل کی پٹریوں کے معنی ہوتے ہیں دوردراز ملکوں کا سفر،،۔

میرا خواب سچ‌مچ صحیح ثابت ہوا۔

اسکول میں ہمارا آخری سال بڑی سخت محنت کا سال تھا۔ سب سے اچھے طالب‌علموں کی ایک ٹولی بنا دی گئی تھی اور انھیں ایک خاص درسی نظام کے تحت سبق دیے جاتے تھے۔ ہم نے ۱۹۳۱ء میں اسکولی تعلیم پوری کی اور مجھے ایک سند ملی جس میں لکھا تھا ''حاسل سند ھذا نے خصوصی آٹھویں جماعت کا ھنگامی نصاب کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے،،۔

ھمیں امید تھی کہ ھم آگے پڑھنے کے لئے ماسکو جائیں‌گے لیکن ھم فارغ‌التحصیل ھونےوالوں میں سے پانچ کو، جن میں میں بھی تھا، زمین سدھار کے ایک اسکول میں داخلے کے لئے چنا گیا جو نئے نئے قائم ھونےوالے تیرک سنچائی نظام کے سلسلے میں مالیا کباردا (کباردیہ خرد) میں کھلنےوالا تھا۔ یہ ذکر بےجا نہ ھوگا کہ یہ نظام ۱۹۲۴ء میں شروع کیا گیا تھا اور سوویت اقتدار کے تحت بننےوالا پہلا سنچائی نظام تھا۔ بہت سے لوگوں کو اس کے بارے میں شکوک و شبہات

3*

واپس ھی جانے کا فیصلہ کیا اور یہ ھمیں احساس ھی نہیں ھوا ۰ کہ اب ھم وھاں باھروالے ھوں گے اس لئے کہ اسکولی رجسٹر میں ھمارا نام تو ھے نہیں۔ یہ تو واپس آنے کے بعد ھی ھمیں احساس ھوا کہ ھم نے کیا غلطی کی۔

ھیڈماسٹر نے تعلیمات کے مقامی دفتر سے پوچھا کہ کیا کیا جائے اور ھمارے لئے ایک نئے اسکول کا انتخاب کر دیا گیا — اورجونکیدزے کے شمالی قفقازی ٹیچرس ٹریننگ کالج کا قفقازی قوموں کا شعبہ، جہاں پہاڑی خوداختیار علاقوں کی مختلف قومیتوں میں کام کرنے کے لئے ٹیچروں کو تربیت دی جا رھی تھی۔ ھماری رضامندی کسی نے بھی نہیں مانگی اور انکار کرنے کی اب ھم میں ھمت نہیں تھی۔ اور پھر لفظ ''طالب‌علم،،* سے بھی ھم بہت مرعوب تھے۔ تو ھم اورجونکیدزے چلے گئے۔

قفقازی قوموں کا شعبہ بالکل کشتیٔ‌نوح معلوم ھوتا تھا اس لئے کہ طالب علموں میں چیچن،

---

* روسی زبان میں اسکول میں پڑھنےوالوں کو ''شاگرد،، کہا جاتا ھے اور اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد کسی یونیورسٹی یا انسٹی‌ٹیوٹ میں اعلی تعلیم حاصل کرنےوالے کو ''طالب‌علم،،۔ ایڈیٹر

اور اب سنچائی¹— یہ² سب ایک ھی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ مالیا کباردیائیوں نے ایک نئی زندگی شروع کر دی تھی۔

ہم پانچ سر پھرے لڑکوں کو اتنی عقل کہاں تھی کہ اس حقیقت کی قدر کرتے اور مستقبل میں اس سے بھی آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرتے۔ ہم کو اسکول پسند نہیں آیا اور ہم نے ایک رائے ہوکر فیصلہ کیا کہ امتحان نہیں دیں گے اور اپنے پرانے اسکول واپس چلے جائیں گے۔ یہ انتہائی غیرذمہداری کی بات تھی۔ اسکول کی تعلیم تو ہم ختم کر چکے تھے اور اب ھمیں اس دیکھبھال کا کوئی حق نہیں تھا جو ھمیں پانچ سال تک وھاں ملی تھی۔ لیکن یہ ھماری کھوپڑی میں آئی ھی نہیں۔ ھمیں تو اپنے بورڈنگ اسکول کو اپنا گھر سمجھنے کی عادت تھی۔

زسین سدھار کے اسکول کے پرنسپل قراچائی بلائیف بڑے نیک آدمی تھے اور انھوں نے ھمیں روکنے کی بڑی کوشش کی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ھمیں ایسے ماھر بنا دیں گے جو ”خود تیرک کو قابو میں رکھیں گے“۔ انھوں نے ھمیں نہریں دکھائیں، بند اور دوسری تنصیبات دکھائیں لیکن ھم اپنی بات پر اڑے رہے اور ھم نے ان کی نصیحت کی قدر نہ کی حالانکہ جو کچھ ھم نے دیکھا اس سے بڑے متاثر ہوئے۔ ھم نے

3—1404

مجھے اس بات کا بڑا رنج تھا کہ میری واحد شائع‌شدہ نظم، جو کباردیائی زبان کی ایک درسی کتاب میں شامل کرلی گئی تھی، میرے نام سے نہیں شائع ھوئی تھی بلکہ اس کے ساتھ میرے والد کا نام چھپا تھا۔ یہ بتانا ضروری ھے کہ میرے والد نے، جیسا کہ انھوں نے کہا، ''اپنا درد سر دوسرے کے سر منڈھنے''، پر مجھے بہت ڈانٹا تھا۔ بہرحال کچھ ھی دنوں بعد کباردیائی زبان میں جب نظموں کا پہلا مجموعہ المناخ ''ورود'' شائع ھوا تو میں نے تیر مار لیا۔ اس سے مجھے ''پیش‌قدم شاعر'' کا اعزازی درجہ مل گیا اور ایک کارڈ جس کی رو سے مجھے بڑے وقفے میں کھانے کے کاؤنٹر سے جام‌والے کیک کا ایک ٹکڑا ملنے کا حق تھا۔ اس کا نشہ‌آور مزہ میں اب بھی اپنے ھونٹوں پر محسوس کر سکتا ھوں۔

کلب کے ممبروں نے ایک تحریری المناخ تیار کرنے کا فیصلہ کیا جس میں ھر شخص اپنی بہترین نظم شامل کر سکتا تھا۔ ھفتے بھر تک المناخ دست بدست گردش کرتا رھا یہاں تک کہ اس میں گیارہ مختلف قفقازی زبانوں میں نظمیں جمع ھو گئیں۔ تب ھم نے اپنی پہلی شاعرانہ شام منظم کی۔ اس طرح کا مقابلہ پہلے کبھی نہیں ھوا تھا۔ مختلف شمالی قفقازی زبانوں میں نظمیں پڑھی گئیں۔ وہ طالب‌علم بھی آئے جو شاعری

اینگوش، اوسیتیائی، کباردیائی، لیزگین، قراچائی، ابخازی، آوار، قومیق اور بہت سی دوسری قفقازی قومیتوں کے لوگ تھے۔ ہمیں صبح سے رات تک بڑی محنت سے پڑھنا پڑتا اس لئے کہ ہماری بنیادی تعلیم بہت ہی ناکافی ثابت ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے تعلیم ادھوڑی ہی چھوڑ دی اور بالاخر ہماری خاص جماعت میں صرف پندرہ لوگ رہ گئے۔

ہمارے شعبے کا تقریباً ہر طالب علم اپنی مادری زبان میں شاعری کرتا تھا اور کچھ تو اپنی کوششوں کو شائع بھی کروا لیتے تھے۔ ہمارے ادبی کلب کی نشستیں باقاعدگی سے ہوتی تھیں۔ اس کی نگرانی کالج کے پسندیدہ استاد وسیولود واسیلئیف کرتے تھے جو ادب کے پروفیسر تھے اور جن کے لیکچروں میں دوسرے شعبوں کے طالب‌علم بھی شریک ہوتے تھے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسے انسان کے صدر شعبہ اور پھر ہمارے ادبی کلب کے نگراں ہونے پر ہم کس قدر فخر محسوس کرتے تھے۔ کلب کے ممبران اپنی نظمیں پڑھتے وقت پروفیسر واسیلئیف کے انداز، آواز اور لہجے کی نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن چونکہ ہر شخص لکھتا اپنی مادری زبان میں تھا اس لئے ہم ایک دوسرے کی نظمیں سمجھ نہیں سکتے تھے اور رائے کی بنیاد اس بات پر ہوتی کہ نظم شائع ہو چکی ہے یا نہیں۔

جانسی کیمونکو

سرخ پرچم

نہیں کرتے تھے۔ جو بھی نظم پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا اس کا خیرمقدم زوردار تالیوں سے کیا گیا حالانکہ اس کی زبان سمجھنے والے چند ھی لوگ تھے۔ اس واقعے سے ھمارے کالج میں شاعروں کا کنبہ بہت بڑھ گیا۔

کی آؤند زیا نے میری طرف سے بھی جواب دیا، ''سب کو جانا ہے''۔

جلدھی بڑے خیمے کے پاس بڑی سی بھیڑ لگ گئی۔ شکاری پتھروں پر بیٹھ گئے اور عورتیں بھوج کی چٹائیاں لے کر آئیں اور دودو تین تین کی ٹولیوں میں ایک طرف کو ھوکر بیٹھ گئیں۔ لڑکیوں کے رنگین لباسوں پر تانبے کے زیورات باربار بج اٹھتے تھے۔

چھوٹے بچے کچھ پتھروں سے کھیل رہے تھے۔ ان پر شمن ایوانسا چلا پڑے، ''چپ رھوگے تم لوگ کہ نہیں؟ اتنا خوش آخر کس بات پر ھو رہے ھو؟''

جب مہمان خیمے سے باھر نکلے تو ھر شخص نے کانا پھوسی کرنا اور کرید کے ساتھ ان کو دیکھنا شروع کیا۔

سیگدانکا نے مجھے آھستہ سے کہنی مارتے ھوئے پوچھا، ''ان میں ڈاکٹر کون ہے؟''

''وہ جو عینک لگائے ھیں۔''

مجھے معلوم تھا کہ عینک لگائے ھوئے ذرا معمر سے اور گنجے شخص ڈاکٹر ساویلئیف ھیں۔ وہ واسیلی اوننکا سے بہت زیادہ لمبے نہیں تھے بس یہ کہ زیادہ موٹے تھے اور ان کے کندھے زیادہ چوڑے تھے۔ وہ ھلکے رنگ کی قمیص پہنے تھے جو پتلون میں دبی ھوئی تھی اور آستینیں کہنی تک چڑھی ھوئی تھیں۔ وہ یہاں یلیزاروف کے ساتھ آئے تھے۔

وہ دن میرے ذہن پر ہمیشہ کےلئے نقش ہے۔ جب ہم پیریاسلافکا سے پہنچے اور ہم نے کھانے پینے کی چیزوں اور دوسرے سامان سے بھری ہوئی بتیس پیٹیاں اتار لیں تو جیسے اردگرد کی ہر چیز کا نقشہ ہی اور ہو گیا اور چڑیوں نے بھی خوشی سے گانا شروع کر دیا۔

جنگل کے لوگوں کے پڑاؤ کے بیچ میں خور ندی کے کنارے ایک بڑا سا گول خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ گرمیوں کے روشن سورج کی تیز کرنیں ندی پر اور ہمارے عارضی گھروں پر تیر رہی تھیں۔ خباروفسک سے آنےوالے مہمان خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سیسیلی کیمونکو نے خیمے سے نکلتے ہوئے چلا کر کہا، ''سارے لوگ جلدی سے جمع ہو جائیں اور یہاں آ جائیں!،،

کیآؤندزیا اور میں نے خیمے خیمے جاکر شکاریوں کو جلسے میں آنے کےلئے مدعو کیا۔

دادی سیگدانکا آگ کے پاس بیٹھی ہوئی ڈوئی سے چاول چلا رہی تھیں۔ ان کے اوپری ہونٹ کے اوپر رو پہلا حلقہ ان کی ہر حرکت پر ہل جاتا تھا۔

''کیا عورتیں بھی جائیں گی؟،، وہ مسکرائیں، چہرے کی جھریاں اور گہری ہوگئیں اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ہمیں کیا پڑی ہے جو مردوں کے معاملوں کو سننے جائیں؟،،

گولدو نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر کہا، ''میں سمجھتا ھوں کہ چاؤنا کیا لوندزیوگا ھو سکتے ھیں۔ ھاں انھیں صدر ھو جانے دیجئیے''۔ کسی نے اس رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ گولدو کی بات کافی وزن رکھتی تھی۔ چاؤنا وھیں ھلے ڈلے بغیر بیٹھے رھے۔

اوننکا نے پکار کر کہا، ''چاؤنا، یہاں آئیے! آپ کو چن لیا گیا ھے!''

چاؤنا نے زور دے کر کہا، ''میں شاید ٹھیک نہیں رھوں گا''، اور اپنی جگہ سے اس طرح اٹھے جیسے سمجھ میں نہ آ رھا ھو کہ کیا کریں کیا نہ کریں، ''مجھے تو پڑھنا لکھنا بھی نہیں آتا۔ میرے جیسے آدمی کو چننے کی کیا ضرورت ھے؟''

خالی بکسے پر چاؤنا بیٹھ گئے۔ وہ ھر اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رھے تھے جو اوننکا ان سے کہتے اور اوننکا ھر اس بات کا ترجمہ کر رھے تھے جو یلیزاروف کہتے تھے۔ چاؤنا نے سر ھلا کر اشارہ کیا کہ وہ سمجھ گئے اور پھر خود تقریر کرنے کھڑے ھوئے:

''خوراودیگیے کا عام جلسہ آج کچھ اھم معاملات طے کرے گا۔ سوویت سرکار ھم سے کہہ رھی ھے کہ ھم اپنی سوویت منظم کریں تو ھم مقامی حکومت کے لئے ایک صدر چنیں گے۔ پھر ھم رسد بانٹنے کے لئے لوگوں کا تقرر کریں گے۔ اور ایک چیز اور: ھمیں امن امان رکھنے کے لئے بھی لوگ چننے ھوں گے۔

سارے لوگ جو جمع ہو گئے تھے ان پر نظر دوڑاتے ہوئے یلیزاروف نے پوچھا، ''سب لوگ آ گئے؟''

یلیزاروف سفید کڑھی ہوئی قمیص پہنے تھے جو کمر پر پھندنےدار ریشمی پیٹی سے بندھی ہوئی تھی۔ دھوپ سے ان کا چہرہ گلابی ہوگیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا سے ان کے سیاہ گھنگریالے بال اڑ رہے تھے۔ وہ ہمارے سامنے دراز قد اور سیدھے، بھوج کے نوعمر پیڑ کی طرح کھڑے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھو اب آگے کیا ہوتا ہے۔

خیمے کے اندر سے کئی بکسے لائے گئے اور انھیں ایک کے اوپر ایک رکھ کر ایک میز بنائی گئی۔ ان کے پاس کچھ چھوٹے بکسوں پر ڈاکٹر ساویلئیف اور واسیلی اوننکا بیٹھ گئے۔ یلیزاروف جو کچھ کہتے اس کا ترجمہ ہمارے واسیلی اوننکا کرتے۔

''اس طرح کے جلسوں میں ایک صدر چنا جاتا ہے۔ ہم باری باری بات کریں گے۔ آپ لوگ کس کو صدر چننا چاہتے ہیں؟ اس کا نام تجویز کیجئے۔''

سارے لوگ فوراً کسمسانے اور ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔ لیکن جب گولدو کیمونکو نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔

جھلملاتے دیکھے۔ میں نے شکاریوں کے چہرے دیکھنے شروع کئے۔

دینچو اپنا منہ کھولے ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس کی سیاہ، دور دور پر واقع، تقریباً گول آنکھوں میں پر مسرت حیرت چمک رہی تھی۔ وہ ھاتھ میں لئے ہوئے پائپ کے بارے میں بالکل بھول گیا تھا اور کمر کو کمان کی طرح جھکائے نئی دنیا سے ملنے کےلئے آگے کو جھکا ہوا تھا جیسے ڈر رہا ہو کہ اگر ذرا بھی ھلا تو خوشی کسی انجان چڑیا کی طرح ڈر کر اڑ جائے گی۔ دینچو ڈیلی گیٹ بن کر خباروفسک جایا کرتا تھا۔ وہ یلیزاروف کو جانتا تھا اور سوویت اقتدار کے بارے میں پہلے سن چکا تھا لیکن اب بھی وہ ایک ایک لفظ سننا چاھتا تھا۔

اس کے برابر میں دزولودو بیٹھا تھا۔ اس کا سر فخر سے تنا ہوا تھا۔ اس کی سیاہ چوٹیاں لال سوبافوں سے بندھی ہوئی کندھوں تک لٹک رہی تھیں۔ اس کا لمبا وجیہ چہرہ تند اور مردانہ تھا اور اس سے خود داری ٹپکتی تھی۔ جب سے اس نے تاندو کیمپ میں جاپانیوں پر رائفل تانی تھی تب سے میں اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے شمن کو دیکھا پھر دوسری طرف مڑ گیا جیسے کہہ رہا ہو، ”ھاں ظاھر ھے، تم کو تو نئے قانون شاید زیادہ اچھے نہیں لگ رھے ھوں گے؟“

ایوانسا بالکل اس کے سامنے بیٹھے تھے اور مجھے

همیں عوامی ملیشیا کےلئے تین آدمی چاهئے هوں‌گے۔،،

یلیزاروف جب سمجھا رہے تھے کہ سوویت اقتدار کیا هوگا، سوویتیں قائم کرنے کی ضرورت کیا ھے اور سوویت ملک کے شہریوں کے حقوق کیا هوتے هیں تو سارے لوگ انہیں تکے جا رہے تھے۔ چونکہ لوگ روسی نہیں سمجھتے تھے اس‌لئے بےصبری سے منتظر رہتے کہ واسیلی اوننکا ان لفظوں کی اهمیت کا انکشاف کریں۔ پھر اوننکا نے هر اس چیز کو سمجھانا شروع کیا جو عوام کا نمائندہ کہہ رہا تھا۔

یہی وجہ ھے کہ همارے ملک پر سرخ پرچم لہرا رہے هیں۔ ان پر بہت سے لوگوں کا خون بہا ھے جو هماری خوشی کےلئے لڑے تھے تاکہ محنت کرنےوالے سارے لوگ برابر هوں۔ تو اب تائیگا میں بھوکے سارے مارے پھرنے کے دن ختم هو گئے۔ سوویت سرکار جنگل کے لوگوں کو نئی زندگی بنانے میں مدد دےگی۔ اب دھوئیں سے بھرے هوئے خیمے نہیں هوں‌گے اس لئے کہ روسی اب اودیگے لوگوں کو گھر بنانا سکھائیں‌گے۔ کیا سارے بچے سچ‌مچ اسکول جائیں‌گے؟ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا دل بڑے زوروں میں دھڑکنے لگا ھے۔ میں اتنا پہلے کیوں پیدا هو گیا تھا؟

”کی‌آؤندزیا، تم سمجھ گئے کہ لال پرچموں کے معنی کیا هوتے هیں؟،، میں نے چپکے سے اپنے دوست سے کہا اور اس کی پلکوں پر دو ننھے ننھے آنسو

ھمارے پاس بیٹھے ایک نئی زندگی کی آواز سن رہے تھے۔ ان کے کشادہ اور گالوں کی ابھری ھوئی ھڈیوں‌والے چہرے پر مسکراھٹ تھی۔ یلیزاروف کی آواز ایسی لگ رھی تھی جیسے کسی پہاڑی چشمے کا دھارا اوپر سے گہرے پانی میں گر رھا ھو۔ واسیلی اوننکا نے ان کی تقریر کا ترجمہ کیا جس میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جنھیں جلدی سے سمجھنا مشکل تھا۔ میں نے اپنے دوست کیؤندزیا کی ماں پائیدہ کے چہرے پر نظر ڈالی اور ان کے ماضی کے بارے میں سوچنے لگا۔ تو اب عورتیں بیچی اور خریدی نہیں جائیں‌گی؟ سوویت حکومت انھیں ایک انسان کا حق دے رھی تھی۔ میں نے یاتو کو خوش ھوتے دیکھا۔ وہ میری ماں کے پاس دوزانو بیٹھی ھوئی تھیں۔ شاید اب وہ بھول چکی تھیں کہ کیسے میرے دادا کی بیٹی کے ادلے بدلے میں ان کا ھاتھ میرے دادا کے ھاتھ میں دے دیا گیا تھا؟

یلیزاروف نے اپنی تقریر ختم کی اور شکاریوں سے کہا کہ وہ بتائیں کہ وہ کیسے زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتے ھیں اور کس کو وہ اپنی عوامی سوویت کا صدر چننا چاھتے ھیں۔ کسی نے بولنے کی ھمت نہیں کی، سب چپ رہے۔ تب یلیزاروف نے پوچھا:

''آپ لوگ کچھ کہتے کیوں نہیں؟ کیا سچ‌سچ آپ کو نئے قانون پسند نہیں ھیں؟ بولئے! یا شاید ھر خاندان کے لئے یہ اچھا ھوگا کہ خود اپنی سوویت چن

ان کے صرف سر کا دھبےدار پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا جس پر داد سے داغ پڑ گئے تھے۔

ترجمان کہہ رہا تھا ''سوویت حکومت چاہتی ھے کہ ہر شخص اچھا اور تندرست رہے۔ ڈاکٹر جیسے ھی سب کو ٹیکے لگا دیں گے ویسے ھی بڑے روگ کا نام تک نہ رہ جائے گا۔،،

دادی سیگدانکا نے پھر مجھے کہنی ماری:

''روسی ڈاکٹر شاید ھمیں چیر پھاڑ کر رکھ دے گا، ھے نہ؟ افوہ، یہ تو غضب ہو جائے گا۔،،

بھیڑ نے کھسر پھسر شروع کردی۔ میں نے دیکھا کہ سیسیلی کیمونکو میرے باپ کو سمجھا بجھا رہے ھیں جو ڈاکٹر کو غصے سے دیکھ رہے تھے۔ اور ڈاکٹر ایک ایسے باپ کی طرح مسکرا رہے تھے جس نے ابھی ابھی اپنے بچوں سے کوئی خطرناک کھلونا چھین لیا ہو۔

''ساتھیو!،، یلیزاروف نے زور سے کہا اور سارے لوگ پھر خاموش ھوگئے۔

ایک معمر، چوڑے کندھوں‌والے آدمی، چنگوما نے، جو سر پر ایک سرمئی کپڑا لپیٹے ھوئے تھے، اپنے پڑوسیوں کو تمباکو دینا روک دیا۔ ان کے بازو مضبوط اور مچھلیوں‌دار تھے۔ وہ بھالا چلانے میں ماھر تھے اور بھالوؤں سے اکیلے لڑتے تھے۔

مجھے یاد تھا کہ انھیں ڈاکو کیسے کھالیں جمع کرنے کےلئے کاتین بھیجا کرتے تھے اور ڈراتے تھے کہ اگر وہ نہ گئے تو جان سے مار دیں گے۔ اب وہ

دینچو نے کہا کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ نئے قانون کے تحت ہم زیادہ اچھی زندگی بسر کریں گے۔ بس یہ کہ ایسا یکبارگی نہیں ہوگا۔''

میرے باپ بولے، ''اگر حکومت مدد کرے گی تو بہت جلدی ہو جائے گا''۔

سیسیلی کیلونکو، جو ان کے برابر ہی بیٹھے تھے، اتنے زور سے بولے کہ سب کو سنائی دے جائے:

''سوویت حکومت نے تو ہماری مدد کی ہی ہے۔ اب ہم سب کو دوستی کے ساتھ رہنا چاہئے اور اچھی طرح شکار کرنا چاہئے۔ ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بالشویکوں کی مدد کریں۔''

چاؤنا سارے وقت خاموش تھے لیکن اب انھوں نے بھی ترجمان کے واسطے سے یلیزاروف سے کہنا شروع کیا:

''ہم سوویت کا صدر اس آدمی کو چنیں گے جو سوویت قانون کو سمجھ سکتا ہو اور ہمیں ان کے بارے میں بتا سکتا ہو۔ پہلے تو پنچ ہوتے تھے لیکن وہ مالداروں سے محبت کرتے تھے اور غریب آدمی کے لئے تو ان سے بات کرنا بھی مشکل تھا۔ اب بالکل دوسری صورت ہے، ہے نہ؟''

جلسہ سارے دن چلتا رہا۔ لوگوں کی آواز میں پاس بہتی ہوئی ندی کی لہروں کی کلکل بھی دب گئی۔ خور ندی جا کر اوسوری اور پھر آمور تک پہنچنے کی جلدی میں تھی تا کہ اپنی بڑی بہن سے جلد از جلد مل جائے۔ اسی طرح جنگل کے لوگ بھی اپنی نئی زندگی جلد سے جلد شروع کرنا چاہتے

لیے، ایک خاندانی سوویت؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کیمونکو اور کیالوندزیوگا تو مل چکے ھیں۔ متحد ہو جانا اچھا ھے اس لئے کہ ایک سے دو ھاتھ ہمیشہ بہتر ھوتے ھیں۔''

انھوں نے اپنی ایک ھتھیلی دوسری پر رکھ کر دونوں کو ملا کر دبایا۔

''رھنا ایسے چاھئے — دوستی میں!''

بھیڑ نے تائید میں بھنبھنا کر کچھ کہا۔ گولدو کی آواز سب سے بلند سنائی دی:

''کیمونکو اور کیالوندزیوگا ھمارے ھی آدمی ھیں۔ ھمیں ایک سرکار چننی چاھئے!''

دزولودو نے ترجمان سے کہا کہ وہ یلیزاروف کو سمجھا دے کہ شکاریوں کی سمجھ میں نہیں آ رھا ھے کہ وہ اس طرح کے جلسے میں کیسے بولیں۔

پھر وہ خود ھی اٹھتے ھوئے اچانک بول پڑے،

''ھم پرانے قانونوں کے تحت اب نہیں رھنا چاھتے۔''

ان کی چوٹیاں ان کے کندھوں پر ھل رھی تھیں۔

''سوویت حکومت نے ھمیں اچھے قانون دئے ھیں۔ ھم وھی کریں گے جو ھمارے بڑے بھائی روسی ھمیں سکھائیں گے۔'' انھوں نے اپنی تقریر ختم کی اور بیٹھ گئے، فخر سے تنے ھوئے جیسے بادلوں میں اڑتا ھوا عقاب۔
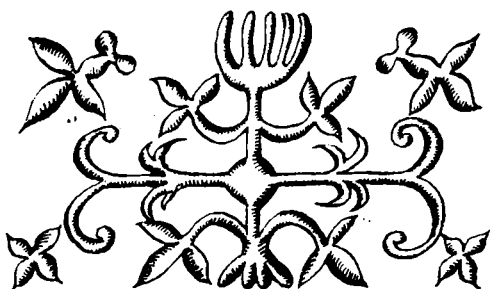
تمبوت قراشیف

آدیگئی کے لئے تین سب سے ضروری چیزوں کی کہانی

تھے۔ بڑے خیمے کے اوپر لال پرچم لہرا رہا تھا۔ سیسیلی کیمونکو نے اسے ایک لمبے چکنے بانس سے باندھ دیا تھا۔ انھیں سوویت کا صدر چن لیا گیا تھا۔

ستھرے، عزت‌دار کپڑے پہنے تھا جیسا کہ مرد کو ہونا چاھئے۔''

ماشوک کی عمر تو ۲۰ سے زیادہ نہ رہی ہوگی لیکن تاؤ دی ہوئی مونچھوں اور گھنگھریالی سیاہ داڑھی کی وجہ سے اس میں ایسا وقار تھا جو اس کی کم عمری سے میل نہیں کھاتا تھا۔ کوئی دیکھنےوالا نہ تھا پھر بھی وہ زین پر ایسے پٹری جما کر بیٹھا تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا وہ اس اصول کی پابندی کرتا ہے کہ ''مرد پیدا ہوئے ہو تو ہمیشہ مرد رہو۔ ''

خزاں کی سخت گرمی کا دن تھا لیکن نہ ماشوک نے یہ ٹھیک سمجھا کہ اپنی ٹوپی پیچھے یا ایک طرف ھی کو کھسکا دے نہ اس نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑی — وہ اسے اچھی ھموار رفتار سے لئے جا رھا تھا جیسے کہ تجربہ‌کار سوار کو کرنا چاھئے۔ خدا وہ دن نہ دکھائے جب وہ کسی کو اس بات کا موقع دے کہ اس پر ''بودا سوار'' کا نام چپکا دے اور وہ زندگی بھر کےلئے نکو بن جائے!

غرض یہ کہ ماشوک ان نوجوانوں میں تھا جنھیں آدیگئی لوگ ''بھلے آدمی'' کہتے ھیں۔

ماشوک اپنے گاؤں کا آدھا راستہ طے کر چکا تھا کہ اس کو راستے میں ایک بڑے میاں پیدل جاتے ہوئے مل گئے۔ پھر اس نوجوان نے صحیح بات کی۔ وہ اپنا گھوڑا بڑے میاں کے بائیں ھاتھ کو لایا اس لئے کہ دائیں ھاتھ کو احترام کی جگہ ھوتی ھے اور

اس بات پر سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ کہانی سچی ہے یا نہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کو یقین ہے کہ اس طرح کی بات ہوسکتی ہے اور یہ کہ لوگ اس طرح کی کہانیوں میں زندگی اور انسان کی قدر و قیمت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

ایک دن ماشوک ناسی ایک نوجوان اپنے گھوڑے پر سوار اس کچی سنسان سڑک پر چلا آ رہا تھا جو اس کے گاؤں آتی تھی ۔ ماشوک نام کسانوں میں عام ہوتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں ''باجرے کا بچہ،، ، اور اس کو دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ کسان گھرانے کا ہے ۔ وہ نیچی دیوار کی استراخانی ٹوپی اور گھر کے بنے ہوئے رنگ اڑے کپڑے کا سیرکاشیائی کوٹ پہنے ہوئے تھا ۔ اس کی سجاوٹ دار پیٹی میں ٹھنسی ہوئی گولیاں اور اس کے خنجر کا دستہ سیاہ سینگ سے تراشے گئے تھے۔ اپنے گھٹنے تک کے چرسی بوٹوں کے اوپر وہ سادی جوتیاں پہنے تھا جن کے کچی کھال کے تلوں کے کنارے کنارے بیل کے بالوں کا حاشیہ تھا جو ابھی تک گھسا نہ تھا ۔ جس گھوڑے پر وہ سوار تھا وہ بھی راس کلاں نہیں تھا — بھدا سا ھڈیلا ٹٹو تھا ۔ لیکن نوجوان کے سادہ کپڑے اور اس کے گھوڑے کے معمولی ساج خوب محنت سے چمکائے ہوئے، صفائی سے جوڑ پیوند لگائے ہوئے، احتیاط سے پنھائے ہوئے تھے ۔ ''وہ بہت شاندار نہ سہی مگر صاف

آپ کے برابر چلوں گا تو میری ٹانگیں ٹوٹ تو نہیں جائیں گی۔''

''اچھا چلو، تمھاری ہی سہی اس لئے کہ تم اتنے شریف نوجوان ہو'' بڑے میاں نے کہا اور گھوڑے پر بیٹھ گئے۔

راستے میں بات‌چیت شروع ہو گئی۔ جیسا کہ چھوٹے کو کرنا چاهئے، ماشوک نے بڑے میاں سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن بڑے میاں نے اس سے جی بھر کر سوال کئے، اتنے کہ جب تک میں وہ گاؤں کے پاس پہنچے بڑے میاں کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ماشوک کے کوئی بھائی بہن نہیں ہیں اور وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ اکیلے ہی رہتا ہے، کہ اس سال اس نے دو دن کی جتائی بھر کالا گیہوں، ایک دن کی جتائی بھر باجرہ اور ایک دن کی جتائی بھر مکا بویا تھا اور اچھی فصل ہوئی۔ ماشوک اپنی زندگی اور اس تھوڑی سی آمدنی پر مطمئن تھا۔ اس کے پاس کھانے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑے تھے، اس کی صحت اچھی تھی، ماں ابھی ٹانٹھی تھیں — ایک آدیگئی کو خوش رہنے کے لئے اور کیا چاهئے؟ بس مقامی حاکم اور امیروں کے علاوہ اسے زندگی میں کسی چیز سے شکایت نہ تھی۔

جب وہ گاؤں کے بالکل باهروالے چوارهے پر پہنچے تو بڑے میاں نے گھوڑا روک لیا۔

''لو بیٹے، یہ رہا تمھارا گاؤں۔ میرا راستہ تو ابھی اور آگے جاتا ہے۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔

ہمیشہ اپنے بڑوں کو دی جاتی ہے، گھوڑے سے اترا
اور اس نے انہیں سلام کیا۔

بڑے میاں نے جواب دیا، ''جیتے رہو بیٹے، خوش
رہو''۔

وہ چھوٹے قد کے دبلے پتلے تھے اور سفید بالوں کا
نورانی حلقہ ایسا لگ رہا تھا جیسے ''بڑھیا کا بال''
اڑتا چلا آ رہا ہو۔ ماشوک ان کے چہرے کے
گورےپن سے بڑا متاثر ہوا، جیسے اسے دھوپ کبھی
لگی ہی نہ ہو۔ لیکن نوجوان اتنا بدتمیز تو نہیں
تھا کہ کسی طرح کے تعجب کا اظہار کرتا۔ اس نے
بڑے میاں کو فوراً اپنا گھوڑا پیش کیا۔

بڑے میاں نے جواب دیا، ''سکھی رہو میرے بیٹے،
خوشیاں ہی خوشیاں دیکھو۔ تم اپنے رستے جاؤ اور
میں، جیسا کہ میرا قاعدہ ہے دھیرے دھیرے پیدل
چلا جاؤں گا۔''

ماشوک نے اصرار کیا۔ ''دادا میاں، مجھے کوئی
جلدی نہیں ہے، آپ گھوڑے پر بیٹھ لیجئے۔
بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں گھوڑے
پر جاؤں اور ایک بزرگ آدمی کو پیدل چلنے
دوں؟''

بڑے میاں ہنس پڑے، ''لیکن میں اگر گھوڑے
پر بیٹھ لوں تو پھر تم کو پیدل چلنا پڑے گا؟''
ماشوک نے احتجاج کیا، ''دیکھئے آپ میرے بزرگ ہیں،
آپ کی عزت کرنا میرا فرض ہے لیکن مجھ سے یہ نہ
کہئے کہ میں تہذیب سے گرا ہوا برتاؤ کروں۔ میں

کا ہے کہ ان کو خود ہی اپنے بارے میں کچھ دھوکا ہوگیا ہے۔

اس نے جواب دیا، ''محترم بزرگ، میں یہ تو نہیں سمجھ سکتا کہ میں سچ سچ آپ کی تعریف کا مستحق ہوں لیکن چونکہ آپ نے اتنی مہربانی اور فیاضی سے یہ پیش کش کی ہے اس لئے مجھے سوچنے کا وقت دیجئے۔ میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کروں گا۔ مجھ جیسے کم عمر آدمی کا دماغ اچانک ایسی تین چیزوں کے نام نہیں بتا سکتا جو ایک نوجوان آدیگئی کےلئے سب سے زیادہ ضروری ہوں۔،،

بڑے میاں نے اس کی بات کو پسند کرتے ہوئے جواب دیا، ''یہ تو عقل کی بات ہے۔ تین دن بعد اسی جگہ پر آنا، میں تمھارا انتظار کروں گا۔،،

ماشوک اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور پھر جو اس نے مڑ کر دیکھا تو باوجود اس کے کہ ہر طرف کھلا میدان تھا ان بڑے میاں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

کیا وہ کوئی جن یا شیطان ہو سکتے ہیں؟ ماشوک کو سخت فکر تھی کہ آخر وہ اس طرح غائب کیسے ہو گئے؟

* * *

ماشوک کو یقین ہوگیا کہ بڑے میاں جن تھے پھر بھی وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نیک روح اپنا وعدہ پورا کرتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ جیسے ہی وہ اپنے

میں نے تمھاری زین پر اچھی طرح آرام کیا۔ اب آگے میں پیدل جاؤں گا۔''

ماشوک نے پیش کش کی کہ وہ بڑے میاں کو ان کے گھر تک پہنچا دے لیکن انھوں نے اس کو سختی سے منع کر دیا۔

''میرا گاؤں بہت دور ہے اور میں تمھیں اب زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ مجھے پیدل چلنے کی عادت ہے۔ تمھارا بہت شکریہ۔''

بڑے میاں دو ہی چار قدم چلے ہوں گے کہ مڑ کر ماشوک کو ایک پراسرار اور مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ تکنے لگے اور پھر بولے:

''بیٹے، تم سے میرا جی بہت خوش ہوا۔ میں تمھاری نیکی، تمھاری ایمانداری اور تمھاری محنت کا انعام دینا چاہتا ہوں۔ تم جو تین چیزیں سب سے زیادہ چاہتے ہو ان کے نام بتاؤ اور وہ تمھیں مل جائیں گی۔''

ماشوک حیران رہ گیا۔ بڑے میاں کا دماغ تو صحیح ہے نہ؟ جانے کتنی چیزیں ہیں جن کے نام میں بتا دوں لیکن یہ مجھے کہاں سے وہ سب لا دیں گے؟ پھر بھی اسے یقین نہیں ہوتا تھا کہ بڑے میاں مذاق میں کہہ رہے ہیں۔ جس آدمی کو ایسے سفید بالوں کا نور ملا ہو وہ کسی کو دھوکا تو ہرگز نہیں دے سکتا۔ ماشوک نے سوچا کہ زیادہ امکان اس بات

آدیگئی کی زندگی میں سب سے ضروری ہوتی ہیں ۔ لیکن تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ۔ اچھا گھوڑا اور اچھا اسلحہ حاصل کر لینا تو کوئی مشکل نہیں ہے مگر اچھی بیوی ؟ — مجھے تو نہیں لگتا کہ میں ڈھونڈ پاؤں گا ۔ تین عورتیں ہیں جو اچھی بیویاں بن سکتی ہیں ۔ ان میں سے دو تو بال بچوں والیاں ہیں، پکی عمر کی، تم سے بہت بڑی ۔ تیسری نوجوان ہے لیکن دو سال ہوئے اس کی بھی شادی ہو چکی ہے ۔ مگر خیر ... میں نے وعدہ کرلیا ہے تو وعدہ تو پورا کرنا ہی چاہئے ۔ فلاں گاؤں میں جاؤ اور معلوم کرو کہ نوروز نامی شخص کہاں رہتا ہے اور اس کی بیوی سے جان پہچان پیدا کرو ۔ اگر وہ تمہیں اچھی لگی تو پھر میں یہ گناہ بھی اپنی جان پر لوں گا ۔ وہ تمہاری ہوجائے گی ۔ جاؤ اور ہفتے بھر بعد اسی جگہ پر واپس آنا اور مجھے بتانا کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ۔،،

بڑے میاں نے نوجوان سے رخصت لی اور سڑک پر چل پڑے ۔ اس بار ماشوک نے ان پر سے نظریں نہیں ہٹائیں، اسے یہ جاننے کی فکر تھی کہ وہ پہلے ہی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں یا نہیں ۔ اچانک پتہ نہیں کیا ہوا کہ ذرا کی ذرا ماشوک کی توجہ ادھر سے ہٹ گئی اور جب اس نے دوبارہ دیکھا تو اجنبی جا چکا تھا ۔

عجیب پراسرار بڈھا تھا ! اس بات پر کہ بڑے میاں اپنا وعدہ پورا کریں گے ماشوک کو یقین تھا بھی اور نہیں بھی تھا ۔ لیکن اسے اس عورت کو دیکھنے

گاؤں پہنچا اس نے دعوت کی تیاری کی اور سب سے دانا بزرگوں کو مدعو کیا۔ جب وہ جمع ہوئے تو اس نے ان سے گزارش کی کہ وہ ایسی تین چیزوں کے نام بتائیں جو ایک نوجوان آدیگئی کےلئے سب سے ضروری ہوتی ہیں۔

بڑی دیر کے سوچ بچار کے بعد سب کے سب ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ ایک نوجوان آدیگئی کے لئے سب سے ضروری چیزیں ہیں اچھا گھوڑا، اچھا اسلحہ اور اچھی بیوی۔

تین دن بعد ماشوک مقررہ جگہ پر گیا۔ اسے امید تو نہیں تھی کہ بڑے میاں سے ملاقات ہوگی لیکن کرید کے مارے اس نے قرار کا پاس کیا۔ اسے بڑا ہی تعجب ہوا جب اس نے اجنبی کو اپنا منتظر پایا۔

بڑے میاں نے پوچھا، ''کہو بیٹے، معلوم کر آئے کہ تمھیں کون سی تین چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے؟''

ماشوک نے جواب دیا، ''معلوم کر لیا، محترم بزرگ۔ ہمارے بزرگوں نے مجھے بتایا کہ ایک نوجوان آدیگئی کےلئے سب سے ضروری چیزیں ہیں اچھا گھوڑا، اچھا اسلحہ اور اچھی بیوی۔ بس یہی مجھے چاہئیں۔''

بڑے میاں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ دھیرے دھیرے بولے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں، ''تمھارے بزرگوں نے بڑی دانشمندی کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے سچ مچ وہی چیزیں بتائیں جو ایک

''نہیں، مگر بس آتے ہی ہوں گے''، اور اس نے پورا پھاٹک کھول دیا۔

ماشوک اس عورت کی آواز سے بہت متاثر ہوا۔ وہ نرم نیچے لہجے میں بات کرتی تھی، نہ بیکار بہت ساری باتیں کرنے کا کوئی شوق معلوم ہوتا تھا نہ بہت زیادہ خاکساری کے ساتھ لفظوں کو کھینچ کر بات کرنے کا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کی سچائی اور خلوص پر شک کرنا ناممکن تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھی جو صاف دل سے بات کرتے ہیں۔

لیکن وہ کوئی اور چیز تھی جس کی وجہ سے اس میں خاص دلکشی تھی۔ ماشوک یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ چیز کیا تھی البتہ اس کا گرویدہ وہ فوراً ہی ہو گیا۔

عورت اسے ایک صاف ستھرے چھوٹے سے کمرے میں لائی۔

''آپ کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا، گھر والے ابھی آتے ہی ہوں گے''، اس نے کہا اور مہمان کی طرف پیٹھ کئے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

ماشوک کو احترام کے اظہار کے اس پرانے دستور میں پھر ایک بے پناہ کشش کا احساس ہوا حالانکہ دوسروں میں یہی چیز بہت ہی زیادہ رسمی اور پرتصنع لگتی تھی۔

ماشوک جب اکیلا رہ گیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ایک عجیب سے ہیجان میں مبتلا ہے۔ اس عورت میں کیا ایسی بات ہے جس نے اسے بالکل ہی اپنا شیدا

کا ایسا اشتیاق تھا جو اس کے لئے اچھی بیوی بننے لائق اکیلی عورت تھی کہ اس نے فوراً ھی اپنا سامان سمیٹا اور روانہ ھو گیا۔

بڑے میاں نے اسے جس گاؤں بھیجا تھا وہ کافی دور تھا۔ ماشوک نے گھوڑے پر دن بھر سفر کیا۔ آخرکار وہ ایک آدیگئی گاؤں میں پہنچا جو عام گاؤں جیسا تھا، ایک تیز رو پہاڑی چشمے کے کنارے کچی دیواروں اور سرکنڈے یا پھوس کے چھپروں‌والی جھونپڑیاں ایک دوسرے سے سٹی ھوئی بنی تھیں۔ ماشوک کو نوروز کا گھر ایک بل کھاتی ھوئی گلی کے اندھے سرے پر ملا۔

اس نے آواز دی تو ایک نوجوان عورت نکلی۔ بوٹاسا قد، بڑا رکھ رکھاؤ اور سڈول جسم۔ اس کی حرکات و سکنات سے نہ تو پریشان حال گرھستن کی ھڑبڑاھٹ ظاھر ھوتی تھی نہ ایسی حسینہ کی تن آسانی جو مردوں کی تحسین و عقیدت کی عادی ھو۔ ماشوک نے پہلی ھی نظر میں دیکھ لیا کہ وہ اپنے کام کاج بڑی آسانی اور اطمینان سے کرتی ھے۔ اسے حسینہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اس کا ناک نقشہ بڑا دلکش تھا۔

اس نے پھاٹک کھولا تو بغیر کوئی سوال پوچھے ھوئے کہا، ”آئیے، آئیے“۔

”نوروز یہیں رہتے ھیں؟“

”جی ھاں۔“

”ھیں گھر پر؟“

تھے۔ شاید یہ نوجوان میاں بیوی اکیلے ھی رھتے تھے، نہ بچے تھے نہ رشتےدار۔ گھر کی مالکن صحن میں اطمینان سے آ جا رھی تھی اور اسے دیکھ کر اس گھبراھٹ کا کوئی اندازہ نہ ھوتا تھا جو کسی مہمان کے آجانے سے ھوتی تھی۔ پھر بھی ماشوک کو یقین تھا کہ وہ اپنی زمہداریاں اتنے ھی دھیان اور محنت سے پوری کرتی ھے جتنی کہ انتہائی فکرمند اور مصروف دکھائی دینےوالی گرھستن کرتی ھوگی۔

اس کا اندازہ صحیح ثابت ھوا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ ھوا تھا کہ وہ ایک گول ''آنے،، * اٹھائے ھوئے اندر داخل ھوئی جس پر باجرے کا دلیا اور مرغ کا شوربہ رکھا تھا۔ پھر وہ ایک طشت اور آفتابہ لائی۔ اور جب مہمان ھاتھ دھو رھا تھا تو بولی:

''آپ ان کا انتظار کر رھے ھیں تو جب سے کچھ کھائیے۔ میزبان نہ ھو تو کھانے پینے کے بغیر مہمان کا وقت ذرا مشکل سے کٹتا ھے۔،،

پھر ماشوک کو سب سے زیادہ تعجب اس کی سادگی اور بےتکلفی پر ھوا۔

اپنے تعجب اور طرح طرح کے قیاسوں میں وہ اس قدر کھو گیا کہ اسے کچھ خیال ھی نہ رھا اور اچانک اسے احساس ھوا کہ وہ تو اس عورت کو گھورے جا رھا تھا۔ عورت نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور مہمان کو حیرت سے دیکھا۔ ذرا

---

* آنے — ایک نیچی ھلکی میز ۔ ایڈیٹر

کر لیا ہے؟ اس کی بے تکلفی؟ لیکن بہت سی بے تکلف عورتیں تھیں جو اس کو مسحور نہیں کر سکیں۔ اس کا رکھ رکھاؤ اور نرم دلی؟ یہ خوبیاں تو زیادہ‌تر آدیگئی عورتوں میں ہوتی ہی ہیں۔ اپنی پچیس سال کی زندگی میں ماشوک بہت سی عورتوں اور لڑکیوں سے ملا تھا، اور ان میں کچھ بہت خوبصورت تھیں لیکن کسی عورت کا اثر اس پر ایسا نہ ہوا تھا جیسا اس عورت کا۔

جب وہاں بیٹھا ہوا اس کی باتیں اور حرکات و سکنات یاد کر رہا تھا تو اسے لگا کہ یہ عورت جو کچھ کرتی یا کہتی ہے اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتی، کہ اس کی ساری قوت کسی ایسی بیش بہا چیز کو برقرار رکھنے پر مرکوز رہتی ہے جو اسے دل و جان سے عزیز ہے۔ ماشوک نے سوچا کہ اسی لئے وہ اتنی بے‌تصنع اور بے‌ساختہ ہے۔ اسے کوئی فکر نہیں کہ وہ کیسی دکھائی دیتی ہے، اس کے دل و دماغ پر کوئی اور ہی چیز چھائی ہوئی ہے جو بے‌انتہا زیادہ اہم ہے۔

کیا چیز ہو سکتی ہے، کیا ہے یہ پر مسرت راز؟ کون سی چیز ہے جس سے اس کے چہرے پر ایسی تابندگی رہتی ہے؟

ماشوک نے اپنی تپائی کو کھڑکی کے پاس کھسکا لیا اور باہر دیکھنے لگا۔ صحن میں اچھی طرح جھاڑو دی ہوئی تھی، مرغیاں اور چنیا مرغیاں گھومتی پھر رہی تھیں لیکن بچے کوئی نہیں

پھر سے سارا لادنا پڑا! اگر ان کی حرکتیں ایسی ہی رہیں تو پتہ نہیں کیسے کام چلےگا،، اس نے بیلوں کو گاڑی سے کھولتے کھولتے بیوی سے شکایت کی۔

وہ گرج تو بڑے زوروں میں رہا تھا لیکن اس کا شکایت کرنے کا انداز بچوں جیسا تھا۔ ماشوک نے سوچا کہ یہ گنوار بھولا دیو تو ایسی بیوی کے لائق نہیں ہو سکتا۔

بہ ظاہر اس نے اپنے شوہر کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ اس طرح ھنسی جیسے چھوٹے بچوں کی دلچسپ شرارتوں پر بڑے ھنستے ھیں۔

اس نے کہا، ''میری جان، آخر تم بیلوں پر کیسے غصہ کر سکتے ہو؟ ابھی کچی عمر کے ھیں! جب تم انھیں سدھا لوگے، نکال لوگے تو اچھے بیل بن جائیںگے،،۔ اور اس نے آگے بڑھ کر ایک چتی دار بھورے بیل کا ماتھا تھپتھپایا جس نے اپنا تھوتھن اس کے نرم ھاتھوں پر ملنا شروع کردیا۔

نوروز جلدی سے مڑا، اس نے ایک حیرت اور محبت بھری نظر بیوی پر ڈالی اور پھر بیلوں کو دیکھا۔ یکبارگی اس کے چہرے سے غصے کے آثار غائب ہو گئے اور وہ کہنے لگا:

''ٹھیک ھی تو کہتی ہو! آخر میں غصہ کس بات پر کر رھا ہوں؟ کوئی ایسی خاص بات تو ہوئی نہیں، گاڑی تو ٹوٹی پھوٹی نہیں۔ اب اس طرح کی باتیں تو ہوتی ھی رہتی ھیں۔،،

دیر کے لئے ان کی نگاھیں چار ھوئیں اور یہ دیکھ کر کہ مہمان اس میں علانیہ دلچسپی لے رھا ھے وہ چپکے سے وھاں سے کھسک گئی۔

ماشوک کو اپنی بدتمیزی پر بڑی شرمندگی ھوئی۔ اس کا چہرہ گلابی ھو گیا اور وہ کسمسایا، اس نے اپنا گلا صاف کیا اور جلدی جلدی کھانے لگا اور سوچنے لگا کہ اس عورت نے اس کی بیباک نظروں کو کتنی حاضر دماغی سے ٹال دیا تھا۔

وہ اس غیرمعمولی عورت کے بارے میں سوچنے میں اتنا محو تھا کہ اسے وقت کا کوئی احساس ھی نہ ھوا۔ اسے احساس تب ھوا جب نوروز واپس آگیا۔ اس کی بیوی اس کے پاس باھر گئی۔ ایک بار پھر ماشوک کو یہ بہت اچھا لگا کہ وہ جلدی میں تو تھی لیکن اس کی چال ھمیشہ کی طرح پرسکون اور پروقار تھی۔

اس نے جلدی سے بڑھ کر وقت پر پھاٹک کھول دیا اور سوکھی گھاس سے لدی ھوئی گاڑی اندر آگئی۔ گھاس کے ڈھیر پر سے تاؤ دی ھوئی سونچھوں والا ایک تنومند اور وجیہ نوجوان کودا۔ ایسا لگ رھا تھا جیسے وہ کسی چیز پر جھنجلایا ھوا تھا۔

اس نے چڑچڑے پن سے کہا، ”ان کمبخت جانوروں نے کیسا مجھے عاجز کیا ھے! جیسے یہ ٹھان رکھی ھو کہ سڑک پر تو چلیں گے ھی نہیں! ایک پہیا ایک کڈھے میں چلا گیا اور پورا بوجھا نیچے آرھا!

5*

سمٹ گئی، ابھر کے سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔
ماشوک کو ایسا لگا جیسے وہ اس کے طویل جذبات
میں ڈوبے ہوئے بوسے کو محسوس کر سکتا ہے۔
لیکن اگلے ہی لمحے اسے اتنا آپس کا رازدارانہ منظر
دیکھ لینے پر شرم آئی اور وہ کھڑکی سے ہٹ آیا۔

* * *

جب میزبان اور مہمان بہت دیر میں کھانا پینا
ختم کر چکے تو گھر والی اندر آئی اور اس نے
پوچھا کہ اب شیرینی کی طرح وہ کیا کھانا چاہتے
ہیں تربوز یا دھی؟

نوروز نے اپنی گرجدار آواز میں چلاکر کہا،
''تربوز کھائیں گے، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات
ہے۔''

اس نے اپنے شوہر سے کہا، ''تربوز تو دوچھتی پر
سے اتارنا پڑے گا۔ ذرا آ کے میری مدد کرو۔''

ماشوک کو باورچی خانے سے ان کی آوازیں سنائی
دیتی رہیں جہاں دوچھتی پر جانے کی سیڑھی لگی
تھی۔ اس نے دوچھتی پر عورت کو تربوز لڑھکاتے
سنا۔ ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا تربوز چھانٹ
رہی تھی۔ پکار کر اس نے پوچھا، ''یہ ٹھیک رہے گا؟''
شوہر نے جواب دیا، ''کوئی اور اچھا ڈھونڈو۔''
کئی بار ایسا ہی ہوا۔ پھر عورت اس پر برس
پڑی:

''تمھیں تو کوئی پسند ہی نہیں آتا! اندھیرا تو

عورت نے آواز ذرا نیچی کر کے کہا، ''گھر میں مہمان ہیں۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔،،
''مہمان؟ کون ہیں وہ؟،،
''معلوم نہیں۔ ہماری طرف کے نہیں ہیں۔ اچھے بھلے نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔،،
''کون ہو سکتا ہے؟ خیر کوئی بھی ہو، ہمارا مہمان ہے۔ اور مہمان کے آنے سے ہمیشہ رونق ہوجاتی ہے۔ ،،
''بیلوں کو باندھ دو اور اندر چلو۔گھاس بعد میں اتار لیں گے۔،،
''ہاں، ہاں، ایسے ہی کریں گے،، نوروز نے اس کی بات مان لی اور بیلوں کو ایک باڑے میں لے گیا۔ بیوی اس کے پیچھے پیچھے گئی، گھاس کے ایک مٹھے سے بیلوں کے پہلو پر مار کر انھیں ہنکاتی ہوئی۔
جب نوروز نے دیکھا کہ چرھی میں بیلوں کے لئے تازہ کٹی ہوئی گھاس پہلے ہی سے ڈال دی گئی تھی تو پھر وہ جلدی سے اپنی بیوی کی طرف مڑا اور دیر تک محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کرتا رہا اور جیسے ہی بیل باڑے میں چلے گئے ویسے ہی اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔
ماشوک نے دیکھا کہ یہ غیر معمولی عورت ذرا سا تو کسمسائی، سچی حیا سے، لیکن پھر اتنی ہی سچی سپردگی سے اپنے شوہر کی مضبوط بانہوں میں

5—1404

لیکن ماشوک بہت پہلے یہ سمجھ چکا تھا کہ اس عورت کی خاص خوبی یہ نہیں ھے کہ وہ اپنے شوھر کا خیال اور فکر رکھتی ھے جیسا کہ شوھر اپنی سادگی میں سمجھتا تھا۔ یہ خیال اور فکر تو ایک اور خوبی کا حصہ تھا جس کی دلکشی ماشوک نے اس عورت کو دیکھتے ھی محسوس کی تھی لیکن ابھی تک اسے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کون‌سی چیز تھی وہ جو اس میں ایسا بےبس کر دینےوالا جادو پیدا کر دیتی تھی؟

ماشوک تین دن ان کے گھر میں رھا اور سارے وقت وہ گھروالی کو دیکھتا اور اس کے بارے میں سوچتا رھا۔ جتنا زیادہ وہ اسے دیکھتا اتنا ھی اس کی قدر ماشوک کے دل میں بڑھتی جاتی۔ ان تین دنوں میں ایک بار بھی اس نے نہ کوئی سخت بات کہی نہ کوئی بیجا بات کی۔ وہ خاموشی سے بغیر کسی ھنگامے ھڑبڑاھٹ کے آتی جاتی تھی اور اپنے سارے کام‌کاج اس طرح کرتی رھتی تھی کہ پتہ ھی نہ چلتا تھا۔ مہمان کےلئے ھر وقت کھانا پینا حاضر رھتا تھا۔ وہ گھریلو کام‌کاج کا بھی ادھم نہیں مچاتی تھی کہ ادھر جا اور ادھر بھاگ سے گھر آنگن ایک کر دے۔ اور کام چاھے کتنا ھی کرنا پڑے اس کے ماتھے پر شکن تک نہ پڑتی تھی اور محبت کی اس تابندگی میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا جو اس کے چہرے سے ٹپکتی رھتی تھی۔

آدیگئی رسم و رواج کے مطابق نوروز کے مہمان سے

ہے یہاں، سجھائی تو دیتا نہیں کہ کونسا سب سے اچھا ہے۔،،

''چلو، لاؤ یہی والا دے دو!،، نوروز نے جواب دیا۔

جب تربوز کھا لیا گیا تو عورت ''آنے،، اٹھا لے گئی اور دونوں مرد اکیلے رہ گئے۔ نوروز سے نہ رہا گیا اور اس نے دبی آواز میں بتا دیا:

''میرے عزیز مہمان، میں تم سے یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ساری دنیا میں مجھ جیسا خوش‌نصیب آدیگئی کوئی اور نہیں ہے۔ میرے لئے تو بیان کرنا مشکل ہے کہ میری بیوی کیسی هیرا عورت ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ وہ دوچھتی پر تربوز لڑھکا لڑھکا کر سب سے اچھاوالا چھانٹنے کی فکر میں تھی؟ میں صاف بتاؤں تم کو کہ ہمارے ہاں بس ایک ہی تربوز بچا تھا۔ اس نیک‌بخت عورت نے ایسا دکھایا کہ ہمارے پاس بہت ہیں تاکہ کسی اجنبی کو ہماری غریبی کا حال نہ معلوم ہو اور مجھے شرمندگی نہ ہو۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔ چاہے ہمارے پاس بہت ہو چاہے کچھ بھی نہ ہو، اسے بس ایک ہی فکر رہتی ہے کہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ تم مجھے ہوشیار اور اچھے آدمی لگتے ہو۔ میں تمھیں سب سے اچھی دعا یہی دے سکتا ہوں کہ تمھیں بھی میری جیسی بیوی ملے۔ زندگی میں اچھی بیوی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔،،

دو تو ھیں۔ میں چاھتا ھوں کہ تم آرام کرو۔ تم کیوں یہ سمجھتی ھو کہ میرے انتظار میں بیٹھے رھنا تمھارا فرض ھے۔''

ماشوک نے پھر عورت کی دبی دبی ھنسی کی آواز سنی، جیسے وہ کسی بچے کے من موجی پن کا مزا لے رھی ھو۔

''میری جان، تم یہ بھول جاتے ھو کہ تمھیں خوش کرکے مجھے خوشی ملتی ھے، اس میں کوئی تکلیف نہیں ھوتی۔''

نوروز کی گرجدار آواز میں محبت کی نرمی پیدا ھو گئی، ''ایسا لگتا ھے کہ تم نہیں بدل سکتیں، جیسی ھو ویسی ھی رھوگی، انمول چیز۔''

اچانک ماشوک کو اس پہیلی کا جواب مل گیا جو اسے پریشان کئے ھوئے تھی۔ اس نے دل ھی دل میں سوچا: یہ عورت ان کمیاب لوگوں میں ھے جنھیں اس خوشی کی قدر کرنا آتا ھے جو انھیں حاصل ھوتی ھے۔ وہ جانتی ھے کہ خود اپنی محبت کی اور اپنے شوھر کی محبت کی قدر کس طرح کرے۔ اسے بڑی چیزوں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تمیز کرنا آتا ھے اور یہی اس کی دلکشی کا راز ھے۔

* * *

جب وقت آیا تو رنجیدہ اور فکرمند ماشوک مقررہ جگہ پر بڑے میاں سے ملنے کےلئے پہنچا۔

ملنے کےلئے اور ان کی خاطر مدارات میں ھاتھ بٹانے کےلئے پڑوسی بھی آئے۔ اور جب انھوں نے دیکھا کہ ماشوک اچھا اور ھوشیار آدمی ھے تو سب نے اسے اپنے گھر بھی مدعو کیا۔

اسی طرح کی ایک دعوت سے ایک بار ماشوک اور نوروز دیر سے لوٹے۔ گھر میں داخل ھوئے تو نوروز کی بیوی نے، جو ان کے انتظار میں بیٹھی تھی، بڑی خوشی سے ان کا استقبال کیا۔ جب وہ اپنے شوھر نوروز کے ساتھ باورچی خانے میں گئی تو وھاں سے ماشوک نے یہ بات چیت سنی:

''آنے، تیار ھے، مہمان کے سامنے لے جاؤ!،،

شوھر نے اعتراض کیا، ''یہ تم کہہ کیا رھی ھو؟ ھم لوگ ساری شام دسترخوان ھی پر تو بیٹھے رھے ھیں۔،،

''وہ تو ھمارے پڑوسیوں نے تمھاری خاطر مدارات کی لیکن ھمارے مہمان نے ابھی رات کا کھانا تو صحیح معنوں میں کھایا نہیں۔ آخر تم لوگ اتنی دیر تک باتچیت کرتے رھے اب تو پھر سے بھوک لگ آئی ھوگی۔،،

نوروز نے جھنجلا کر کہا، ''ھرگز نہیں، اب ھم کچھ بھی نہیں کھا سکتے۔ اور کتنی دفعہ میں نے تم سے کہا کہ جب میں کہیں ملنے ملانے جاؤں تو تم بیٹھی انتظار مت کرتی رھا کرو۔ کس کو اس بیوقوفی کے رواج کی پروا ھے؟ کون ھے اس گھر میں جو تم کو برا کہےگا؟ لے دِے کے بس ھمیں
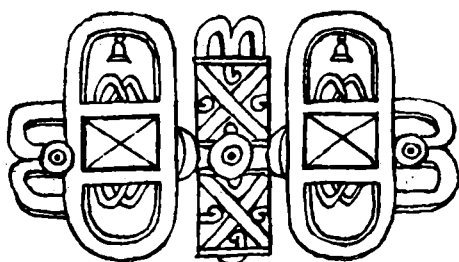
چیمیت تسیدندامبائیف

اوس کی صاف بوند

پراسرار اجنبی نے اس سے پوچھا، ''کہو میرے بیٹے، اچھی لگی وہ عورت تمھیں؟''

ماشوک نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھیں نیچی کر لیں۔

آخر اس نے کہا، ''اگر آدمی کو اس طرح کی بیوی مل جائے تو پھر اس سے بڑی خوشی اسے نہیں مل سکتی۔ لیکن مجھے لگتا ھے کہ میری قسمت میں یہ خوشی نہیں ھے۔ اگر میں ان دونوں کی خوشی کو برباد کر دوں تو میرا ضمیر اذیت دے گا اور لوگ مجھ پر لعنت بھیجیں گے۔ میں اچھے گھوڑے اور اچھے اسلحے ھی پر قناعت کروں گا۔ اگر اب بھی آپ چاھتے ھوں تو یہ دونوں چیزیں مجھے دے دیجئے، میں اچھی بیوی اب نہیں مانگ سکتا۔''

قدر افسوس کا، فخر اور اسی کے ساتھ شرم کا احساس ہوا؟
شاید یہ بہتر ہوگا کہ میں آپ کو اس دستاویز سے روشناس کرا دوں۔ پہلی دستاویز بہت اچھی حالت میں تھی، بس رنج اس بات کا ہے کہ وہ اچانک اس طرح ختم ہوجاتی ہے جیسے کسی تیز کلھاڑی سے اسے کاٹ دیا گیا ہو۔ کاتب کی تحریر بہت کھلی ہوئی اور خود حروف بھی بڑے بڑے اور دائرہ‌دار ہیں۔ ان سے لکھنےوالے کے کردار کی خوداعتمادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو یہ ہے اس مکتوب کی عبارت (میں اسے تقریباً لفظ بہ لفظ نقل کر رہا ہوں، بس بعض جگہوں پر زبان اور اسلوب کو ذرا سادہ کر دیا ہے تا کہ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجائے) :

''سن اٹھارہ سو اکسٹھ کے ماہ مئی کی چودھویں تاریخ کو مجھے، اوسنسکی گارد میں دس سواروں کے افسر کزاک اسخائی بگاخانوف کو، جس کا اتامان* پرفیلیئف نے چار موقعوں پر انتہائی اعلی عمدگی کی خدمات انجام دینے کےلئے شکریہ ادا کیا ہے اور جو اب چھ مہینے کی رخصت پر اپنی ''اولوس،، (بستی) سناگتا میں ہوں، ایک کاغذ ملا جو سارتول کے ''زائیسنگ،، (پنچ) کے ایک سابق منشی اور مترجم تاش خان خاتسائیف کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ تاش خان خاتسائیف اب منشی ہے نہ مترجم بلکہ ایک بےگھر بےسہارا گڈریا ہے جو روزانہ

---

* اتامان — کزاکوں کے سردار۔ ایڈیٹر

گھاس کی لچکیلی پتی پر تھرتھراتی ہوئی اوس کی صاف بوند میں آس پاس کی دنیا کا عکس دکھائی دیتا ھے - وہ ننھی سی تھرتھراتی ہوئی بوند چاھے کتنی ھی چھوٹی کیوں نہ ھو اس میں آسمانوں کی جگمگاتی ہوئی نیلگوں گہرائیاں بھی دیکھی جا سکتی ھیں -

ہم کبھی کبھی کسی دور کی دستاویزوں کے بارے میں اپنے الفاظ کے معنی پر غور کئے بغیر ھی باتیں کرتے ھیں جیسے ھمارے اجداد کو ھر صدی کے آخر میں بس ایک ھی فکر رھتی تھی کہ اپنے بہت بعد میں آنے والے اور انجانے ورثا کے لئے کونسی اپنے ''عہد کی دستاویز،، تیار کریں، بالکل اسی طرح جیسے سمجھ لیجئے کہ آج کے محاسب اپنی سالانہ مالی رپورٹ تیار کرتے ھیں -

لیکن ایسا ھے نہیں - آخر کوئی ان ساری چیزوں کو کیسے گنا سکتا ھے جن پر تاریخ نے اپنی نشانیاں چھوڑی ھیں! کبھی کبھار ایک نجی خط کا چھوٹا سا حصہ ماضی کے معموں پر کسی بھی سرکاری دستاویز سے زیادہ روشنی ڈال سکتا ھے - کبھی کبھی ایسا ھوتا ھے کہ انتہائی غیرمعمولی شہادت بھی کسی بہت ھی اھم واقعے کے عکس کی حامل ھو سکتی ھے -

ایک بار مجھے ایک ''داتسان،، * میں، جو اب بند ھو چکا تھا، اتفاق سے ردی میں تقریباً ایک صدی پرانے کچھ صفحات مل گئے - اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ماضی کی اس بیش بہا دستاویز کو پڑھ کر مجھے حیرت اور ھیجان کا کیسا احساس ھوا، کیسی خوشی اور کس

---

* داتسان — پرانا بودھ مندر - ایڈیٹر

میں نے زبردستی خاتسائیف سے چھین لی اور اسے
پورے کا پورا نتھی کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اس
کے جلد فیصلہ کرنے میں اور اس ناکارہ خاتسائیف کو
عہدہ رکھنےوالے لوگوں کو، اس لئے کہ دس
سواروں کے کزاک افسر کی بھی مراعات ہوتی ہیں،
زبان سے مجروح کرنے کی سزا کے اقدامات کے متعلق
سن گیارہ سو آٹھ کے ضابطے کے مطابق کوڑے لگانے
اور مالی جرمانہ ادا کرنے کی سزا دینے میں آسانی
ہو ۔ اگر پورے سات دن گزرنے کے بعد...،،
اس جگہ پر دس سواروں کے کزاک افسر
اسخائی بگاخانوف کے استغاثے کا سلسلہ منقطع ہو
جاتا ہے اور اس کے بعد وہی توہین آمیز کہانی
ہے جو ''منشی نہ مترجم بلکہ ایک بےگھر بےسہارا
گڈریا ہے جو روزانہ اجرت پر کام کرتا ہے،،
تاش‌خان خاتسائیف نے لکھی تھی۔ اسے بھی میں
تقریباً کسی تبدیلی کے بغیر ہی نقل کرتا ہوں:
''بڈھا روز صبح کو نمدے کے دھوئیں بھرے خیمے
سے نکلتا، ہاں، روز صبح کو وہ چھت سے ٹپکنےوالے
نمدے کے خیمے سے نکلتا۔ نمدے کے خیمے کے
جھنے کپڑے سے نہ اندر کی گرمی رکتی اور نہ وہ
بیرحم ہوا سے حفاظت کر سکتا۔ نمدے کا خیمہ پرانا تھا،
ہاں، سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت برا نمدے کا خیمہ تھا۔
''بڈھا روز صبح کو نکلتا لیکن اس لئے نہیں کہ
خداؤں کی برکتوں کےلئے ان کا شکر ادا کرے، نہیں
اس کے قدم تو اس کے کنجوس مالدار پڑوسیوں

اجرت پر کام کرتا ہے، وہ بےخاندان اور بےقبیلہ آوارہ گرد ہے۔ اس کے اس کاغذ کے بارے میں بہت سے بدذات ناکارہ لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے جنھوں نے بڑے طنز کے ساتھ میرا مذاق اڑایا جب میں سنچائی والی چراگاہ پر ان کو محنت کرتے دیکھنے گیا۔ وہ سب کے سب ایک دوسرے سے بڑھ کر گندے ہیں اور ہمیشہ مجھے اور میری عورت سنجیدہ خوبلائیوا کو بدنام کرنے کےلئے کنجوس اور غصیل کہتے ہیں۔ آوارہ گرد تاش‌خان خاتسائیف سب سے بڑھ چڑھ کر باربار ایسا کہتا ہے اس لئے کہ اس کا کہنا ہے کہ میں نے اس کے بیان کے مطابق اس کی محنت کے عوض میں اسے ستر کوپک دینے سے انکار کر دیا اور وہ اس بات کو نہیں سمجھتا، وہ لفنگا، کہ میری گھاس سوکھی نہیں تھی تبھی اس نے اس کو جمع کیا اور اس لئے وہ سڑ گئی۔ تو اس نے مجھے بیوقوف اور میری عورت کو گھٹیا کہہ کر ہماری توہین تک کرنی شروع کردی اور اس نے اپنے اس شرمناک قصے کو ساری بستیوں میں پھیلا کر ایسا کر دیا کہ سب ہم پر ہنستے ہیں۔ اس کی اس حقارت آمیز کہانی میں ایک لنگڑی بڑھیا دکھائی گئی ہے اور میری عورت بھی اس بدنصیبی کا شکار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تاش‌خان خاتسائیف کی یہ بدنیت کہانی ہمارے ہی خلاف ہے یعنی دس سواروں کے ایک کزاک افسر اور میری عورت کے خلاف ہے۔ تو یہ کہانی

اس نے سوچا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ چٹکی بھر چائے، ایک روڑی ہی سہی نمک، تھوڑا آٹا، شوربے کےلئے ایک بوٹی گوشت اور اپنے کٹورے میں ایک بوند دودھ تو مانگ ہی سکتا تھا۔ لیکن بھلا کسی چڑیا کو کوئی کیسے پریشان کر سکتا ہے، وہ بھی سنہرے پروں‌والی چڑیا کو، اس دنیا کی نہیں دیوتاؤں کی چڑیا کو؟ تو وہ چلا گیا اپنی لنگڑی پوپلی بڑھیا کے پاس یہ سوچ کر کہ وہ یہ سن کر خوش ہوگی کہ اس نے ایک گھونسلے کو سانپ سے بچایا ہے۔

''لیکن یہ بڑھیا، باپ رے باپ! مکے ھلا ھلا کر اور چلا چلا کر اس نے بڈھے کو چڑیا کے پاس واپس بھیجا کہ جا کر اس سے کہے کہ میری بڑھیا کےلئے جوتے دو۔ اس کے جوتوں کے تلے تک گھس گئے ہیں... چڑیا کو بھی اس نے خوب کوسا کہ وہ بیوقوف ہے۔ اگر وہ چڑیا ایسی ہی دیوتاؤں‌والی ہے تو وہ خود ہی سمجھ جاتی اور میرے لئے نیلی ریشمی ہیٹ بھیجتی اس لئے کہ میری ہیٹ تو خستہ ہوگئی ہے...

''بڑھیا نے اپنے شوہر کو بھگا دیا اور جب وہ باھر جارہا تھا تو اس کی پیٹھ پر راکھ بھی جھونک دی۔

''بڈھا گھونسلے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ اس کے سامنے ایک تھال میں وہ سب چیزیں آگئیں جو اس کی بیوی نے مانگی تھیں۔ یہ سب قیمتی تحفے لایا وہ اپنی بڑھیا کے پاس۔

''اس بیرحم اور بدمزاج بڑھیا یعنی بڈھے کی کنجوس کتیا بیوی نے وھیں کھڑے کھڑے ساری عمدہ

کی طرف اٹھتے۔ وہ چٹکی بھر چائے مانگتا، ایک روڑی نمک مانگتا، روٹی کےلئے تھوڑا سا آٹا، شوربے کےلئے ایک بوٹی گوشت اور اپنے کٹورے میں بوندبھر دودھ مانگتا۔ اس دن پڑوسیوں نے اس کو چائے نہیں دی اور نمک بھی نہیں دیا، آٹا دینے سے انکار کر دیا اور گوشت دینے سے بھی اور اس کا کٹورا اسے خالی ھی لوٹا دیا۔ انھوں نے کہا کہ تم تو یہاں کل بھی آئے تھے اور ھم تو تمھیں پہلے بھی دے چکے ھیں... اور وہ چھت سے ٹپکنےوالے نمدے کے خیمے کے راستے پر لوٹ آیا۔

''بڈھا ایک ھری گھنی شاخ کے نیچے سڑک کنارے بیٹھ گیا۔ اس شاخ پر ایک چڑیا کا سونے کا گھونسلا تھا۔ ایک سانپ رینگتا ھوا گھونسلے کی طرف بڑھ رھا تھا۔ اس کے رنگ برنگے سیہرے چمک رھے تھے۔ پاس ھی ایک چڑیا اڑ رھی تھی، رو رھی تھی اور مدد کےلئے پکار رھی تھی... بڈھے نے اپنی چھڑی اٹھائی اور سانپ کے ٹکڑے کرکے رکھ دئے۔ بدنما کیڑا ختم ھوگیا اور اپنے ھی زھر میں مرکر رہ گیا۔ چڑیا اڑکر اپنے گھونسلے پر آئی اور اس نے جھک کر بڈھے کی تعظیم کی اور انسانی آواز میں بہت ھی صاف بریات زبان میں بولی، 'نیک آدمی، مانگو کیا مانگتے ھو، تمھاری ھر مراد پوری ھوگی۔'

''بڈھا ظاھر ھے کہ حیران رہ گیا کہ چڑیا بریات میں بولتی ھے اور اس نے کوئی بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ بعد کو جب چڑیا اڑ گئی تو

''اس بیرحم اور خوبصورت عورت نے اپنے شوہر کو بھگا دیا اور اس کو ایک جلتی ہوئی لکڑی کھینچ کر ماری۔
''بڈھا گھونسلے کے پاس گیا اور اس نے سنہرے پروں والی چڑیا کی تعظیم کی۔ چڑیا نے اس کی پوری بات سنی اور کہا :
'' ' اچھا تم جاؤ، جو کچھ تمھاری بیوی چاہتی ھے سب ھو جائے گا!'
''بڈھا اپنے گھر واپس آیا اور اس نے دیکھا کہ وھاں نمدے کا خیمہ نہیں بلکہ ایک مکان کھڑا ھے جس کی چھت چاندی کی ھے، اس کی دھلیز صندل کی لکڑی کی بنی تھی اور کھڑکیاں تو اتنی تھیں کہ گننے میں نہ آئیں۔ ستر کھڑکیاں تو اتر کی طرف تھیں اور اسی پچھم کی طرف۔ گھر کے سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی جو بغیر گھوڑوں کے کہیں بھی جا سکتی تھی۔ اور پیتل کے کھونٹوں سے بندھے ہوئے بےانتہا شاندار خولیگی گھوڑے تھان پر جم رھے تھے۔ اور اس عالیشان گھر کے اندر سے بڈھے کی کمینی بیوی کے کوسنے کی آوازیں آ رھی تھیں : 'نہیں چاھئیں مجھے یہ سفید بھیڑیں جو پہاڑی ڈھلانوں پر چھائی ھوئی ھیں، نہیں چاھئیں مجھے یہ موٹی تازی گائیں جن سے وادی کے کھیت بھرے ھوئے ھیں۔ اور تمھاری چڑیا کوئی چڑیا نہیں ھے۔ کیسی چڑیا وہ تو ایک بیوقوف چیز ھے... اس کو خود اندازہ لگا لینا چاھئے تھا اور میرے لئے بھنے ھوئے چوزے بھیجنے چاھئے تھے، خود اپنے بچے... اس سے کہو کہ میرے لئے روپوں سے بنی ھوئی

چیزیں پہن لیں اور پھر لگی کوسنے چڑیا کو، اسی
معجزے دکھانےوالی فیاض چڑیا کو کہ کیسی
بےعقل ھے وہ چڑیا اور کہیں سے بھی وہ عجیب و غریب
چڑیا نہیں ھے... وہ خود ھی اندازہ لگا سکتی
تھی — مجھے پہلے کی طرح حسین بنا دیتی اور میں
پھر سے جوان ھو جاتی، میری چوٹیوں کے بال کالے
ھو جاتے اور میرے دانت پھر سے نکل آتے۔،

''بڑھیا نے اپنے شوھر کو بھگا دیا اور جب وہ جا رھا
تھا تو اسے دھکتے انگارے پھینک پھینک مارے۔

''بڈھا ابھی گھونسلے تک پہنچ بھی نہ پایا تھا
کہ اس کی بدمزاج عورت جوان اور اتنی خوبصورت
ھوگئی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ گھر
واپس آیا تو اپنی بیوی کو پہچان بھی نہیں سکا۔
ایسی حیرت انگیز چیزوں کو دیکھ کر وہ اتنا ڈرا
کہ اس نے اپنے جھنے خیمے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔
پھر اس نے یہ باتیں سنیں جن پر خود اس کے
کانوں کو بھی یقین نہ آیا کہ کیسی کم عقل ھے
وہ چڑیا اور کہیں سے بھی وہ عجیب و غریب چڑیا نہیں
ھے... کیا وہ خود سے اتنا نہ سوچ سکتی تھی کہ اب
میرے لئے ایک خوبصورت دولہا بھیج دے، کمیت
گھوڑے جن کی ایال اور دمیں سفید ھوں اور گاڑی
ایسی کہ خان نے بھی کبھی خوابوں میں بھی نہ دیکھی
ھو۔ اور میرے پاس اتنی سفید بھیڑیں ھوں کہ
پہاڑی کی دکھنی ڈھلان پر چھا جائیں اور میری
موٹی تازی گایوں سے وادی بھر جائے...،

معاملے میں جو انھوں نے اپنی گھاس کاٹنے کے لئے
مجھے ادا نہیں کئے، انصاف انھیں کے حق میں ھے
اور اگر میں بھی ان کی جگہ پر ھوتا تو میں نے
بھی ایسا ھی اقدام کیا ھوتا اس لئے کہ میں نے
گھاس کے جو ایک سو نوے ڈھیر کاٹے اور
سکھانے کےلئے الٹے پلٹے تھے ان میں سے دس میری
ھی غلطی سے خراب ھو گئے تھے۔ اور ستر کوپک
بہرحال میرے لئے تو کوئی معنی نہیں رکھتے اور
وہ میرے لئے حرص و ھوس کا موجب ھی بنتے، ھو
سکتا ھے میں انھیں تاش کے کھیل میں ھار جاتا یا
وہ راستے میں گر گرا جاتے۔

"کہانی کے معاملے میں، یہ اگرچہ میرے ھاتھ
کی اور میرے کاغذ پر لکھی ھوئی ھے، بس ایک
حد تک میرے لاپروا تخیل کا نتیجہ ھے۔ مذکورالصدر
کا اصل مصنف میں کسی طرح بھی نہیں ھوں بلکہ
جاگیردار الکساندر پوشکن ھیں جو بہت زمانہ ھوا
وفات پا چکے ھیں۔ میں نے اس کو صرف بریات
زبان میں بیان کر دیا ھے، کسی کی ھتک عزت
کا خیال کئے بغیر۔ اگر اس بےضرر حرکت سے دس
سواروں کے کزاک افسر اسخائی بگاخانوف اور ان کی
زوجہ کے فخر و وقار کو ٹھیس پہنچی تو انھیں
چاھئے تھا کہ مصنف پوشکن کی حیات ھی میں
اس طرح پہنچنےوالی چوٹ اور ھتک کی تلافی کے
خواستگار ھوتے۔ نظر بہ مذکور الصدر میں آپ
عالیجناب زائیسنگ دانزائی شادلائیف، اعلی حضرت

جرابیں بھیجے، خود اپنے بچوں کے نرم رویوں سے بنی ہوئی ۔ اور خود اڑ کر میرے پاس آئے، مجھے لوریاں سنائے، اچھے گیت سے میرے کانوں میں رس ٹپکائے اور میرے قدموں پر غلاموں کی طرح اپنا ماتھا رگڑے ۔،

''بڈھا ڈرتا کانپتا ہوا باھر گیا اور اس بدذات عورت نے اسے کھولتے پانی سے بھری لوھے کی کیتلی کھینچ کر ماری۔

''بڈھے نے چڑیا کو بڑی دیر تک آوازیں دیں تب کہیں جا کر وہ نکلی ۔ بڈھے نے اپنی عورت کی بات بتائی، اس کے احمقانہ احکامات سنائے ۔ سب کچھ سننے کے بعد بھی چڑیا چپ سادھے رھی، پھر اس نے اپنے سنہرے سنہرے پر پھڑپھڑائے، اور اڑتی ہوئی اوپر نیلے آسمان کی بلندیوں میں کھو گئی ۔ بڈھا اپنے گھر گیا اور اس نے اپنی بڑھیا کو دیکھا ۔ وہ اپنے دھوئیں سے کالے نمدے کے خیمے میں بیٹھی تھی، اپنے بے تلوں کے بوٹ پہنے تھی اور اس کے بے عقل سر پر، جو بالکل خالی تھا، اس کی پھٹی پرانی ٹوپی رکھی تھی۔،،

ایک اور دستاویز ھے جسے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاھتا ھوں ۔ یہ وہ بیان صفائی ھے جو تاش خان خاتسائیف نے زائیسنگ کو اسخائی بگاخانوف کے استغاثے کے جواب میں لکھا تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا وہ درج ذیل ھے :

''میں تاش‌خان بوبیہ خاتسائیف نے دس سواروں کے کزاک افسر اسخائی بگاخانوف کی عزت عالی یا ان کی محترم زوجہ سنجیدہ خوبلائیوا کی ھتک کرنے کا کبھی خیال بھی نہ کیا تھا ۔ ستر کوپک کے

مصنف الکساندر پوشکن کا درحقیقت اس دنیا میں
وجود تھا اور دوسری تصنیفات کے علاوہ اس نے
'قصہ مچھلی اور مچھوے کا، بھی لکھا ھے۔
واقعہ یہ ھے کہ اس قصے کو سنسر نے منظور کر دیا
تھا اور وہ پہلی بار، اگر میں اس حقیقت کی صحیح
تصدیق کر سکا ھوں تو، ۱۸۳۵ء میں ''مطالعے کےلئے
مجموعۂ انتخابات،، جلد دھم میں شائع ھوا تھا۔
جہاں تک اس کے نفس مضمون کا تعلق ھے تو وہ
آپ کے خاتسائیف کے متن کے تقریباً عین‌مطابق ھے
اور اس بات کا یقین کرنے کی ھر شہادت موجود ھے
کہ یہ بریات زبان میں اس قصے کا ترجمہ ھے۔
سوائے سرکاری دستاویزات کے کسی بھی تصنیف کے
ترجمے میں بعض تبدیلیاں اور صحت کی غیرپابندی
موجود ھو سکتی ھیں اور یہ بالکل جائز ھیں۔
خاتسائیف نے اپنے ترجمے میں اپنی مرضی سے اس
تصنیف کو استیپ کے باشندوں کےلئے زیادہ قابل فہم
بنانے کے خیال سے بعض حقائق تبدیل کر دئیے ھیں
لیکن اس نے اس تصنیف کو، جیسا کہ الکساندر
پوشکن نے لکھا تھا، مسخ نہیں کیا ھے۔ چنانچہ اس
کا ترجمہ کافی دلچسپ ھے اور اس سے آدمی یہ
سمجھتا ھے کہ خاتسائیف ایک فطری شےلطیف کا
اور اپنے اظہار میں الفاظ کو آزادانہ طور پر اور
تخیل کے ساتھ استعمال کرنے کی صلاحیت کا مالک
ھے۔ میرا خیال ھے کہ یہ قصہ دس سواروں کے
کزاک افسر کی زوجہ کی ھتک عزت کرنے کی

شہنشاہ کے قوانین کے پاسبان سے بصدادب التجا کرتا ہوں کہ مجھے دس سواروں کے کزاک افسر نادان اور شکی مزاج اسخائی بگاخانوف کے حملوں سے پناہ دیجئے جن کی ہتک کرنے کا میں نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔

''سر دست اپنا پیٹ پالنے کےلئے میں نواسیلینگنسک کے باشندوں کے چرواھے کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہوں۔ آپ کی حاکمانہ طلبی پر، عالی جناب زائیسنگ، میں اپنا کام ناتجربہ‌کار نوجوان ایوان میگونوف کے سپرد کر آیا ہوں جو گاڑی‌بان کا بیٹا ھے۔ اور اب مجھے ان مویشیوں کی بڑی فکر ھے جو میرے سپرد کئے گئے ھیں۔ اگر انھیں کچھ ہوجائے تو دس سواروں کے کزاک افسر اسخائی بگاخانوف کو، جس کے تہمت لگانے پر مجھے آپ نے طلب فرمایا ھے، اس کا پوری طرح اور واحد ذمہ‌دار قرار دیا جائے۔

''تاش‌خان بوبیہ خاتسائیف، ساکن نواسیلینگنسک در غلہ خانہ ملکیت گاڑی بان میگونوف بامقابل دکان دون‌فین، نے بقلم خود اپنے دستخط ثبت کئے۔''

تاش‌خان خاتسائیف کا بیان صفائی ملنے کے بعد زائیسنگ نے کیاختہ کے ایک معلم، مسمی بورلاکوف سے، جو غالباً ان کے قریبی شناسا تھے، مصنف الکساندر پوشکن کے بارے میں استفسار کیا۔ بورلاکوف کا تحریری جواب بھی محفوظ رہ گیا اور دوسری چیزوں کے علاوہ اس میں درج ھے:

''اب میں اس موضوع کی طرف آتا ہوں جس کے بارے میں آپ نے دلچسپی کا اظہار کیا ھے۔ روسی

مکمل اقتصادی دیوالیہ‌پن کی حالت میں تھا۔ زائیسنگ کے نام اپنے صفائی کے بیان میں یہ لکھنے کی پاداش میں کہ دس سواروں کا کزاک افسر اسخائی بگاخانوف نادان اور شکی مزاج کا ہے، تاش خان خاتسائیف کو اس دن، ۱۰ جون ۱۸۶۱ء کو برسر عام کوڑے لگائے گئے۔

بس یہ ہے ساری بات۔ استعمال نہ کی جانےوالی داتسان میں جو کاغذات ملے انھوں نے ھمیں اطلاع دی کہ پہلا شخص جس نے بریات زبان میں پوشکن کی ایک تصنیف کا ترجمہ کیا وہ سارتول کے زائیسنگ کا سابق منشی اور مترجم، اجرت پر کام کرنےوالا گڈریا تاش‌خان بوبیہ خاتسائیف تھا۔ لیکن افسوس کی بات ھے کہ ھمیں اس کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ ھم نہیں جانتے کہ وہ کب اور کہاں پیدا ھوا تھا، یا کس حسن اتفاق سے اس نے روسی زبان اور منگول رسم خط سیکھا۔ کیا اس نے ”قصہ مچھلی اور مچھوے کا“ کے علاوہ بھی کسی چیز کا ترجمہ کیا؟

روس کی آبادی کی جو عام مردم‌شماری ۲۸ جنوری ۱۸۹۷ء کو ھوئی تھی اس کے کاغذات میں نواسیلینگنسک کے یا سیلینگنسک اور جیدنسک وادیوں کے باشندوں کی جو فہرستیں ملتی ھیں ان میں اس کا نام شامل نہیں ھے۔ ھو سکتا ھے مردم شماری سے پہلے ھی وہ مرگیا ھو، ھو سکتا ھے کہیں اور چلا گیا ھو...

خواهش سے نہیں بلکہ انشا کے شوق اور فطری ملکہ کے تحت لکھا گیا تھا۔ میری رائے میں مندرجہ بالا سے مستغیث کو باخبر کرنا اور یہ درخواست کرنا مفید ہوگا کہ وہ تاش‌خان خاتسائیف کو، اس بنا پر کہ موخرالذکر نے ایک مشہور روسی مصنف کے قصے کا ترجمہ کیا ہے، غیرضروری طور پر تنگ کرنا بند کر دے۔ آپ کا نیازمند، معلم بورلاکوف۔،،

ویسے تو ہر چیز صاف معلوم ہوتی ہے۔ تاش‌خان خاتسائیف کا بےقصور ہونا صریحی ہے۔ زائیسنگ کو بس یہ کرنا تھا کہ اس مقدمے کو ختم کردیں جو دس سواروں کے کزاک افسر اسخائی بگاخانوف نے کھڑا کیا تھا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا... ہمارے سامنے مسودے کا ایک اور ورق پڑا ہے جس پر ۱۵ جون ۱۸۶۱ء کی تاریخ ہے اور جو یوں کہنا چاہئے کہ اس افسوسناک اور مدتوں کی بیتی ہوئی کہانی کا آخری منظر ہے۔ اس صفحے پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ خاتسائیف کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی اور ہدایت کی گئی وہ نہ کچھ لکھے، جو کہ ایسا کام نہیں ہے کہ ایک اجرتی گڈریے کو زیب دے، نہ کچھ بغیر کسی معقول سبب اور برسر عہدہ اشخاص کی ہدایت کے ترجمہ کرے۔ اس پر خاتسائیف نے اپنی نازیبا حرکت سے توبہ کی اور گڑگڑا کر التجا کی کہ اسے مالی جرمانے سے بری کر دیا جائے۔ یہ رعایت اس کےلئے منظور کر دی گئی ازین جہت کہ وہ
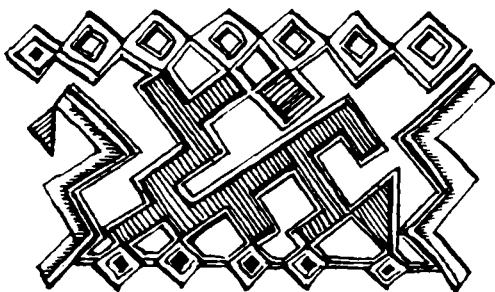
یووان شیستالوف

شمال کا عالم عجائبات

(ناول کے ابواب)

کس چیز نے اس شخص کو بریات زبان میں پوشکن کا ترجمہ کرنے کی ترغیب دی؟ عظیم روسی شاعر کے فن سے اس کی محبت نے، بریات لوگوں کو اس شاعر کی خوبصورت تخلیقات سے واقف کرانے کی خواهش نے؟ هو سکتا هے وہ کسی حریص اور اعلی عہدیدار کا مذاق اڑانا چاهتا هو اور دس سواروں کا کزاک افسر یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ سب اس کے بارے میں هے؟..

میں نہیں جانتا اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف ایک چیزکا یقین هے اور وہ یہ کہ غیرمعروف گڈریے تاش‌خان خاتسائیف کی استعداد اور جسارت کی بدولت عالی دماغ شاعر کے الفاظ بریات زبان میں ایک سو سال سے پہلے سنے گئے تھے۔ اس بات سے مجھے بےحد خوشی اور فخر کا احساس هوتا هے۔

آخر میں میں پھر گھاس کی لچکیلی پتی پر تھرتھراتی هوئی اوس کی صاف بوند کا ذکر کرنا چاهتا هوں۔ اس میں آس پاس کی ساری دنیا کا اور نیلگوں آسمانوں کی اتھاہ گہرائیوں کا عکس دکھائی دیتا هے۔ اسی طرح ایک داتسان کی ردی میں ملنےوالے ایک مسودے کے زردشدہ صفحات میں ایک پشت کے اعمال، خوشیوں اور غموں کا عکس هے جو بہت زمانہ هوئے ابدی نیند کےلئے رخصت هو چکی هے۔

ہے پہیلیاں سوچنے کے لئے ہمارا جی بھی نہ چاہے۔
سیری پہیلی: چووال کا ایک پہلو کھلا کیوں
ہوتا ہے، تقریباً چھت تک؟،،
''یہ بھی کوئی پہیلی ہوئی؟ اس کا جواب تو
صاف ہے۔ چووال ایک طرف سے کھلا اس لئے
ہوتا ہے کہ یورتہ (خیمے) میں روشنی رہے۔ آگ
کے بغیر اس میں رات کا سا اندھیرا رہےگا۔ ،،
''میری پہیلی: ایک گھنے جنگل میں رکھا ہے
ایک پیالہ جس میں سفید سامن اور اسٹرجین مچھلیوں
کے روپہلے سیہرے رکھے ہوئے ہیں۔ ،،
''ارے یہ وہی جو چووال کھاتا ہے۔ وہ
پڑی ہوئی ہے، لکڑی کی چھیلن جو تم نے تیار
کی ہے۔ اب چووال پیٹ بھرکر کھائےگا۔،،
''میری پہیلی: پیٹ بھرا ہو یا بھوکا، جاتا ہے
وہ اپنے گھر۔ ،،
''پتہ ہے، چاقو ہے جو اپنے خول میں چلا
جاتا ہے۔ تم کیا چیز تراش رہے ہو؟،،
''ھڈی کا ایک نوکیلا تیر جو سیاہ کمان پر
کھنچا ہوا ہے۔ بوجھو یہ کیا ہے۔ ،،
''ھڈی کا تیر... یہ تو ایک چڑیا کی چونچ
ہوئی، لیکن کون سی چڑیا یہ میں نہیں جانتا۔ ،،
''تو پھر یہ بوجھو: ایک ہی رات میں ایک
جنا کالا ''کوفس،،* اوڑھے سات جنگلی ندیوں کے

---

* کوفس — فر کی قمیص جس سے ٹوپی جڑی
ہوتی ہے۔ فر اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ ایڈیٹر

گانے والی لکڑی

''میری پہیلی : لال لوسڑی لپک لپک کر پیڑ اوپر چڑھی ۔''

''صاف ظاہر ہے آگ ۔ بھلا کون سانسی اسے نہیں جانتا؟ وہ دیکھو چووال (چولھے کی طرح کی بڑی بھٹی) کی دیوار پر لپک رہی ہے ۔''

''سچ سچ آگ کی لپٹیں لوسڑیوں کی طرح ہوتی ہیں ۔ لپکتی ہوئی لوسڑیاں ۔ سنہری مائل لال ۔''

''چووال کے پاس بڑا اچھا لگتا ہے ۔ آگ اپنے کو چھپاکر نہیں رکھتی ۔''

''ہمارے ٹیچر کے ہاں پتھر کا تنور ہے ۔''

''نہیں، پتھر کا نہیں بلکہ اینٹوں کا ۔ اینٹیں انسان خود بناتا ہے لیکن پتھر تو دریا کے کنارے پڑے ملتے ہیں ۔ پتھر قدرتی ہوتے ہیں پیڑوں کی طرح ۔''

''میری پہیلی : کیا چیز زیادہ اچھی ہوتی ہے چووال یا اینٹوں کا تنور ؟''

''اس کا دارومدار پسند اور عادت پر ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ روسیوں کے لئے سفید اینٹوں کا تنور زیادہ اچھا ہے، وہ چووال کی طرح دھواں نہیں دیتا ۔ اور ہم سانسی لوگ شاید اپنے چووال کے بغیر خوش نہیں رہیں گے ۔''

''کیوں؟''

''آگ اپنے ناچ کو چھپا لے گی ۔ ہماری آنکھیں خوشی سے محروم رہ جائیں گی ۔ اور تب ہو سکتا

ج یہ سب کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔
سبزی مائل برف سے لدے ہوئے فر کے ایک پیڑ
کی نچلی شاخوں کے نیچے سے ابھرے ہوئے ٹھنٹھ
کو دیکھ کر اسے اپنے چووال کے پاس بیٹھ کر
گزاری ہوئی شامیں اور وہ دوست یاد آ گیا جو
عجیب و غریب پہیلیاں بجھایا کرتا تھا۔ یا یوں
ہے کہ پہیلیاں اور ان کو جنم دینےوالا ماحول
ب عجیب و غریب معلوم ہونے لگا تھا؟ شاید دیہاتی
لائبریری کی کتابوں نے، جن میں سے ایک ایک
س نے پڑھی تھی، سائنسی قصوں اور کہانیوں کی
دنیا کے بارے میں اس کے زاویۂ نظر کو بدل دیا
تھا جبکہ ایک زمانے میں وہ اس دنیا کو بالکل عادی
اور معمولی چیز کی طرح قبول کرتا تھا۔

اب لگتا ہے کہ زندگی میں پہیلیاں رہ ھی نہیں
گئیں۔ ھر چیز صاف سادہ ہے اور ان کی کگریں
گھس گھسا کر چکنی اور ہموار کر دی گئی ھیں۔

اور تب سے آج تک اس نے، پیوتر شیشکن نے
بہت سی مورتیاں تراشی تھیں۔ معمولی قلم‌تراش سے
بھی اور شکاری چاقو سے بھی۔ ایسپ کی لکڑی
کی اور فر کی لکڑی کی۔ اولورین اور بھیڑیے
جنگل میں اب بھی لڑتے تھے، سیاہ گوش غراتے
تھے، بھالو تائیگا کے بادشاہ کی طرح اب بھی اپنا رعب
جماتے تھے، رینڈیر اپنے سینگوں‌دار سر اٹھا کر ادھر ادھر
نظر دوڑاتے تھے، بڑی بڑی آنکھوں‌والے الو اندھوں
کی طرح تاکتے تھے، عقاب اڑنے کےلئے تیار ہوتے تھے۔

کنارے چھان مارتا ھے اور کنکریاں جمع کرتا ھے۔''

''ھاں ھاں، بن‌مرغی! وہ اپنے پوٹے میں کنکریاں بھرے رھتی ھے۔ پوٹے کو پھلاؤ تو غبارے کی طرح پھول جاتا ھے اور اندر اس کے کنکریاں بجتی ھیں۔''

''وھی میں تراش رھا ھوں — ایک بن‌مرغی۔''

''اور پتہ ھے تمھیں میں کیا تراش رھا ھوں؟''

''نہیں، ابھی تو اس کی کچھ شکل نکلی ھی نہیں۔''

''تو پھر یہ پہیلی بوجھو: ایک موٹا سا روپہلا لٹھا گھنے جنگل میں پڑا۔''

''یہ تو کوئی بھی مانسی بوجھ سکتا ھے — بھالو۔''

''میں جو بھالو تراشنا چاھتا ھوں وہ دوسری طرح کا ھے۔ موٹے سے ڈنڈے کی طرح نہیں بلکہ پیڑ کا بڑا سا ٹھنٹھ، سیاہ اور ڈراؤنا۔ وہ ایک جھاڑی میں چھپا پڑا ھے، اچھل کر دبوچ لینے کے لئے تیار۔ اسے دیکھکے آدمی ایسے کانپنے لگے جیسے پالے میں ننگا آدمی۔ بہت ھی ڈراؤنا! میں خود بھی کانپنے لگا تھا اور میں بھاگ کھڑا ھوا یہ سمجھ کر کہ یہ ٹھنٹھ نہیں بھالو ھے۔''

اس کی اسکیئوں کے نیچے برف کھچرکھچر بول رھی تھی اور دھنک کے سے غبار کی صورت میں خوب لدی ھوئی شاخوں پر سے گرنے لگتی تھی اور ھر طرف سائے اور دھوپ کے بنائے ھوئے نمونوں کی صورت میں پڑی تھی۔ لیکن پیوتر شیشکن کو

پانی میں دمکتی ہوئی مچھلیوں کو بڑی پھرتی سے پکڑ لیتے ہیں۔ اور بھالو بھی تو تائیگا سے نہیں گیا۔ جائےگا کہاں؟ اگرچہ مانسی اب اسے تائیگا کا بادشاہ نہیں سمجھتا لیکن بھالو کے تہوار اب بھی منائے جاتے ہیں۔ ہر جگہ تو نہیں، لیکن دورافتادہ گاؤں میں تو منائے ہی جاتے ہیں۔

لوسبوووژ گاؤں میں، جہاں پیوتر شیشکن رہتا ہے، اب بھی پراسرار رسزیہ تماشے کئے جاتے ہیں جن میں افسانہ اور حقیقت یکجان ہو جاتے ہیں۔ یہ اب پرانا بھالو کا تہوار نہیں رہا بلکہ عوامی تھیٹر بن چکا ہے۔ اپنی طرح کا انوکھا تھیٹر۔ جلی حروف سے لکھنے کے لائق عوامی فن۔ اسی طرح کے فن کے بارے میں ایک بار لیو تالستائی نے لکھا تھا، ''تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے ووگول نامی ایک ابتدائی قدیمی قومیت کے تھیٹر کے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔ اس پیش کش کو ایک عینی شاهد نے بیان کیا ہے۔ دو ووگول، ایک لمبے قد کا، ایک چھوٹا، دونوں رینڈیر کی کھالیں پہنے ہوئے، ماں رینڈیر اور اس کے بچے کی اداکاری کرتے ہیں۔ ایک تیسرا ووگول شکاری بنتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں تیر کمان ہوتا ہے اور وہ اسکیٹس پر چلتا ہے۔ ایک چوتھا ووگول رینڈیر کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے کسی چڑیا کی طرح زور زور سے چلاتا ہے۔ ڈراسائی صورتحال اس بات سے پیدا ہوتی ہے

منجمد برف میں چھید کرکے نیچے کے پانی میں مچھلیاں پکڑنےوالے ساھی گیر، سابل کی ملائم روئیں دار کھالیں لانےوالے شکاری، رینڈیر چرانےوالے گلہ بان۔ لکڑی میں ان سب میں جان پڑ گئی تھی۔ لیکن جس خیالی دنیا سے ان کا تعلق تھا وہ لگتا تھا کہ ناپید ہو چکی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مانسی کی زندگی بدل رہی ہے اور پرانی زندگی کی طرح کی نہیں رہی۔ یہ تو بالکل سچ ہے کہ یہ دنیا بدل رہی ہے۔ لیکن تائیگا تو اب بھی برقرار ہے۔ بن مرغیاں اب بھی پو پھٹتے ھی اپنے جوڑے کو آواز دیتی ھیں، گلھریاں اب بھی پیڑوں پر پھدکتی پھرتی ھیں، بھالو اب بھی اپنی ماندوں میں خراٹے لیتے ھیں اور تائیگا کی ندیاں اب بھی دریائے اوب میں جاکر گرتی ھیں۔ اور طاقتور دریائے اوب ھمواری سے رواں رھتا ہے، سکون کے ساتھ اپنے پانی کو شمال کی طرف، بحر قطب شمالی کی طرف بہائے لئے جاتا ہے۔ اور مچھلیاں اب بھی دریا میں اسی طرح تیرتی ھیں جیسے صدیوں پہلے تیرتی تھیں۔ اور بیور اب بھی صدیوں پرانے سیداروں کو گرا کر اپنے گھر اور بند بناتے ھیں، اب بھی اپنے بنائے ھوئے ''سمندر'' میں نہاتے ھیں۔ بیور — ان کا سمور کس قدر سنہرا اور لمبے بالوں والا ھوتا ہے۔ اب وہ تائیگا کی ندیوں میں پھر نظر آنے لگے ھیں۔ پہلے ھی کی طرح اب بھی وہ شفاف

ہمیشہ ''وہ،، سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ وہ ''مار ڈالا گیا،،، بس ''ڈھیر ہو گیا،،۔ نہیں تو وہ برا مان جائے گا۔ اور اپنے رشتے دار کو ناراض کیوں کیا جائے؟ مانسی اور ھانتی لوگ یہ یقین کرتے تھے کہ انسان دراصل بھالوؤں کی سنتان ہے، بس یہ کہ بھالو جنگل میں رہتا ہے۔ اسی لئے اسے ''وورتولپوت،، کہا جاتا تھا یعنی ''جنگل میں رہنے والا،،۔

اب یہ تو کوئی نہیں یقین کرتا کہ انسان بھالوؤں کی سنتان ہے، لیکن نام نہ لینے کا پرانا دستور ابھی تک چلا آتا ہے۔ کون جانے یہ اچھا ہے کہ برا؟ بھالو کا سامنا ہونا بڑوں اور بچوں سبھی کے لئے جوش اور ہیجان کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ آخر بڈھے لوگوں کو بھی ایک دوسرے پر برف کی گیند پھینکنا اور پانی کے چھینٹے اچھالنا اچھا لگتا ہے۔ اور کتے بھونکتے ہیں اور خوشی سے ادھر شکاریوں کی طرح دوڑتے ہیں۔

جب کسی بھالو کی کھال اتاری جاتی ہے تو سب سے ماھر کاریگر اس کے سر کو بھس بھر کر تیار کرتا ہے۔ سر کو ایک ''مقدس،، میز پر رکھا جاتا ہے۔ پانچ تاروں والا ساز ''سنکولتاپ،، بجتا ہے اور بہت سے تاروں والے ساز ''توریگ،، کی جادو بھری آواز گونجتی ہے اور پاؤں ناچنے لگتے ہیں۔ اور آپ کچھ نہیں بتا

کہ شکاری رینڈیروں کا پیچھا کرتا ہے جو کبھی
بھاگ کر اسٹیج کے پیچھے چلے جاتے ہیں کبھی
پھر بھاگتے ہوئے اسٹیج پر آجاتے ہیں۔ یہ ڈراما
ایک یورتہ (خیمے) میں ہوتا ہے۔ شکاری رینڈیروں
کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ بچہ رینڈیر تھک کر
ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ ماں بھی دم لینے کو رک
جاتی ہے۔ شکاری ان کے پاس آکر نشانہ باندھتا
ہے۔ چڑیا خبردار کرنے کے لئے چلاتی ہے۔
رینڈیر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ شکاری پھر
پیچھا کرتا ہے اور پاس پہنچ کر اس بار تیر
چلا دیتا ہے جو بچے کو لگتا ہے۔ بچہ اب
بھاگ نہیں سکتا اور اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے۔
ماں اس کے زخم کو چاٹتی ہے۔ شکاری کمان پر
دوسرا تیر چڑھاتا ہے۔ عینی شاھد لکھتا ہے کہ
ناظرین پر سکتہ طاری ہوجاتا ہے، سرد آہیں
اور رونے کی آوازیں تک سنائی دیتی ہیں۔ اس
بیان کو پڑھنے ہی سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ
فن کا سچا نمونہ تھا۔''

اور آج شکاریوں کا تہوار اس طرح منایا جاتا ہے۔
ٹھائیں! ٹھائیں! ٹھائیں! گولیوں کی آواز
گونجتی ہے۔

''کتنی گولیاں ماریں؟''

''سات۔''

''تب تو وہ ڈھیر ہوگیا۔''

بھالو کا کبھی نام نہیں لیا جاتا، اس کا ذکر

7*

کہنے والا آدمی نہیں بلکہ سوانگ ہے ۔ اس کا کوئی چہرہ نہیں ہے ۔

صرف بھالو ہی کا نہیں، سبھی کا مذاق اڑایا جاتا ہے ۔ بول رنگین ہونے چاہئیں اور پھبتی تیکھی ۔

لوگوں سے بھرے ہوئے گھر میں کہیں سے ایک چڑیا آ جاتی ہے ۔

کوئی اسے پہچان کر چلاتا ہے، ''سمندری بگلا!''

''چڑیا'' میز پر سے چمکتا ہوا چاندی کا ایک پیالہ جھپٹ لیتی ہے، اسے اپنے سینے میں چھپا لیتی ہے اور ناچنا شروع کر دیتی ہے ۔

اس کے بعد ایک کردار گھوڑے پر سوار آتا ہے ۔ وہ لوسڑی اور سابل کے سمور میں ملبوس ہے، اس کا گھوڑا کاٹھ کا ہے لیکن اس میں جو گھنٹیاں لگی ہیں وہ اصلی ہیں اور بجتی ہیں ۔

فرش پر بیٹھے ہوئے ناظرین تبصرہ کرتے ہیں ''یہ میرسوس نیہوم ہے جو سمندری بگلے کا پیچھا کرتا ہے جس نے لوگوں کی خوشی چرا لینے کی جرأت کی تھی ۔''

کردار پوچھتا ہے، ''سمندری بگلا یہاں کب آیا تھا؟''

ناظرین جواب دیتے ہیں، ''سات دن ہوئے سمندری بگلا ادھر سے گزرا تھا ۔''

میرسوس نیہوم اچھلتا کودتا اور گاتا ہے :

جس قیمتی پیالے سے

سکتے کہ کون ناچ رہا ہے، کوئی بڈھا ہے یا
جوان ہے، اس لئے کہ سبھی بھوج کی چھال کے
سوانگ پہنے ہوتے ہیں۔

ایک سوانگ چلاتا ہے، ''او۔ کو۔ لو۔ لو!
او۔ کو۔ لو۔ لو! تم کیا کر رہے ہو؟''

دوسرا موسیقی کی لے میں کہتا ہے ''ہم
بھالو ناچ رہے ہیں۔''

پہلا والا پوچھتا ہے، ''یہ کون جانور ہے؟''
(جب سوانگ پہنے ہوں تب لوگ بھالو کا
نام لے سکتے ہیں۔)

''اگر تمھیں نہیں معلوم تو میز پر دیکھو۔''

''تمھارا جانور برا ہے۔ یہ تو کالا ہے۔''

''ہمارے جانور اچھے ہیں۔ میں تمھارے جانور
کے بارے میں ایک گیت بناؤں گا جو میز پر چڑھ
گیا ہے۔ میں تمھارے میز پروالے جانور کو بول
سے 'چھید' دوں گا۔''

''اگر گیت بنا سکتے ہو تو چلو گاؤ!''

اور ''بھوج کی چھال کی ناک'' — سوانگ کو یہی
کہا جاتا ہے — بھالو کی برائی میں گیت گاتی ہے۔

اس کے ہاتھ
ہیں کرچھے جیسے، جس سے عورتیں ٹھنڈی آگ
میں راکھ کریدتی ہیں۔
اس کی آنکھیں
بھوج کی چھال کی ڈوئی جن میں بھرا ہے کالا پانی۔
میز پروالا بھالو برا نہیں مانتا اس لئے کہ

جاتا ہے۔ اسی لئے لوگوں کی آنکھوں میں چمک ہوتی ہے اور ان کے ہونٹوں پر سب کچھ سمجھنے والی مسکراہٹ، کبھی ایک شخص ٹھنڈی سانس بھرتا ہے اور کبھی دوسرا۔

یوں منایا جاتا ہے مانسی اور ھانتی لوگوں کا قدیم تہوار۔

پیوتر شیشکن کی اسکیئوں کے نیچے برف کھچر کھچر کرتی ہے۔ تائیگا بلور کی طرح دمکتا ہے اور لگتا ہے کہ اس کی طرف لپکا چلا آ رہا ہے۔ اس کے خیالات کا سلسلہ تیزی سے رواں ہے، جیسے پرانی مانسی پہیلیوں میں ہوتا ہے۔ اور پیوتر شیشکن گھر پہنچ جائے گا اور شام کے کھانے میں اسے پھر ایک بن مرغی ملے گی۔ پیوتر شیشکن اپنی روزی شکار اور ماہی گیری سے کماتا ہے۔ چوب‌تراشی تو بس ایک مشغلہ ہے جسے وہ اپنے شوق کے لئے کرتا ہے۔ اسے شوقیہ فنکار کہا جاتا ہے۔ یہ اچھا ہے لیکن کافی اچھا نہیں ہے۔

اسکیئاں ہوا سے باتیں کر رہی ہیں اور اس کے خیالات بھی محو پرواز ہیں۔ اور پرانی پہیلیوں کی دنیا پھر سے جی اٹھتی ہے۔ پیوتر شیشکن کو لگتا ہے کہ وہ بالکل اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کو اس طرح تراشنا چاہئے کہ لکڑی اپنا گیت گا سکے۔ جاندار چیزیں ایسی جادوئی جیسی کانسے کی پرانی ڈھلائیوں میں

میرے لوگوں کا پیٹ بھرتا تھا
اسے سمندری بگلے نے چرا لیا۔
تیز تیز، چل مرے گھوڑے چل
چل مرے اچھے گھوڑے چل!

وہ پھر پوچھتا ہے، ''سمندری بگلا یہاں کب آیا تھا؟،، اور اس بار اسے جواب ملتا ہے:
''وہ کل یہاں آیا تھا۔،،
اور میرسوس نیہوم پھر ناچتا اور گاتا ہے:

میرے لوگوں کے پیٹ ایسے ہوگئے ہیں
جیسے تائیگا کی کوئی ندی جو سوکھ
گئی ہو۔
جی تو کھانے کےلئے تڑپتا ہے
لوگوں کے کھانےوالے قیمتی پیالے کو
چرا لیا ہے سمندری بگلے نے۔

وہ کچھ گھوڑا دوڑاتا ہے اور اسے سفید چڑیا نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس کے برابر پہنچ کر اسے مارتا ہے اور چڑیا گر جاتی ہے۔ میرسوس نیہوم چمکتے ہوئے پیالے کو چھین لاتا ہے۔
لوگوں کی طرف پیالے کو پھینک کر وہ ان سے کہتا ہے، ''یہ رہا تمھارا پیالہ،، اور ایک پرجوش ناچ ناچتا ہوا ''اسٹیج،، سے باھر چلا جاتا ہے۔ یہ تماشہ بالکل ہی خیالی نہیں ہوتا۔ تہوار میں خود زندگی کو ناٹک کے روپ میں پیش کیا

جرگے کے کاریگر ان پرقوت مورتیوں کو ان کے مٹی کے سانچوں سے نکالتے تھے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس مقدس جگہ پر لے جاتے تھے جہاں مذہبی نشانیاں رکھی جاتی تھیں۔ اب کاریگروں کو اطمینان رہتا تھا کہ ان کا جرگہ ختم نہیں ہوگا۔ ان دریافتوں کی بنا پر عالموں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''اوب کے علاقے میں ماہرین آثار قدیمہ کو سیدیائی فن کی کوئی دورافتادہ شاخ یا ان فنی چیزوں کی نقلیں نہیں مل گئی ہیں جو اتفاق سے ان علاقوں تک پہنچ گئی تھیں بلکہ ان ماہرین کو فن کی ایک انتہائی ترقی یافتہ صنف مل گئی ہے۔''

ہانتی اور مانسی لوگوں کی ان پہیلیوں، زیورات، چٹانی کتبوں اور تصویری تحریر میں دنیا کا ایک انوکھا زاویۂ نظر بھی رچابسا ہوا ہے۔

کیا جدید فنکار اپنے ژرف نگاہ اجداد کی طباعی کو بھول چکے ہیں؟

شاید پیوتر شیشکن کسی دن ایسی ہی ایک مورتی تراشے۔ اور پھر ایک مقامی نمائشی مقابلے کے بعد پہلے وہ ہانتی مانسیئسک جائے گی، پھر تیومین اور پھر دوردراز ماسکو۔ ایسے واقعات ہوئے ہیں، ہے نہ؟

لکڑی میں جان پڑ جائے گی اور وہ اپنا قدیم مانسی گیت گائے گی جیسے پہلے ہانسی فنکار گینادی رائیشیف کے خطی چربے اور تصویریں گاتی تھیں

هوتی تهیں جن میں عجیب و غریب غراتے ہوئے اکڑوں بیٹھے ہوئے جانور دکھائے جاتے تھے اور ان کی دمیں تنی ہوئی ہوتی تھیں۔
کتا کہ سیاہ گوش، بھیڑیا کہ بیور؟ پہلی نظر میں بتانا مشکل ہوتا ہے۔
کانسے کی یہ چیستانی ڈھلائیاں سب سے پہلے پچھلی صدی کے اواخر میں ہانتی و مانسی علاقے میں ملی تھیں۔
۱۹۶۸ء کی گرمیوں میں ماسکو یونیورسٹی کی آثار قدیمہ کی ایک مہم نے وورگلسیان واد بستی کے پاس ایک کھدائی میں ایک خزانہ نکالا — کانسے کی ۹۲ ڈھلائیاں۔ مہم کے سربراہ ودیم استارکوف کا خیال ہے کہ یہ مورتیاں، جو زمین میں دو لاکھ سال سے زیادہ تک دفن رہی ہیں، سامان آرائش کی طرح نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ یہ رسوم عبادت کی فنی چیزیں ہیں۔
یہ بڑی پابند وضع مورتیاں ہیں جو مرنے والوں کے پرکھوں کی، ان کی مذہبی نشانی کی نمائندگی کرتی ہیں۔
ہانتی اور مانسی اساطیر کے مطابق ہر جرگے کی مذہبی نشانی کے طور پر کوئی نہ کوئی جانور تھا۔ یہ مذہبی نشانی ”نام کو چلانے والی“ ہوتی تھی اور اس میں ”روح“ یا ”نفس“ زندہ رہتی تھی اور اسے حیات دوام حاصل ہو جاتی تھی۔

۳۰۰ کلومیٹر — صبح کے شکار کے دوران میں۔
۴۰۰ کلومیٹر کی دوری کو اچھی خاصی مسافت سمجھا جاتا ہے۔

رینڈیر پالنےوالے کبھی کبھی اپنے گلوں کو قریب‌ترین گاؤں سے پانچ سو کلومیٹر دور چراتے ھیں۔ اسی لئے نمائشی مقابلے میں وقت پر پہنچنے کےلئے انھیں جلدی کرنی پڑتی ہے۔ اسی لئے رینڈیر لگتا ہے کہ برف کے بگولے میں اڑتے چلے جا رہے ھیں۔

رینڈیروں کے بغیر نمائشی مقابلہ تہوار کی طرح ھو ھی نہیں سکتا۔ رینڈیروں کی دوڑ نہ ھو تو پھر نمائشی مقابلہ کیا ھوا؟

رینڈیروں کی برف گاڑیوں کو جوڑ کر ان کے اوپر سے چھلانگ جانا، تنزان سے — جو ھڈی کے سروالا سانپ ھوتا ہے — رینڈیروں پر کمند پھینکنا اور پکڑنا اس سے تہوار ھوتا ہے۔

تیرزنی کے اور اسکیئنگ کے مقابلے کے بغیر بھلا کوئی نمائشی مقابلہ کیسے ھو سکتا ہے؟

ماھی گیر اور لکڑھارے، رینڈیر پالنےوالے اور گوالنیں، سبھی نمائشی مقابلے میں آتے ھیں۔

پہلے سوسوا ندی میں اسٹرلٹ نہیں ھوتی تھی لیکن اب یہ مزیدار نرم گوشت‌والی مچھلی وھاں ھونے لگی ہے۔

کہاں سے آئی؟

دریائے اوب سے۔

جنھیں علاقائی نمائشوں میں باربار بہت سراھا گیا ھے۔ انھوں نے جن کتابوں کے لئے تصویریں بنائی ھیں ان کی رنگا رنگ اور اچھوتی ڈرائنگیں آنکھوں میں کھب جاتی ھیں۔

گینادی رائیشیف خیالی شمالی آرائش کے استاد کاریگر ھیں۔ لیکن ان کا فن اگر صرف اسی عجیب و غریب صنف فن تک محدود رہ گیا تو یہ افسوس کی بات ھوگی۔ رائیشیف جدید زمانے کے انسان ھیں۔ وہ شیکسپیئر، تالستائی اور پکاسو سے واقف ھیں۔ ھمارے زمانے میں زندگی پیچیدہ اور اس کی رفتار تیز ھے۔ کیا اسے قدیم پہیلیوں اور آرائشوں میں بٹھایا جا سکتا ھے؟ نہیں! رائیشیف کے لئے ان کے اجداد کا ''زاویۂ نظر،، صرف نقطۂ آغاز ھے جہاں سے وہ جدید دنیا کی پہلدار زندگی کی عکاسی کے لئے خود اپنا راستہ تلاش کرتے ھیں۔

نمائشی مقابلہ ــ یہ ھانتی اور مانسی لوگوں کا نیا تہوار ھے۔

جب رینڈیر پالنےوالے اس تہوار کے لئے آتے ھیں تو ان کے رینڈیروں کے پر لگ جاتے ھیں۔ مانسی اور ھانتی لوگوں کےلئے تہوار سچ‌مچ مقدس دن ھوتا ھے۔ وہ دیر سے پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور انھیں بڑی دور سے آنا پڑتا ھے۔ ایک سو کلومیٹر ــ اتنا فاصلہ وہ عام طور سے کسی پڑوسی سے ملنے کے لئے سفر کرتے ھیں، دو سو کلومیٹر ــ جنگل سے لکڑی لانے کےلئے،

شمن نہیں بیٹھتے، محنت کش عورتیں بیٹھتی ہیں۔
عورتیں تو مردوں کے برابر بیٹھی ہیں۔ نہیں، یہ
بھالو کا تہوار نہیں ہے!

سنکولتاپ کے تار ایک نئی قسم کے تہوار کے
شروع ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ تہوار دراصل پہلے
شروع ہو چکا، جب سنہرا سورج نکلا تھا تبھی۔
وہ سوسوا ندی کے کنارے شروع ہوا تھا۔ وہاں
مضبوط اور پھرتیلے لوگوں کا مقابلہ ہوا تھا کہ
کون رینڈیروں کی زیادہ برف گاڑیاں پھلانگ سکتا
ہے، کون کلھاڑی یا ہوری (جتے ہوئے رینڈیروں
کو ہنکانے کا لمبا ڈنڈا) زیادہ دور تک پھینک
سکتا ہے، کون سموردار کھال پر بیٹھ کر پہاڑی
کی ڈھلان پر زیادہ تیزی سے پھسل سکتا ہے
اور کون معمولی رینڈیروں کی برف گاڑی پر بیٹھ کر،
پتلی نالی کی رائفل اور پرانے تیر کمان دونوں سے
کون زیادہ اچھا نشانہ لگاتا ہے۔ اور شمال کے
نئے تہوار نمائشی مقابلے میں حصہ لینے والے سوسوا
ندی کے کنارے بہت سے دوسرے ہنروں میں
مقابلے کرتے ہیں۔

جب ستارے آسمان پر جگنوؤں کی طرح رینگنے
لگتے ہیں تب بھی مقابلے جاری رہتے ہیں لیکن
اس وقت موسیقی، ناچ اور بول میں۔

لوسبوووژ کی لڑکیاں لینن کے بارے میں ایک
نغمہ بار گیت گائیں گی۔ نیا کسم وول کا ایک شکاری

استرلٹ کو صاف پانی پسند ہے اور سوسوا اور خاص طور سے اس کی معاون ندی لیاپین صاف ہیں۔

اگر سوسوا میں استرلٹ ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ندی صاف ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے۔ ایک ماھی گیر سوسوا کے گاؤں میں نمائشی مقابلے میں آتا ہے اور یہ بھی اچھی بات ہے۔ سب لوگ خوشیاں منائیں گے! جی بھر کے خوشیاں!

سنکولتاپ کے تار بج اٹھتے ہیں اور تہوار کے شروع ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

سنکولتاپ پانچ تاروں کا ساز ہوتا ہے اور چھوٹی سی ناؤ کی شکل کا ہوتا ہے۔ هانتی لوگ اسے ''ناریس یوخ،، کہتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں ''گانےوالی لکڑی،،۔ یہ ساز ناؤ کی طرح دکھائی تو دیتا ہے لیکن پانی پر تیرتا نہیں۔ اس کی آواز لوگوں کے دلوں میں تیرتی ہے۔

گونجتا ہوا، مترنم، پانچ تاروں والا سنکولتاپ بج اٹھتا ہے۔ کیا پھر بھالو کا تہوار ہے؟

مکان بڑا ہے اور بھالو کا تہوار ایسے مکانوں میں نہیں منایا جاتا۔ اور اس گھر میں بتیاں نہیں جلتیں اور نہ اس میں چاند کا روپہلا گولا چمکتا ہے بلکہ هنس‌مکھ بجلی کی روشنی ہے۔

اور لوگ فرش پر نہیں بنچوں پر بیٹھتے ہیں۔ پہلی صف میں عورتیں بیٹھی ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ ہماری بہترین گوالنیں ہیں۔ اب پہلی صف میں

پر جم جاتے ہیں، مدتوں کے انتظار کے بعد نکلنے والا بہار کا سورج خاص طور سے روشن اور شفیق لگتا ہے۔ اور لوگ، نوبیدار ندیاں، کونپلوں بھرے پیڑ، چہچہاتی ہوئی چڑیاں سبھی اس کی تعریفیں کرتی ہیں۔

شاید آج کا گیت، جسے خود زندگی نے لکھا ہے، کسی بھی اساطیر سے زیادہ حیرت انگیز ہے اور اعداد و شمار اور حقائق کسی بھی نظم سے زیادہ اثرانگیز ہے؟ شاید آج نئی چیزوں میں سے بہت کچھ ہمیں عام لگتا ہے جیسے بہت دنوں سے ہماری زندگی کا حصہ ہو۔

کین، کینن
کینن، کینن،
کینن گینا،
کینن گینا

یہ ''توریگ،، کی موسیقی ہے۔ گانے والی لکڑی جو بربط کی شکل کی ہوتی ہے۔ ایک تار چھیڑو اور ہوا جاگ اٹھتی ہے اور گھاس سرسراتی ہے۔ دوسرا تار چھیڑو تو جھیل کی روپہلی لہریں یاد آتی ہیں۔ تیسرا تار چھیڑو تو آسمان سارس کی آواز سے گونج اٹھتا ہے، کسی ہنس کے گیت سے بھر جاتا ہے۔ اب چند ہی لوگ رہ گئے ہیں جو ''توریگ،، بجا سکتے ہیں۔ تبھی تو اس کے مقدس تاروں کو حاضرین میں سب سے معمر آدمی ہی چھونے کی ہمت کر سکتا ہے۔ اور جادوئی

سابل ناچ ناچےگا۔ دریائےاوب کی مچھیرنیں جیالا
هانتی کورینکا ناچیں‌گی۔ کیمکیاسوئی کی ایک گوالن
ایک مانسی شاعر کی نظمیں پڑھےگی اور هانتی
شاعر میکول شولگن خود اپنی نظمیں سنائیں‌گے ۔ اس
سے شوقیه فن کے قوم‌گیر جائزے میں ان کی
فتح کا راسته شروع هو سکتا هے۔

هو سکتا هے اس نمائشی مقابلے میں انهیں ان
رینڈیر پالنےوالوں کے بارے میں کوئی نظم لکھنے
کا وجدان ملے جو پالے یا برفانی طوفانوں سے نهیں ڈرتے،
جو سرد خیمے میں زندگی کو مسکراتے هوئے دیکھتے هیں۔

شمال کے خانه‌بدوش لوگوں نے اس تند علاقے
کو فتح کرلیا، وه سردی اور بھوک اور بیماری
سے لڑے اور انهیں ان کی ازلی جهاں گشتی میں
خوشی مل گئی۔ آج شمال کے لوگوں کی طرز
زندگی نئی هے، ان کی خوشیاں نئی، روشنیاں اور
گیت نئے هیں۔

نوجوان شمالی علاقے کے شاعروں رسان روگن،
پروکوپی سالتیکوف، ولادیمیر وولدن، میکول شولگن،
آندریئی ترخانوف کی نظمیں پڑھئے تو بهت کچھ
آپ کی سمجھ میں آنے لگےگا۔

هو سکتا هے بعض لوگوں کو خیال هو که
شمال کے نوجوان شاعروں کی اولیں تصنیفات میں
بهت زیاده دھوپ، بهت سی دھنکیں اور بهت زیاده
امنگیں هیں۔ اس زیادتی کی کچھ وجه هے۔ طویل
قطبی رات کے بعد جب انسان کے آنسو بھی گالوں

سطریں پگڈنڈیاں ہوتی ہیں جن پر تم ابھی تک
چپے نہیں ہو، الفاظ درخت ہوتے ہیں جن سے
تم ابھی تک ملے نہیں ہو۔

درخت بہ جائے خود ایک عجوبہ ہیں۔ تائیگا
میں وہ جادوگروں کی طرح کھڑے ہیں۔ وہ ہوا
میں اپنی پتیاں سرسراتے ہیں گویا سرگوشیاں کر
رہے ہوں، ایک دوسرے کو قصے سنا رہے ہوں،
پنی اپنی آپ بیتیاں کہہ رہے ہوں۔

سب سے پرانی تاریخ سیدار کی ہوتی ہے۔
وہ ۵۰۰ سال زندہ رہتا ہے۔ اس کی شاخوں پر
نیس‌دار ہرم اگتے ہیں جن میں میٹھے رسیلے جوز
ہوتے ہیں۔ ان جوزوں کو گلہریاں کھاتی ہیں۔
وہ سیداروں پر اپنے گھونسلے بناتی ہیں اور ان
کی ہری سوئیوں سے بھری ہوئی شاخوں پر پھدکتی
پھرتی ہیں۔ سیدار کی جڑوں میں سابل اپنی بھٹ
بناتے ہیں۔ سابل کو گلہری کا گوشت بہت اچھا
لگتا ہے۔ اور سیدار اس بات کو جانتا ہے۔
سیدار بہت کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ لیکن کتاب
اس سے زیادہ جانتی ہے۔ وہ تو تمھیں ایسی
جگہوں پر لے جاتی ہے جہاں تم پہلے کبھی نہیں گئے۔

کیا میری کتاب اس طرح کی راہ‌نما ہو سکتی ہے؟

اس کتاب میں میں چاہتا تھا کہ اپنے قاری
کو اپنے ہانتی مانسی وطن کے بارے میں بتاؤں
جہاں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔

میرے کان دو شکاری ہیں۔ میرے قاری، میرے

آوازیں پھوٹ نکلتی ھیں، اسرار کی دنیا پھر بیدار ہو جاتی ھے۔

وہ چڑیا نہیں تھی جو اڑی تھی، نہ کوئی آدمی تھا جو پروں‌والی آوازوں کی لے پر رقص کر رہا تھا بلکہ کٹھ پتلی تھی۔ لکڑی میں جان پڑ گئی تھی۔ وہ ایک پرجوش رقص میں ناچتی پھر رہی تھی۔ متجسس لوگ سوال کریں‌گے، برفانی شمال کے لوگوں کا، تائیگا کے سانسی اور دریائے اوب کے علاقے کے ھانتی قومیت‌والوں کا مزاج جنوب والوں کی طرح کیسے ھو گیا۔

لکڑی گاتی ھے، لکڑی ناچتی ھے۔ اور لوگ دیکھتے ھیں اور موسیقی سے، جیالے ناچ سے لطف‌اندوز ھوتے ھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بھالو کے تہوار میں۔

سوویت اسٹیج پر ایک صدیوں پرانا فن جمیل پھر سے زندہ ھو رہا ھے اور نئے مواد سے آشنا ھو رہا ھے۔

میں آخری تار چھیڑتا ھوں

کون ایک گرم بھٹی کے سامنے بیٹھ کر دور دور کا سفر کرتا ھے، بہت سی عجیب و غریب چیزیں دیکھتا ھے اور بہت سی دانائی کی باتیں سنتا ھے؟

آج ھر مانسی لڑکا جانتا ھے کہ وہ کتابیں پڑھ سکتا ھے۔

کتاب ایک ایسے اچھوتے جنگل کی طرح ھوتی ھے جس میں تم ابھی گئے نہیں ھو۔ چھپی ھوئی

نے جانا ہی نہیں۔ میں نے نئی سوویت زندگی کے
گیت گائے۔ اور زندگی بہت حیران کن معجزہ ہے!
میں نے زمین کے بارے میں بہت کچھ سوچا۔ اور
ہماری زمین ایک حیران کن معجزہ ہے!

سانسی اور هانتی لوگ کتنی کہانیاں جانتے ہیں!
ماہی گیر اپنے جال ڈال دیتے ہیں اور الاؤ
کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ شکاری اپنے کھٹکے دار
پھندوں کو دیکھ آتے ہیں اور آکر الاؤ کے پاس
بیٹھ جاتے ہیں۔ اور سنہری آگ کی آنکھوں کے
سامنے ان کے ہونٹوں سے قصے رواں ہوجاتے ہیں۔
ہر قصہ دوسرے سے زیادہ خیالی ہوتا ہے۔ جب
قصوں سے اکتا جاتے ہیں تو پہیلیاں بجھانے
لگتے ہیں اور اسرار کی دنیا سے نکل کر وہ
روزمرہ کی چیزوں کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

کس چیز کا بنا ہے وہ پائپ جس میں دھواں ناچتا ہے؟
کس چیز کا بنا ہے وہ چاقو جس سے تم جانور
کا گوشت کاٹتے ہو؟

ہر لڑکا جانتا ہے: اس دیونما جانور، فیل پیکر
کی ہڈیوں کا۔

اور پھر ان قصوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا
ہے جو نیم افسانہ و نیم حقیقت ہوتے ہیں۔

ایک آدمی دور سے کسی دریا کے کنارے پر
کچھ ہڈیاں دیکھتا ہے اور اس جگہ کو پہچان
لیتا ہے۔ پھر ناؤ کھیتا ہوا وہاں جاتا ہے اور
قدیم جانور کی ہڈیاں کھود کر انہیں اپنے گھر

کانوں نے جو کچھ سنا وہ میں نے آپ تک پہنچا دیا۔
میری آنکھیں دو ماھی گیر ھیں۔ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس سب کی تصویر میں نے آپ کے لئے کھینچ دی ھے۔ اگر آپ میرے ساتھ ساتھ چلے اور آپ نے میرے وطن کو سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے بڑا اطمینان ھوگا۔ تب مجھے معلوم ھوگا کہ باقی تصویر آپ خود بنالیں گے۔ اس لئے کہ میرا وطن بڑا ھے اور اس میں عجائبات بہت ھیں۔

اگر آپ دیکھیں کہ کوئی خرگوش دوڑتا ھوا سڑک پر آ گیا اور اس پر ٹیڑھے میڑھے دوڑتا ھوا اسے پار کرگیا تو یہ برا شگون ھے۔

اگر آپ چاندنی رات میں دیکھیں کہ کوئی خرگوش دوڑتا ھوا سڑک پر آگیا تو یہ نیک شگون ھے۔

اگر ڈوبتے وقت سورج اپنے چہرے کو ایک سرخ شال سے ڈھانپ لیتا ھے تو توقع کیجئے کہ صبح کو برفانی آندھی آئے گی۔

اگر ڈوبتے وقت سورج اپنے چہرے کو زرد شال سے ڈھانپ لیتا ھے تو صبح کو آسمان مسکرائے گا، جھیلیں جگمگائیں گی، درخت گنگنائیں گے —
یوں مانسیوں کے پرکھے اور ھانتیوں کے پرکھے بہت زمانہ پہلے کہا کرتے تھے۔

میں نے ایک بوڑھے مانسی کے خیالات بیان کئے جس نے ماضی کی غلیظ ھوا میں سانس لی تھی اور ایسے تجربوں سے گزرا جنھیں خوش‌قسمتی سے ھم
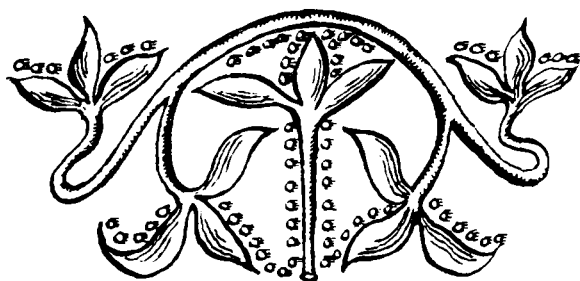
احمدخان ابوبکر

باپ کا ترکہ

لے جاتا ہے۔ اور پھر جب وقت ملتا ہے تو اس
سے صندوقچی، پائپ، انگوٹھیاں، رانپی کا دستہ،
چمچہ، خانہ بناتا ہے۔ اور اس کی ماہرانہ انگلیاں
اساطیر اور پہیلیوں میں دوبارہ جان ڈال دیتی ہیں۔
یوں زندگی کی کہانی چلتی رہتی ہے۔ اس کا
نہ انجام ہے نہ آغاز۔

لیکن کتاب کا تو انجام ہوتا ہے۔

میں مانسیوں کے بہت سے تاروں والے ''توریگ''
کا آخری تار چھیڑتا ہوں۔

میرے وطن جہاں رینڈیر دوڑتے پھرتے ہیں
اور سابل کلیلیں بھرتے ہیں۔ میرے تائیگا، تجھ
پر تیل کے سر بلند ڈیرک دیووں کی طرح کھڑے
ہیں۔ یہ اچھے اور نیک دیو ہیں۔ یہ تیرے
عجوبے سے دنیا کو باخبر کرتے ہیں۔

میرے وطن جہاں میری ماں نے بھوج کی چھال کا
بنا ہوا پالنا ہلایا تھا، جہاں میرے باپ نے ایلک
کی کھال کی چوڑی اسکیئوں پر چلتے ہوئے
ایک پتلی ڈگر کے نشان چھوڑے تھے۔ میرے
تائیگا، آج تیرے پاس نئے پالنے اور کشادہ سڑکیں
ہیں۔

کاش اب تجھ پر لوہے کے طاقتور قافلے منزلوں
پر منزلیں طے کریں۔

ان کے ساکلیہ (گھر) کی دیواروں پر فن کے قدیم نمونوں کا بہت ھی قیمتی خزانہ آویزاں تھا۔ وھاں آپ کو قدیم چین کے ظروف، روسی کاریگروں کے چوب تراشی کے نمونے اور مغرب کے استادوں کے نایاب فن پارے مل سکتے تھے۔

آپ وہ کام کے ٹھیئے پر چھوٹی سی صندوقچی رکھی دیکھ رھے ھیں؟ یہ استاد رجب کی آخری تخلیق ھے۔ وہ اس پر نو سال سے کام کر رھے تھے۔ چاندی پر بہت ھی باریک نقش و نگار میں نیل اور مینا یکجان ھو جاتے ھیں۔ کمال کا فن ھے!

جب کوئی ماں بیٹے کو جنم دیتی تو پہاڑی لوگ اسے دعا دیتے، ''بڑا ھوکر استاد رجب جیسا بنے!''

استاد رجب نے اوپروالے آؤل کے مصری خان کی بیٹی زلیخا سے شادی کی تھی۔ شادی کے سال ھی بھر بعد ان کے ھاں خوشی ھوئی اور ایک بیٹا پیدا ھوا۔ استاد اور زیادہ محنت سے کام کرنے لگے اور ان کی چھینی چاندی پر پہلے سے کہیں زیادہ کاریگری سے کام کرنے لگی۔ اپنی محنت سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا اس سے ایک ھوادار دومنزلہ ساکلیہ بنایا۔ اس دنیا کے سارے لوگوں کی طرح استاد رجب بھی اپنے خاندان کے ساتھ خوشی اور فراوانی کی زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

— ۱ —

میرے ہم‌وطن استاد رجب کو بھلا کون نہیں جانتا؟ وہ کوباچی آؤل (گاؤں) میں پیدا ہوئے تھے اور بہت ہی ماہر سنار تھے۔ وہ جب کام کرتے تو چھینی ان کے ہاتھ میں جادوئی چھڑی بن جاتی اور بےجان دھات کے ایک ٹکڑے میں جان ڈال دیتی۔ لیکن استاد رجب کی شہرت اور تعریف صرف ان کی بےمثال کاریگری ہی کی وجہ سے نہ تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس شخص کی روح بھی پہاڑی جھیل کے پانی کی طرح شریف اور پاک صاف ہے۔ کوباچی کا کوئی آدمی جب اپنے ہم‌کلام کو اپنی بات کی سچائی کا یقین دلانا چاہتا تو وہ استاد رجب کے نام کی قسم کھاتا۔ اس طرح کی قسم کھا کر کوئی بھی بھلا آدمی جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

جب وہ سات سال کے تھے تب سے استاد رجب کے ہاتھ چاندی پر نقش‌گری کرنے لگے تھے۔ اب انھیں شدید محنت کرنے کی عادت ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب ان کا نام اور محنت ہم‌معنی ہو گئے ہیں۔ ان کا کام رنگ اور لطافت کے اس سارے تمول کا حامل ہوتا ہے جو ہمارے پہاڑی علاقے کے انسانوں اور بےنظیر دیہات کو اس فراوانی سے ملا ہے۔

استاد رجب فن کی قدر کرتے تھے، اس سے بڑی محبت کرتے تھے اور اسے خوب سمجھتے تھے۔

نازک جلد اس لائق تھی کہ آؤل کی ساری حسینوں کو رشک آئے۔
لیکن اس کی طبیعت کا میلان اپنے باپ کے ہنر کی طرف بالکل نہ تھا بلکہ یہ ہنر اسے بہت ھی محنت‌طلب معلوم ھوتا تھا۔ غفور کو اپنے نوجوان دوستوں کی پرشور صحبت میں کہیں زیادہ خوشی حاصل ھوتی۔ استاد رجب کا بیٹا پیسوں کی ذرا بھی کفایت نہ کرتا۔ وہ بہت ھی فیاضی کے ساتھ اپنے دوستوں کی دعوت رسیلے کبابوں سے کرتا اور سرخ گیجوخ شراب کا تو کہنا ھی کیا وہ ان کے نقشی سینگوں کے جام میں لنڈھتی ھی رھتی۔ محفل رات دن جمی رھتی۔ زورنائی بجانےوالے اپنی ساری جان کھپا دیتے، نقارچی جوش سے اچھل اچھل پڑتے اور دماغ پر چڑھ جانےوالا جھاگ کسی کے بھی حواس باطل کر دینے کےلئے کافی ھوتا۔ اس محفل نشاط میں کوئی نہ کوئی ضرور شرابی آواز میں پکار کر کہتا، ”آج تو زندہ ھیں، کل کی دیکھی جائےگی! غفور تم پہاڑوں کے اصل باشندے ھو، ھم سب سے اچھے۔ تم زبان سے کہہ بھر دو کہ تمھیں کیا چاھئے اور ھم تمھاری کوئی بھی خواھش پوری کریں‌گے!“
غفور کو اپنے دوستوں کی خوشامدانہ تعریف بہت اچھی لگتی۔ وہ ان کی باتیں سنتے رھنا چاھتا تھا۔ جفاکش استاد رجب کا بیٹا اور بھی فیاض

لیکن خوشی ان کے گھر سے دامن بچا کر نکل گئی۔ ابھی انہوں نے اپنے پرانے ساکایہ میں تالا ڈالا ھی تھا اور نئے گھر میں آرام سے بسنے بھی نہ پائے تھے کہ زلیخا اچانک بیمار پڑ گئیں۔ تین دن وہ درد میں تڑپتی رھیں اور چوتھے دن انتقال کر گئیں۔ استاد کے لئے اپنی چہیتی بیوی کی موت بہت بڑا صدمہ تھی۔ ان کے گھنے سیاہ بالوں میں وقت سے پہلے ھی چاندی کے تار جھلملانے لگے۔ استاد رجب کو رنج‌وغم نے بالکل ھی نڈھال کردیا۔ اب انھیں بس ایک ھی خیال ھوتا کہ ''اب کیا رہ گیا جس کے لئے میں زندہ رھوں؟ اب کس کو اس ھوادار اور آرام‌دہ ساکایہ کی ضرورت ھے؟'' لیکن یہی سوچتے سوچتے انھیں ھوش آیا — آخر وہ اکیلے تو نہیں ھیں۔ زلیخا نے ان کےلئے اپنا بیٹا غفور تو چھوڑا ھے۔

ان کے ھاتھوں نے پھر سے چھینی سنبھال لی اور پہلی ھی جیسی احتیاط سے وہ پھر کام کرنے لگے۔ استاد رجب کی آرزو تھی کہ ان کے بیٹے کو ان سے زیادہ خوشی حاصل ھو اور وہ یہ خواب دیکھا کرتے تھے کہ اپنی کاریگری، چھینی سے کام لینے کا فن غفور کے حوالے کر جائیں‌گے۔

کئی برس بیت گئے اور غفور بڑا ھوگیا۔ قدرت نے اسے پہاڑی علاقے کے افسانوی سورما کمال البشیرا جیسا وجیہ چہرہ مہرہ دیا تھا۔ غفور کی

بھی پرانی کہاوت یاد دلانا چاہتا ہوں کہ 'گھوڑا کسا جائے سواری میں اور دوست بیروزگاری میں...''

لیکن غفور نے اپنے باپ کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

وہ سب مہمان خانے میں خوشیاں منا رہے تھے۔ غفور کو آواز دینے میں اس کے دوستوں کی شرابی آوازیں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ استاد رجب نے اداس ہوکر اپنے کندھے جھٹکے اور اپنے کام کے ٹھیئے پر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ کی چھوٹی سی ہتھوڑی پھر ٹھکر ٹھکر چلنے لگی اور وہ بیچ بیچ میں نظریں اٹھاکر تردد کے ساتھ مہمان‌خانے کے دروازے کو دیکھتے۔

وقت، آپ جانتے ہیں کہ گزرتا رہتا ہے اور کبھی نہیں ٹکتا۔ اور آدمی جب اپنی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک یہ دیکھتا ہے کہ اس کا وقت بےمقصد کٹ گیا اور اب ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا تو وہ بھونچکا رہ جاتا ہے، اف، کس قدر بھونچکا رہ جاتا ہے۔

ایک صبح کو غفور اپنے کمرے کے سامنے گچ پر باھر نکلا۔ وہ ایک خوش‌وضع سبز سرکاشیائی پہنے ہوئے تھا جس پر سنہرا کام تھا اور جو اس کے بدن پر خوب چست تھا۔ اس کے سر پر سرمئی استراخان کی کوبانکا تھی اور اس کے کندھوں پر قرمزی رنگ کا لبادہ بڑی شان سے پڑا تھا۔ غفور کی چھریری کمر پر پیٹی بندھی

ہو گیا۔ اسے یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ جو دوست اسے گھیرے رہتے ہیں وہ سب مطلبی لوگ ہیں اور مشکل کے وقت میں ان میں سے ایک بھی اس کی مدد کو کھڑا نہ ہوگا۔

کئی موقعوں پر استاد رجب نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی:

''ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دو، غفور۔ اس بات کو سمجھو کہ آدمی لفنگوں کی سی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ ہنر سیکھنے میں جی لگاؤ!''

غفور جواب میں کہتا، ''بابا، آخر میں ویسی زندگی کیوں نہ بسر کروں جیسی مجھے اچھی لگتی ہے، بیفکری اور خوشی کی زندگی؟ میں کام کیوں کروں؟ دولت کی کچھ کمی ہے ہمارے پاس؟''

استاد رجب ٹھنڈی سانس بھر کر سر ہلاتے ہوئے کہتے، ''ارے، غفور، جھیل میں بھی اگر باہر سے پانی نہ آئے تو وہ بھی سوکھ جائے!''

''بابا، سو دوست سو اشرفیوں سے بہتر ہوتے ہیں اور میرے تو ایک سو سے زیادہ دوست ہیں۔ وہ سب میری عزت کرتے ہیں اور میں جو بھی چاہوں وہ کرنے کےلئے تیار ہیں۔ یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنے سے روک دیں؟''

''نہیں، بیٹے، نہیں، میں اس سے منع تو نہیں کر سکتا۔ لیکن میں تم کو ایک اور اس سے

''بابا، میں گھوڑے پر ابھی سرپٹ شہر جاتا ہوں اور ڈاکٹر لاتا ہوں۔''

''بیٹے، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑھاپے کا علاج کسی بھی دوا سے نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ اب میرا بھی تمھاری ماں کے پاس جانے کا وقت آگیا ہے۔''

''بابا، ایسی باتیں نہ کیجئے!..'' غفور نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا کیا جا سکتا ہے، بیٹے! میں تو تمھاری شادی پر ناچنا چاھتا تھا لیکن صاف لگتا ہے کہ یہ میری قسمت میں نہیں ہے۔''

غفور نے فوراً اپنا خوش وضع کوٹ اتارا اور معمولی سفری کپڑے پہن کر گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا شہر پہنچا۔

آؤل کے لوگوں نے بھی جب استاد رجب کو کام کرتے نہ دیکھا تو انھوں نے سوچا کہ بوڑھے کاریگر سے ملنے جانا چاھئے۔ اور انھیں بڑی ہی حیرت ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ استاد رجب تو بالکل پیلے پڑ گئے ہیں اور بیماری نے انھیں بالکل ہی توڑ دیا ہے۔ اور بڑی شفقت و محبت کے ساتھ انھوں نے اس بوڑھے انسان کی تیمارداری شروع کردی۔ لیکن ان کی کوششیں بیسود رہیں۔

اگلے دن شہر سے ڈاکٹر آیا۔ اس نے مریض کو اچھی طرح سے دیکھا۔ استاد رجب کا پیلا چہرہ بالکل ہی بےجان سا ہو گیا تھا۔ ان کا

تھی جس سے ایک بہت ھی قیمتی کام‌والا خنجر بڑی بےنیازی سے لٹک رھا تھا۔ اس کی ھر چیز سے یہ ظاھر ھوتا تھا کہ غفور پھر اپنے دوستوں کی صحبت میں پہنچنے کی تیاری کر رھا ہے۔

اس کی نظر اپنے باپ کی کارگاہ پر پڑ گئی۔ پتہ نہیں کیوں استاد رجب معمول کے مطابق آج کام پر نہیں تھے۔

غفور کو حیرت ھوئی کہ ''بابا کہاں ھیں، آخر؟'' اور وہ اپنے باپ کے کمرے کی طرف چلا۔

استاد رجب بیچ کمرے میں تخت پر لیٹے تھے۔ وہ دو دن سے سخت بیمار تھے اور اپنے بستر سے اٹھے ھی نہیں تھے۔

غفور نے ان کے تخت کے برابر گھٹنوں کے بل گر کر تشویش کے ساتھ پوچھا، ''بابا، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ کیا آپ بیمار ھیں؟''

''سلام علیکم، بیٹے! ڈرو نہیں، ذرا اور پاس آجاؤ۔''

غفور اپنے باپ کے تکیے کے پاس بیٹھ گیا۔ استاد رجب نے اپنا کمزور ھاتھ بیٹے کے سیاہ بالوں پر پھیرا۔

''غفور، اب میں بوڑھا ھوگیا۔ میرا جسم بالکل کمزور ھو گیا ہے اور اب میں بالکل چل پھر نہیں سکتا۔''

لیکن بوڑھے نے اس کی بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

''اس افسوسناک انجام کو پہلے ھی سے دیکھ کر میں نے پرانے ساکلیہ کے اوپری کمرے میں ایک رسی تیار کردی ھے... اور اس کمرے کی کنجی تمہیں وھاں اس خانے میں مل جائےگی...''

استاد رجب نے تشنج کے ساتھ ھچکی لی اور کوئی چیز ان کے گلے میں پھنس گئی جیسے وہ کہنا سننا چاھتے ھوں۔

''خدا حافظ، غفور...'' انھوں نے بڑی کوشش کرکے بہت ھی نحیف آواز میں آخری الفاظ کہے۔

''بابا، بابا!''

لیکن استاد رجب اب اپنے بیٹے کی آواز نہ سن سکتے تھے۔ وہ تخت پر ساکت و صامت پڑے تھے، بس ان کا سر غفور کی طرف ڈھلکا ھوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مرنےوالے کی بیجان آنکھیں رنج اور افسوس کے ساتھ بیٹے کو تک رھی تھیں۔

— ۲ —

جس نوجوان نے اپنی آزاد زندگی شروع نہ کی ھو اس کےلئے باپ کے سائے سے محروم ھو جانا بہت ھی تکلیف‌دہ چیز ھے۔ ھر روز ستارہ زھرہ کے نکلتے ھی غفور قبرستان کی طرف چل کھڑا ھوتا اور رات گئے تک وھیں رھتا۔ رنج کی شدت

دم آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے غفور کو دوسرے کمرے میں بلایا اور اسے سچی بات بتائی۔

اس خیال سے کہ اس کا باپ مر رہا ھے غفور کے ہوش و حواس جاتے رہے اور اس نے ڈاکٹر سے منت سماجت کرنی شروع کردی کہ وہ بوڑھے مریض کو بچالے۔ غفور نے وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر کو منہ مانگ انعام دےگا۔ ڈاکٹر نے جواب میں اداسی کے ساتھ بس اپنے ھاتھوں سے اشارہ کیا، بولا کچھ نہیں۔

اسی وقت استاد رجب کی کمزور آواز اچانک اس کمرے میں سنائی دی جہاں وہ لیٹے تھے۔ غفور بھاگ کر وھاں پہنچا۔

اس نے چلاکر دم توڑتے ہوئے باپ پر جھک کر کہا، ''بابا، میں یہاں ھوں، بالکل آپ کے پاس!،،

''بیٹے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ھو، اب میں اس دنیا سے رخصت ھو رہا ھوں۔ میں جانتا ھوں کہ میری موت کے بعد تم اپنے دوستوں کے ساتھ ھماری ساری دولت اور نئے ساکلیہ کو اڑا دوگے۔ اور یقین مانو کہ جب تمھارا سارا روپیہ ختم ھو جائےگا تو تمھارے دوست تم کو چھوڑ دیںگے اور ان کی نظروں میں تمھاری کوئی عزت نہ رہ جائےگی۔ تب تم اپنی لاپروائی کی زندگی پر بہت پچھتاؤگے اور مرجانا چاھوگے...،،

''بابا، بابا...،، غفور نے کچھ کہنا چاھا۔

اندھیرے ساکلیہ میں ملنے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اب اسے خود ھی فاطمہ کو لے کر سہمان کی طرح دوستوں کے سجے سجائے گھروں میں جانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے دوستوں کی میزبانی بھی اسی وقت تک چلی جب تک انھیں یہ نہیں معلوم ھو گیا کہ غفور بالکل ھی برباد ھو چکا ہے۔ تب سب کے سارے دوستوں نے اس سے منہ موڑ لیے۔ تھوڑے ھی دنوں بعد فاطمہ کے بھائی غازی محمد نے اپنی بہن کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنے مفلوک الحال شوھر کو چھوڑ دے۔

ایک دن غفور گھر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وھاں نہ اس کی بیوی ھے نہ ان کا نوزائیدہ بیٹا۔ خستہ حال ساکلیہ خالی اور سنسان پڑا تھا۔ پڑوسیوں نے اسے بتایا کہ فاطمہ اپنے میکے چلی گئی۔ اب اس بدنصیب نوجوان کو تسلی دلاسا کون دیتا؟ اس کے اردگرد کے لوگ اس پر ھنستے اور اس کے دوست جو ابھی تھوڑے دنوں پہلے تو غفور کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے اب اس کی طرف حقارت سے دیکھتے تھے۔ اس کے بعد سے وہ سارا سارا دن اپنے اندھیرے اور سیلے ھوئے ساکلیہ میں پڑا رھتا، باھر نکلتے ھوئے اسے ڈر لگتا تھا کہ گاؤں والے اس کے پھٹے پرانے کپڑے دیکھ لیں گے۔

میں وہ اپنے دوستوں کو بالکل ہی بھول گیا اور دوبارہ اس نکمے پن کی زندگی کی طرف واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس کے دوست اصرار کرکے اسے دعوت دیتے کہ اچھی شراب پی کر وہ اپنا غم غلط کرے لیکن غفور سختی سے انکار کر دیتا۔ پھر اس کے ایک دوست، غازی محمد نے اپنی بہن فاطمہ کو راضی کیا کہ وہ غفور کا دھیان اس رنج کی طرف سے ہٹائے۔ فاطمہ کا حسن سارے آؤل میں مشہور تھا۔ فاطمہ نے نہ صرف اس جانکاہ صدمے سے غفور کا دھیان بٹایا بلکہ خود اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی۔

شادی جلد ہی ہوگئی۔ اپنی جوان بیوی کے لاڈ پیار نے غفور کو ایسا بیخود کیا کہ وہ اپنے باپ کی مایوس کن پیشین گوئیوں کو بھلا بیٹھا۔ وہ اپنے دوستوں میں واپس آگیا اور پھر کھانے اور قیمتی شراب سے ان کی دعوتیں بڑی فیاضی کے ساتھ کرنے لگا۔ عیش و طرب کی محفلیں اس وقت تک جاری رہیں جب تک غفور کی آخری کوڑی بھی خرچ نہیں ہو گئی۔ لیکن گھمنڈی نوجوان یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دوست اسے غریب سمجھیں۔ اس نے نئے ساکلیہ کو بیچ دیا اور خود پرانےوالے میں اٹھ آیا۔ روپیہ ایک بار پھر اسے مل گیا۔

مگر اس کے دوست اب اس سے نیچے اور

بدنصیب نوجوان نے جلدی سے پالنے پر پاؤں رکھا اور ایک ہی بار میں اس نے پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا اور زور سے لات مار کر پالنے کے سہارے کو پاؤں کے نیچے سے ہٹا دیا۔ ایک لمحے تک غفور کا جسم ہوا میں لٹکتا رہا لیکن چھت کا تختہ اچانک چٹخا اور غفور بورے کی طرح فرش پر گر گیا۔ جلدی سے پھندے کو گلے سے نکال کر حیرت‌زدہ غفور نے دروازہ پاٹوں‌پاٹ کھول دیا کہ دیکھے تو سہی یہ کیا ہوا۔ لکڑی کی چیپیوں کے بیچ میں وہ ایک چھوٹا سا صندوقچہ دیکھ کر حیران رہ گیا جس کے تالے میں ایک سنہری کنجی لگی تھی۔

غفور کو اچانک خیال ہوا، ''سونا! ہوگا، لیکن اب مجھے اس سے کیا لینا،، وہ ھچکچایا۔ ''اور پھر یہ بھی کتنے دنوں چلےگا؟،،

لیکن جب اس نے صندوقچہ کھولا تو اس میں اسے نہ سونا ملا، نہ روپیہ اور نہ کوئی اور قیمتی چیز، بس کاریگر کے سلیقے سے رکھے ہوئے اوزار تھے اور وہی صندوقچی جسے استاد رجب ختم نہیں کر پائے تھے۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔ استاد رجب نے لکھا تھا، ''بیٹے! میں نے یہ کام شروع کیا تھا اور اب اسے تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے پورا کر دوگے۔،،

''بابا، شکریہ، آپ کا بہت بہت شکریہ!،، غفور

ایسی حالت میں غفور کو اپنے باپ کے آخری الفاظ یاد آگئے ۔ اس نے بتائے ہوئے خانے میں سے کنجی نکلی اور جاکر اس کمرے کا دروازہ کھولا جس کے لئے استاد رجب نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ اس میں مرے گا ۔

کمرہ اندھیرا اور خالی تھا ۔ اس کی ننگی دیواروں پر ، جہاں کبھی اس کے باپ کے قیمتی قالین لٹکے ہوئے تھے، اب سوائے ٹیڑھی میڑھی کیلوں کے اور کچھ نہیں تھا ۔ فرش پر ایک پرانا پالنا پڑا تھا ۔ کبھی اس کی ماں زلیخا نے اس میں چہیتے بیٹے غفور کو جھلایا تھا ۔ سارے کونوں میں مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے بن رکھے تھے اور چھت سے بڑے معنی‌خیز انداز میں کسی زھریلے سانپ کی طرح ایک رسی لٹک رھی تھی ۔

ایک لمحے کے لئے تو غفور ڈر گیا ۔ بےاختیار اس کا جی چاھا کہ وہ اس کمرے سے بھاگ جائے اور چلائے ۔ لیکن پھر اس نے اپنے خوف پر قابو پالیا ۔ اس نے سوچا، ”اب میرے لئے جینے کو ھے ھی کیا اور میں اس دنیا میں پیدا ھی کیوں ھوا تھا ۔ ویسے بھی میرے بعد تو کچھ رہ نہیں جائے گا ۔ میرے باپ کی ھر بات ٹھیک تھی ۔ یوں کم سے کم میں ان کی وصیت پر تو عمل کر لوں گا ۔“
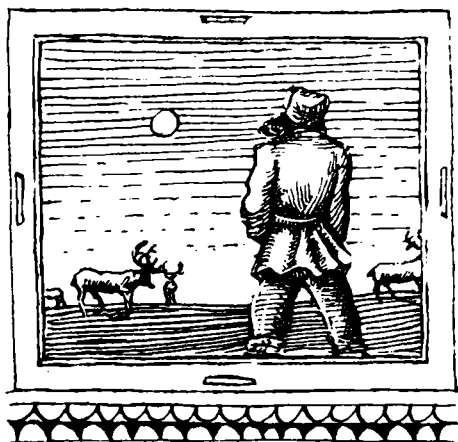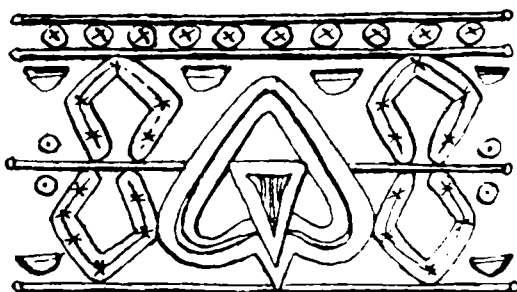
سیمیون کوریلوف

ہم ٹنڈرا ہی میں ملیں گے

نے روتے ہوئے کہا۔ اس کی روح تک لرز گئی تھی۔ ''آپ نے مجھے دوبارہ اس دنیا میں جنم دیا۔،، اس نے اپنے باپ کے رقعے کو بوسہ دینا اور سینے سے لگانا شروع کردیا۔

اسی وقت دروازے پر ایک سایہ لہرایا۔ غفور نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ادھر اٹھائیں تو دیکھا فاطمہ ان کے بیٹے تیمور کو گود میں لئے کھڑی تھی۔

''میں ان لوگوں کو چھوڑ آئی۔ میرے غفور، اب میں ہمیشہ کےلئے تمھاری ہوں! مجھے معاف کردو...،، اور وہ اپنے شوہر کے گلے سے لگ گئی۔

غفور نے اپنی بیوی کو سنبھالا اور بچے کو اس کی گود سے لےلیا...

ان واقعات کو کئی دھائیاں گزر چکی ہیں۔ اور آج اگر کوئی کوباچی‌والا اپنے ہم‌کلام کو اپنی بات کی سچائی کا یقین دلانا چاھتا ھے تو اب وہ استاد غفور کے نام کی قسم کھاتا ھے۔

یدوارد نے اپنا بدن سمیٹ کر ہاتھ باندھ لئے
۔ کہ پانی اس کے کالر کے اندر سے ہوتا ہوا
۔ کی ریڑھ کی ہڈی پر گدگدی نہ کرے۔
اس نے دل ہی دل میں سوچا، ''کیسی بیوقوفی
کی تم نے جو اپنی ماں کی بات نہ سنی اور برساتی
نہ پہنی۔''
اسے ٹھنڈ نہیں لگ رہی تھی۔ اپنی فوجی قمیص
کے نیچے ایدوارد سپاہیوں والا روئی دار جیکٹ
پہنے ہوئے تھا اور قمیص کے اوپر سپاہیوں والی
چوڑی پیٹی کس کر باندھ رکھی تھی جس کے
چمکتے ہوئے بکسوئے کو وہ روز راکھ سے چمکاتا
تھا۔ وہ اس پیٹی کو بہت سنبھال کر رکھتا
تھا۔ قمیص تو آخر کو پھٹ جائےگی، پرانی ہوکر
گل جائےگی لیکن پیٹی برسوں چلےگی، ایک وفادار
ساتھی اور فوجی خدمت کی نشانی رہےگی۔ اس
کی سمور کی کنپٹی دار ٹوپی کا بال بال بھیگ
چکا تھا اور اتنی بھاری ہو گئی تھی کہ اس
کے سر پر بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔
لیکن اس کے اونچے گم بوٹ بھاری نہیں ہو رہے
تھے اور اندر سے ابھی تک سوکھے تھے۔
دائیں طرف کوئی سفید چیز لپک کر نکلی۔
ایدوارد نے مڑکر دیکھا۔ ایک سفید لومڑی بڑی
احتیاط کے ساتھ گلے کے کنارے کنارے چلی جا
رہی تھی۔ شاید وہ آنولیں چٹ کیا کرتی تھی
جو چراگاہ میں ادھر ادھر پڑی ہی رہتی تھیں۔

صبح سویرے ھی آسمان کے جنوبی حصے پر ایک نیلگوں گلابی بادل نمودار ھو گیا جو برابر بڑا ھی ھوتا گیا۔ کناروں پر سے وہ پھٹ گیا اور بعض جگہوں پر اس کی لیریاں افق پر زمین سے مل گئیں۔ وھاں بارش ھو رھی تھی۔ دوپہر کے قریب بادل نے سورج کو ڈھانپ لیا اور ٹنڈرا میں بس دھندلکے کا سا مٹمیلا اجالا رہ گیا۔ دکھن سے گرم ھوا چلنے لگی۔ بارش ھونے لگی۔ سال کی پہلی بارش، اس بات کی نقیب کہ گرمیاں آ رھی ھیں۔ شروع تو ھوئی چند سہمی سہمی بوندوں سے، پھر یہ بوندیں بڑی اور تیز ھو گئیں اور آدمی کے چہرے پر بہنے لگیں اور گردن سے ھوتی ھوئی پیٹھ پر پہنچنے لگیں۔ رینڈیر بھی ھڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

رینڈیروں کے نوعمر بچے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ سماں دیکھ رھے تھے اور بارش کی مہک کو تجسس کے ساتھ سونگھ رھے تھے۔ ھر بار جب ان کے نتھنوں میں کوئی بوند چلی جاتی تو وہ چونک پڑتے۔ بہتوں نے چراگاھوں پر پھدکتے ھوئے بلبلوں کو ایک ڈر کے ساتھ دیکھا۔ البتہ جہاں دیدہ مادہ رینڈیروں کےلئے بارش کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ انھوں نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور پگراتی رھیں۔ البتہ جب ان کے بڑے بڑے بال بالکل تربتر ھوکر بھاری ھو گئے تب وہ گیلی زمین پر لیٹ گئیں۔

بر چرنے لگے تھے۔ ایدوارد ھنسنے لگا۔ رینڈیروں
کے بچے جب پیدا ھوتے ھیں تو کیسے مضحکہ خیز
ھوتے ھیں۔ لمبی لمبی ٹانگوں پر ان سے کھڑا
بھی مشکل سے ھوا جاتا ھے لیکن پھر بھی بڑی
ھٹ دھرمی سے اپنی ماؤں کے پیچھے ھی پیچھے
چلنے کی کوشش کرتے ھیں۔ لیکن دو ھی تین
ڈگمگاتے قدم لےکر وہ زمین پر منہ کے بل گر
پڑتے ھیں اور پڑے رھتے ھیں جب تک ان کی
مائیں بھاگ کر ان کے پاس واپس نہیں آتیں۔
مادہ رینڈیر جب لوٹ کر بچے کے پاس آتی تو
اس کے گرد چکر لگا لگاکر ڈکراتی اور پھر
جیسے ماں کی منت سماجت کو سمجھ کر بچہ
کوشش کرکے اٹھتا، دو تین قدم چلتا اور پھر
ڈھے پڑتا۔ مادہ رینڈیر پھر ڈکرانا شروع کرتی
اور بچہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ھو جاتا۔ اب
کے بار ماں اس کے منہ میں ایک سونہہ دے دیتی۔
جیسے بچہ چوسنے لگتا ویسے ھی ماں دھیرے دھیرے
آگے بڑھنا شروع کردیتی اور اپنے بچے کو قدم بقدم
آگے لےجاتی۔

ایدوارد کو اچانک یہ لگا کہ وہ تھک گیا ھے۔
اب تک یگور کو آجانا چاھئے تھا تاکہ اسے
چھٹی مل جاتی۔ ایدوارد نے نظر دوڑائی اور دور
پر اسے یگور آتا ھوا سچ مچ نظر آ گیا۔ لیکن تعجب
کی بات یہ تھی کہ وہ گھر کی طرف سے نہیں
بلکہ پورب کی طرف سے آ رھا تھا جہاں آٹھواں

پچھلے چند دنوں سے رینڈیر بڑی تعداد میں بیا رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ایک مادہ رینڈیر ہانپتی ہوئی اپنے پہلو کے بل لیٹ گئی۔ ایدوارد نے اس پر نظر رکھی کہ شاید اسے مدد کی ضرورت ہو۔ لیکن مادہ رینڈیر نے ایدوارد کی مدد کے بغیر سب کچھ خود ہی کر لیا۔ ماں تو سرمئی رنگ کی تھی لیکن اس نے بچہ جنا کالا۔ مادہ رینڈیر کھڑی ہو گئی اور اپنے بچے کو چاٹنے لگی جو اپنے نم کان ہلائے جا رہا تھا۔ بچے کے سارے جسم کو بڑی صفائی سے چاٹ چکنے کے بعد ماں اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔ بچے نے اس کے پیٹ کو تھوتھنی سے ٹٹولا اور جب اسے ایک سونہہ مل گئی تو زور لگا کر وہ اسے چوسنے لگا۔

بارش اتر کی طرف چلی گئی اور پانی تھم گیا۔ بارش کے بعد ٹنڈرا کا روپ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ پورے کا پورا گھرے سرمئی رنگ کا ہو گیا تھا اور بس ٹیلوں کے دامن میں گڑھوں میں یہاں وہاں برف کی چند ڈھیریاں رہ گئی تھیں۔ دور کی جھیلوں پر جمی ہوئی برف اب گھرے نیلے رنگ کی لگتی تھی۔

ایدوارد نے گلے کو دیکھا۔ وہ چراگاہ پر دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے والے رینڈیر بھاگ کر آگے والوں کے برابر پہنچ رہے تھے جو نئی جگہ

ایدوارد نے اپنی قمیص میں سے ایک موٹی کتاب نکالی اور اسے یگور کی طرف بڑھایا۔
"کون‌سی کتاب ھے یہ؟"، ضلع کمیٹی کے سکرٹری نے دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔
"یہ ایلڈریج کی ایک کتاب ھے۔ اس کا نام ھے 'خالی منظر کے ھیرو'۔"
"پسند آئی تمھیں؟"
"کتاب تو مجھے پسند آئی لیکن مرکزی کردار گورڈن مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا بلکہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ میں یہ سمجھا ھوں کہ وہ انگریز سامراجیوں سے تو نفرت کرتا ھے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کس طرح عربوں کی مدد کرے۔ وہ پیچھے کی طرف زیادہ دیکھتا تھا آگے کی طرف نہیں۔"
ضلع کمیٹی کے سکرٹری نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ بیریژنوف کی طرف مڑکر بولے:
"آپ نے اس ناسزدگی کے بارے میں بالکل صحیح سوچا تھا۔ مجھے آپ کی رائے سے بالکل اتفاق ھے۔ اچھا، تو چلیں۔"
یگور نے ایدوارد کو اشارہ کیا، "ھاں، ھاں، جاؤ اور جاکر اپنی طرح سے سوجاؤ۔"
بیریژنوف نے پوچھا، "اس کے کیا معنی ھوئے، اپنی طرح سے؟"
یگور نے بڑے شوق سے وضاحت کرنی شروع کی۔
"ایدوارد ایسا آدمی ھے جو بہت دیر تک سوئے بغیر رہ سکتا ھے لیکن جب سوتا ھے تو

گلہ چرائی کر رہا تھا۔ اور پھر یہ کہ یگور اکیلا بھی نہیں تھا، اس کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔ جب وہ اور قریب آئے تو ایدوارد نے ان میں سے ایک کو پہچانا۔ وہ بیریژنوف تھے، ریاستی فارم کے ڈپٹی ڈائرکٹر۔ دوسرے آدمی کو ایدوارد نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یگور نے پکار کر کہا، ''کیا حال چال ھیں ایدوارد؟ رینڈیروں کو گن رہے ہو؟ کیا آج بہت سے بیائے؟،،

''اکیس،، ایدوارد نے جواب دیا اور اجنبی کو تکنے لگا۔

بیریژنوف بولے، ''ان سے ملو، یہ ضلع کمیٹی کے سکرٹری ھیں کامریڈ سیدیخ۔،،

سکرٹری نے اپنا ھاتھ بڑھاتے ھوئے اپنا نام بتایا، ''نکولائی سیدوروویچ۔ ھم پورب والے گلے کو دیکھ رہے تھے، پھر تمھاری بستی کی طرف لوٹتے ھوئے خیال ھوا کہ تم سے بھی ملتے چلیں۔ ھمیں کچھ بات کرنی ھے۔ تم فرصت سے تو ھو نہ؟،،

''بس ابھی ھو جاتا ھوں، گلہ حوالے کردوں،، ایدوارد نے جواب میں کہا اور یگور کی طرف مڑا۔ ''تو اکیس آج بیائے۔ ایک بچہ کمزور ھے۔ وہ ھے اس کی ماں،، اس نے بیچ گلے میں ایک سرمئی مادہ رینڈیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان پر نظر رکھنا۔ اس کے علاوہ سب کچھ ٹھیک ھے۔ یہ لو کتاب۔،،

کی ہوتی ہیں۔ اخبار برابر آتے ہیں حالانکہ
ایک ہفتہ بعد کے ہوتے ہیں مگر وہ تو لازمی
ہے۔ یوکاگیر لوگ اب سچ مچ اچھی زندگی بسر
کرتے ہیں۔"

"اور انہیں اور بھی اچھی زندگی بسر کرنا
چاہئے"، ضلع کمیٹی کے سکرٹری نے کہا۔ "جہاں
اب تمہارا نسلیگ (گاؤں) ہے وہاں سات برسوں
میں ایک بڑی بستی آباد ہو جائے گی۔ اس کا اپنا
بجلی گھر ہوگا۔ چلتے پھرتے سینما کی جگہ ایک
مستقل سینما گھر ہوجائے گا۔ جہاں جہاں ممکن ہوگا
ہم مشین بندی رائج کر دیں گے۔"

ایدوارد بولا، "مشین بندی تو بہت ہی اچھی چیز
ہوگی۔ پہلے جب گلے دور دور لے جائے جاتے تھے،
مشرقی سائبیریائی سمندر کے ساحل کی طرف، تو
گلہ بانوں کے پاس کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا۔
ان کے پاس شکر رہ جاتی نہ آٹا اور لینے کے لئے بہت
دور جانا پڑتا۔ ٹریکٹر ہر جگہ پہنچ سکتا ہے اور
ہوائی جہاز تو یہاں وہاں اڑ سکتا ہے اور اس طرح
کھانے کی چیزیں پہنچا سکتا ہے جیسے چم چچڑ ایک
رینڈیر سے دوسرے رینڈیر پر جاتے ہیں۔"

"کامریڈ تریتیاکوف، لوگوں کو مشین بندی کی
ضرورت ہے۔ میں اسی کے بارے میں تم سے بات کرنا
چاہتا تھا۔ کیا تم ایک سال کے مشین بندی کے
کورس کے لئے جا سکتے ہو؟ یہ کورس اوسسک کے
زراعتی انسٹی ٹیوٹ میں ہوگا۔"

پھر بھالو کی طرح سے۔ میں اس کا الٹا ہوں۔
رینڈیر جب چم‌چچڑوں سے چھٹکارا پانے کے لئے
ہوا کے خلاف دوڑتے ہوتے ہیں تو میں ایک
جھپکی لے لیتا ہوں۔"

وہ اطمینان سے چلتے رہے، کوشش کرکے گھاس کے گچھوں پر پاؤں رکھتے ہوئے اس لئے کہ پھسلن‌والی منجمد برف پر بہار کے پانی کی ایک دھوکےباز تہ تھی۔ لاپروائی سے ایک بھی قدم رکھا اور پانی میں لت‌پت ہوگئے۔ یہ تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا۔ اسی لئے وہ خاموش بھی تھے۔ جب وہ ایک اونچے ٹیلے کے اوپر پہنچے جہاں سے بڑی اولیرا جھیل دکھائی دیتی تھی، جو کئی کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تھی، تب ضلع کمیٹی کے سکرٹری نے ایدوارد سے بات‌چیت شروع کی۔

"فوجی خدمت کے بعد جب تم گھر آئے تو کیا تمھیں لگا کہ یہاں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی ہیں؟ تم چیتہ میں تعینات تھے نہ؟"

"چیتہ میں۔ تبدیلیاں سی تبدیلیاں! جب میں گیا تھا تو ہمارے ہاں ایک اجتماعی فارم تھا۔ لیکن تین سال بعد جب میں واپس آیا تو سارے گلہ‌بان ریاستی فارم کے کارکن تھے۔ ہر شخص کے پاس پاسپورٹ ہے جیسے شہر میں ہوتا ہے۔ گلہ‌بانوں کو تنخواہ ملتی ہے اور میرے باپ کہتے ہیں کہ تنخواہیں وہی ہیں جو وزیروں

ایدوارد جب کھا رہا تھا تو اس کی ماں اسے برابر تکتی رہیں۔ بعد کو انھوں نے چینی کے ایک مگ میں چائے انڈیلی اور پھر مسکراتی ہوئی ایدوارد کی کتابوں کے بکسے میں، جسے وہ اپنی 'ٹنڈرا بک شیلف، کہتا تھا، کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"یہ لو، تارو،، انھوں نے اسے بچپن کے بھولے بسرے نام سے پکارا۔ ایدوارد نے لفافہ لےلیا اور ڈاکخانے کی مہر دیکھنے لگا، چیتہ سے آیا تھا۔ اس نے احتیاط سے لفافہ کھولا جس میں سے ایک چھوٹا سا کارڈ سا گر پڑا۔ اس کی ماں کو کرید تو بڑی ہورھی تھی لیکن لحاظ سے وہ دوسری طرف مڑ گئیں۔ ایدوارد نے بھی تصویر کو دیکھنا نہیں شروع کیا۔ چائے ختم کئے بغیر مگ کو وھیں چھوڑ کر وہ خیمے سے باھر چلا گیا۔ شاید خیمے کے اندر روشنی کافی نہیں تھی یا ھو سکتا ھے وہ خط اکیلے میں پڑھنا چاھتا ھو۔ آخر خط بھی تو بات‌چیت کی طرح ھوتا ھے اور اگر کوئی اور بھی آس پاس ھو، چاھے وہ اپنی ماں ھی کیوں نہ ھو، تو آدمی دل کھول کر باتیں تو نہیں کر سکتا۔

نسلیگ میں سناٹا تھا۔ بس باھر سے آنے‌والوں کے کتے، جو خیموں سے کچھ دور پر بندھے ھوئے تھے، ایدوارد کو دیکھ کر بڑے زور زور سے بھونکنے لگے۔ ایک کتاگاڑی پر بیٹھ کر ایدوارد تصویر کو دیکھنے لگا۔ تانیا بدل گئی تھی۔ اب وہ اپنے بال دوسری طرح بنانے لگی تھی۔ یا ھو سکتا ھے وہ بدلی

''میں جاؤں‌گا،، ایدوارد نے ذرا بھی سوچے بغیر کہہ دیا۔

''بہت ہی اچھی بات ہے،، ضلع کمیٹی کے سکرٹری نے خوش ہوکر کہا۔ ''تمھیں جلدی کرنی پڑےگی۔ بس زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح کو روانہ ہو جانا چاھئے۔ اپنے کاغذات کا بندوبست آندریوشکینو گاؤں سوویت میں کر لینا۔ وھاں سے میرے خیال میں صدر تک تم ڈاک‌والے ھیلی‌کاپٹر میں جاؤگے۔،،

ایدوارد کا منه اتر گیا۔ اس کی ماں اس بات پر ضرور دکھی ہو جائیں‌گی، ابھی بس چھ مہینے ہوئے ھیں گھر آئے ہوئے اور اب وہ پھر جا رھا ھے۔ یہ برا ہوا کہ کورس اوسسک میں ھے۔ اس کےلئے تو اچھا یہ ہوتا کہ چیتہ میں ہوتا۔

* * *

ایدوارد اپنے توردوخ میں داخل ھوا۔ اس کے باپ سو رھے تھے لیکن ماں لوھے کی بھٹی کے پاس اس کے انتظار میں بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رھی تھیں۔ بیٹے کو دیکھتے ھی وہ چپکے سے اپنے کام میں لگ گئیں۔ بھٹی میں انھوں نے سوکھا جھنکاڑ ڈالا، کچھ شوربہ گرم کیا اور روٹی کے ٹکڑے کاٹے۔ لیمپ انھوں نے نہیں جلایا اس لئے کہ اس کی کوئی ایسی ضرورت نہ تھی۔ بہار کی رات کچھ ایسی اندھیری نہ تھی اور خیمے کی ڈھلواں چھت میں جو روشندان تھا اس میں سے خاصی روشنی آرھی تھی۔

اس کی ماں نے پھر ٹھنڈی سانس بھری۔
''پڑھی لکھی لڑکی ھے۔ یہ تو سچ ھے کہ تو بھی جاھل ان‌پڑھ نہیں ھے لیکن تیرے لئے تو ٹنڈرا تیرا گھر ھے اور اس کےلئے یہ انجان جگہ ھوگی۔ اسے گھر یاد آئےگا اور پھر ھمیں برا لگےگا۔،،
''کچھ پتہ بھی ھے تمھیں، وہ یہاں کام کرنے آ رھی ھے۔ تو پھر اکتائےگی کیوں؟،،
''اگر مجھ سے کوئی یہ کہے کہ ایک روسی لڑکی چاند پر رھنے کےلئے پرواز کر گئی ھے تو میں یہ مان لوں‌گی کہ وہ ایک بہادر روسی لڑکی تھی۔ لیکن یہ بات کہ کوئی روسی لڑکی رینڈیروں کے ایک گلہ‌بان سے شادی کرےگی اور اس کے ساتھ ٹنڈرا میں ماری ماری پھرےگی، یہ تو یقین کرنے کی بات ھی نہیں ھے۔،،
ایدوارد نے آھستہ آھستہ کہنا شروع کیا، ''میں ابھی تمھیں سمجھائے دیتا ھوں۔ یہ سچ ھے کہ اگر ضرورت ھو تو تانیا چاند پر بھی جا سکتی ھے۔ ایسے کام کرنے کےلئے صرف بہادر ھی نہیں، آدمی کو ذھین بھی ھونا چاھئے۔ اور ذھین آدمی ٹنڈرا میں بھی نہیں اکتائےگا۔ لڑکیاں اجوت زمینوں کے علاقے میں جاتی ھیں اور وھاں اکتاتیں نہیں۔ تم نے اجوت زمینوں کے بارے میں سنا ھے؟ وھاں لوگ وہ پودا اگاتے ھیں جس سے آٹا بنتا ھے۔،،
بوڑھی عورت کی تشویش دھیرے دھیرے کم ھو رھی تھی۔ انھوں نے بیٹے کے پرمسرت چہرے کو دیکھ‌کر اپنا سر ھلایا، پھر ھنس پڑیں:

نہ ہو یہ محض تصویر کی وجہ سے اسے ایسا لگ رہا ہو۔ پھر اس نے خط کھولا ۔ جلدی جلدی شروع سے آخر تک پڑھ گیا اور بس ایک بات سمجھا : وہ آ رہی تھی! اس کے ٹکنیکی کالج کی مویشی پالن کی فیکلٹی نے فارغ التحصیل ہونےوالے طالب علموں کا تقرر کر دیا تھا ۔ اس نے خود ہی کہا تھا کہ اسے ان لوگوں کے پاس ٹنڈرا بھیج دیا جائے ۔ اب سب سے اہم بات معلوم کرنے کے بعد ایدوارد نے خط کو آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا، لفظ بہ لفظ، سطروں کے درمیان چھپے ہوئے لطف و محبت کی ہر کیفیت پر غور کرکے ۔

اس کی ماں نے خیمے سے باہر دیکھا، ''تارو ، جاؤ جا کر سوجاؤ ، جلد ہی سورج نکل آئےگا ۔،،

بوڑھی عورت نے گھما پھرا کر بات کرنی شروع کی، ''وہ خط میں کیا تصویر تھی؟،،

''ہاں، ہاں، یہ رہی تصویر ، ماں ۔ تم بھی دیکھو ۔،،

اس کی ماں تصویر کو طنزیہ نظروں سے دیر تک دیکھتی رہیں ۔

انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، ''گوری سی ننھی سی ہے، یوکاگیر لڑکیوں کی طرح تو بالکل نہیں ہے ۔ تارو ، ہوگا کیا؟ تو یہاں ہے، وہ وہاں ہے ۔ اس کے معنی کیا ہوئے؟ میں بوڑھی ہوں اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ پوتے پوتیاں ہوں ۔،،

''ماں، وہ یہاں آ رہی ہے ۔ ہم لوگ شادی کر لیں گے ۔،،

والا ہے۔ تم اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر سب کچھ ٹھیک کر لو۔،،
ماں کے کان کھڑے ہوئے اور باپ بندوق صاف کرتے کرتے رک گئے لیکن انھوں نے سر اوپر نہیں اٹھایا — دو آدمی اگر کام کی باتیں کر رہے ھیں تو تیسرے کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔
''بات یہ ہے، نکولائی سیدوررووچ، کہ مجھے پتہ نہیں میں جا سکوں گا یا نہیں۔ میری ماں کو دکھ ھوگا۔ اس لئے کہ ابھی تھوڑے ھی دن ھوئے تو میں فوج سے واپس آیا ھوں...،،
ضلع کمیٹی کے سکرٹری ایدوارد کے ماں باپ کی طرف مخاطب ھوئے، ''کیا آپ نہیں چاھتے کہ آپ کا بیٹا سال بھر کےلئے پڑھنے کو جائے؟،،
''ھم کیوں نہ چاھیں گے؟،، اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا۔ ''مردوں کو سفر کرنا ھی چاھئے اور بڑے بڑے کام کرنے چاھئیں۔ ضرور جائے۔ ھماری تو بیٹی بھی گھر پر نہیں رھتی۔ وہ آندریوشکینو میں بورڈنگ اسکول میں ہے، آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔،،
اس کی ماں اپنے بیٹے کو اس کے باپ سے زیادہ اچھی طرح جانتی تھیں، وہ بولیں:
''سن، میری جان، تجھے اس کی پریشانی نہیں ہے کہ ھمیں کیسا لگےگا۔ یاد ہے تجھے، تو نے رات کیا کہا تھا: صرف بہادر لوگ ھی نہیں چاند کی پرواز پر جاتے۔ اس کےلئے آدمی کو ذھین بھی

''اس کےلئے ایک سفری مکان بنا دینا تاکہ ٹریکٹر اسے کھینچ کر ٹنڈرا میں ہر جگہ لے جا سکے۔ اسے توردوخ میں رہنے میں آرام نہیں ملےگا۔''

''ماں، جلدھی سب کےلئے مکانات بنائے جائیں گے اور تم بھی توردوخ میں نہ رہوگی۔''

خط اور ماں کے ساتھ بات‌چیت کی وجہ سے ایدوارد ضلع کمیٹی کے سکرٹری کی پیش‌کش کو بالکل ھی بھول گیا۔ وہ تو جب لیٹا تب اس کے سینے کے بائیں حصے میں جیسے کوئی چیز دھڑکی اور رک گئی۔ تانیا آ رہی تھی اور وہ... یہ اس نے کیا کیا؟ کیوں وہ جانے پر رضامند ہوگیا تھا؟

تھکن نے اسے بےبس کر دیا اور وہ سوگیا۔ جب وہ سویا تو اس کے دل و دماغ میں الجھن سی تھی۔

اور جب اٹھا تب بھی اس کا دماغ پریشان تھا۔ جب ماں ناشتہ تیار کر رھی تھیں تب بھی وہ کڑھتا رھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔ وہ اسی ادھیڑبن میں مبتلا رھا اور اس نے اپنے ماں باپ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اتنے میں ضلع کمیٹی کے سکرٹری آ پہنچے۔ اندر آ کر انھوں نے دعا سلام کیا اور فوراً ھی کام کی بات شروع کر دی۔

''تو کامریڈ تریتیاکوف، کیا آج تم گلے کا چارج دے سکتے ہو؟ بیانے کا موسم تو تقریباً ختم ھوگیا اور اب گلے کا معائنہ کرنے کےلئے کمیشن آنے ھی

تھیں لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اور بیگ میں انھوں نے رینڈیر کا ابلا ھوا اور سوکھا گوشت بھر دیا تھا، سب سے اچھے ٹکڑے چھانٹ کے، نرم اور چربی والے۔

ساری چیزیں بالکل ٹھیک ٹھیک ھو گئی تھیں۔ ابتدائی اسکول کے بچوں کا اسکولی سال ختم ھونے والا تھا اس لئے انھیں بورڈنگ اسکول سے لانے کے لئے آندریوشکینو جانا تو ضروری ھی تھا۔ بوڑھے اوموکان نے خود ھی کہا کہ وہ یہ کام کر دیں گے۔ وہ آنکھ کے ڈاکٹر کے پاس اپنی عینک بدلوانے کے لئے جانا چاھتے تھے، ان کی پرانی عینک کمزور ھوگئی تھی۔

رخصت ھونے میں بڑا وقت لگا۔ بہت سے لوگ تھے اور سب کچھ نہ کچھ کہنا چاھتے تھے۔ البتہ کتوں نے، جتے جتے کھڑے ھوئے عاجز آکر، بےصبری سے بھونکنا، ادھر ادھر لپکنا اور اپنے ساج کو الجھانا شروع کر دیا۔ اوموکان نے انھیں مکے مار مار کر سیدھا کیا اور وہ ان کا حکم مان کر چپ ھوگئے۔

ایدوارد بےبسی سے اپنی ماں کو دیکھ رھا تھا جو مسلسل روئے جا رھی تھیں۔ ان کے آنسو کسی طرح تھمتے ھی نہ تھے۔ اس کے باپ ان کا کندھا تھپتھپا کر کچھ ھنسی مذاق سے انھیں بہلانے کی کوشش کر رھے تھے۔ انھوں نے اپنے سر سے بہار کے چشموں کی طرف اشارہ کیا جو شور مچاتے ڈھلان پر بہتے اولیرا کی طرف جا رھے تھے۔

''دیکھو بڑی بی، تمھاری آنکھوں نے چشمے بہا

ھونا چاھئے۔ اور اب تو خود نہ بہادر آدمی کی طرح بات کر رہا ہے نہ ذھین آدمی کی طرح۔ اور تیرے لئے ایسا کرنا بہت ضروری ھے۔ آخر وہ دوسری تو بہادر بھی ھے اور ذھین بھی۔،،

توردوخ میں چار لوگ تھے لیکن بس بیٹا اور ماں تھے جو سمجھ رھے تھے کہ یہ سب کیا ھے۔ باقی دو بس قیاس کر سکتے تھے۔ نکولائی سیدوررووچ کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا قیاس صحیح ھے۔ وہ کچھ کہنا چاھتے تھے لیکن ایدوارد قطعی انداز میں بول پڑا، ’’میں جاؤں گا۔،،

* * *

اس دن بلشایا اولیرا کے کنارے بڑی چہل پہل تھی۔ خانہ بدوشوں کے پڑاؤ کے سارے لوگ ایدوارد کو رخصت کرنے آئے تھے۔ بوڑھے اوسوکان کتوں کی ٹیموں کو دیکھ بھال رھے تھے۔ لگتا تھا کہ سفر مشکل ھوگا۔ برف پگھل چکی تھی اور گاڑی کو زمین پر چلنا ھوگا۔ اسی لئے دونوں کتا گاڑیوں میں تیئس تیئس کتے جوتے گئے تھے۔ کتا گاڑیوں کو بےنعل کر دیا گیا تھا یعنی ان کے لوھے کے پھٹے نکال دئے گئے تھے۔ گاڑیوں پر ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ باندھا جا چکا تھا۔

اس کی ماں نے سوٹ کیس میں قمیصیں، بنیائنیں، جوتے، اس کا سیاہ سوٹ اور ٹائی رکھ دیا تھا۔ وہ تو اپنے بیٹے کو سمور کا ایک کمبل بھی دینا چاھتی

یوکاگیر اور اس کی زبان سے روسی لفظ نکلیں گے لیکن ہمارے دل ایک ہی زبان سمجھیں گے اس لئے کہ ہم دونوں تم سے محبت کرتی ہیں۔"

اوسوکان نے ہانک لگائی اور کتوں نے زور بھرا۔ یوکاگیر، یاقوتیائی، چوکوتیائی اور روسی زبان میں وداعی کلمات گونجے۔

کتے انتظار کر رہے تھے اور تازہ دم تھے اس لئے پہیے وہ کالی زمین پر آسانی سے بڑھتے گئے۔ ان کا بوجھ بھی بھاری نہیں تھا — ہر گاڑی میں بس ایک آدمی۔

صبح کا ٹنڈرا دھوپ میں تازہ چہ بچے لئے ہوئے خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ برف کے تودوں پر بیٹھے ہوئے تیتروں نے کتوں کی ٹیمیں دیکھ کر بوکھلا کر اپنی گردنیں ادھر ادھر موڑیں۔ پھر نرتیتروں نے اپنی اپنی تیتریوں کو یقین دلانے کےلئے ہلکی آواز لگائی۔ انھوں نے بتا دیا کہ ڈرو مت، کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔

کتے جلد ہی تھک گئے اور ہانپتے ہوئے انھوں نے اپنی لال لال زبانیں باہر لٹکا لیں۔

ایدوارد نے مشورہ دیا، "چلئے جھیل پر چلیں اور برف پر گاڑیاں چلائیں۔"

وہ نہ بولتا تو اچھا رہتا۔ اوسوکان نے بڑبڑانا شروع کردیا۔

"ہوائی جہاز بڑی اچھی چیز ہیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں مگر اس بات کو سمجھتا ہوں۔ لیکن تم لوگ

دئیے اور جلد ھی یہ ذریا بن جائیں گے - ارے کچھ آنسو رکھ لو میری موت کے لئے - نہیں تو میں مروں گا تو پھر تم روؤگی کیسے؟،،

اس کی ماں اور بھی زوروں سے رونے لگیں - انھوں نے سسکیاں لیتے ھوئے کہا، ''تب تو میں کہیں کی نہ رھوں گی، اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو - بس جب میں مروں تو مجھے دفنا دینا پھر جو جی چاھے کرنا -،،

بوڑھے اوسوکان نے ماں سے ھمدردی کی، ''ارے تم کیوں بیٹے کو جانے دیتی ھو؟ ابھی گیا تو ھے نہیں - اب بھی کچھ نہیں بگڑا، روک لو !،،

اس پر اس کی ماں اوسوکان پر جھپٹ پڑیں، ''تم نے تو اپنی ساری زندگی رینڈیروں کی دم سے لگے لگے کاٹ دی اور کسی چیز کا کچھ پتہ ھی نہیں - مگر وہ نوجوان ھے، اس کے سامنے تو ابھی لمبا راستہ ھے - تم چاھتے ھو کہ وہ بھی ھمیشہ بس رینڈیروں کا گلہ بان رھے - میں تو یہ نہیں ھونے دوں گی -،،

انھوں نے فیصلہ کن انداز میں اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور اپنا لمبا پائپ سلگا لیا -

پھر سچ مچ جانے کا وقت ھوگیا - ایدوارد پہلے اپنے باپ کے گلے سے لگا اور دستور کے مطابق انھیں پیشانی پر بوسہ دیا، پھر ٹھوڑی پر، پھر دائیں گال پر اور آخر میں بائیں گال پر - اس کی ماں نے دستور کے خلاف اسے سینے سے بھینچ لیا اور کان میں آھستہ سے کہا :

''بیٹے، تو اس لڑکی کو آنے دے - میری زبان سے

کتوں کی ٹیموں نے گاڑی‌بانوں کے ڈنڈے کا اشارہ سمجھتے ہوئے جھیل سے پچھم کی طرف ہٹ کر ایک سوگیل (اونچا ٹیلا) پر چڑھنا شروع کر دیا۔ کتوں کو بڑی محنت پڑ رہی تھی۔ اوسوکان اور ایدوارد گاڑیوں سے نیچے کود آئے اور کتوں کے برابر برابر چلنے لگے۔ انبائی پہاڑی سلسلہ کافی دیر سے نظر آ رہا تھا لیکن نہ پاس آتا تھا نہ دور ہوتا تھا، بس انہیں آگے ہی بڑھنے کی ترغیب دیتا رہتا تھا، وہ مغربی افق پر پھیلا ہوا سر بلند نیلگوں پہاڑی سلسلہ۔ جھیل اولیرا ان کے پیچھے تھی، ایک بہت بڑی وادی پر پوری طرح چھائی ہوئی، اس ک دوسری طرف والا سرا ایک مہین دھاگے کی طرح بس ذرا ذرا دکھائی دیتا تھا۔

اوسوکان پھر چپ ہو گئے تھے۔ ایدوارد نے بھی منہ بند ہی رکھا۔ ان کے سروں کے اوپر بالکل نیچے اڑتی ہوئی بطخوں کی ایک ڈار نکل گئی۔ ان کے ڈینوں کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

بطخیں ہر طرف نظر آ رہی تھیں۔ وہ ساری چھوٹی جھیلوں پر جن پر برف پگھل چکی تھی، اور کناروں پر بھی چھائی ہوئی تھیں۔ ٹنڈرا میں بہار آنے ہی والی تھی۔

اوسوکان نے اچانک کہا، ”دیکھو وہ ہے یدوما، سفید سفید جگمگ کر رہی ہے۔ ایک زمانے میں یہاں یوکاگیر لوگوں کا ایک پڑاؤ تھا، بہت بڑا پڑاؤ۔ تب میں جوان تھا اور بوڑھے لوگ یہ کہانی سنایا کرتے تھے کہ ایک بار ایک سفید کوا پڑاؤ کے اوپر

آج کل بغیر کسی فکر پریشانی کے رہنے لگے ہو۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ لئے، اڑ گئے، پائلٹ تو اپنا کام جانتا ہی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ہوائی جہاز کیسے اڑایا جاتا ہے۔ اور تم اپنا کام بھی نہیں جانتے۔ کیا تمھیں پتہ نہیں ہے کہ بےنعل کی کتاگاڑی کو برف پر نہیں چلایا جا سکتا؟ لکڑی کے تختے چوپٹ ہوجائیں گے! پرانے زمانے میں لوگ کہتے تھے کہ بیکار آدمی تب تک جیسے جاتا ہے جب تک اس کا آخری بال بھی گر نہیں جاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں تھی۔ بوڑھے اوسوکان کے سر پر بال چاہے زیادہ نہ ہوں لیکن ابھی تک وہ کام کا آدمی ہے۔ تم نوجوانوں کو اگر ہم بوڑھے لوگ نہ سکھائیں گے تو کون سکھائے گا۔ نہیں تو تم لوگ ٹنڈرا کو بھی بھول جاؤ گے حالانکہ رہتے اسی میں ہو۔،،

ایدوارد نے بوڑھے آدمی کی بات بیدلی سے تھوڑا بہت سنتے ہوئے سوچا، ٹنڈرا۔ ٹنڈرا کے بارے میں اس نے تانیا سے کتنی دفعہ بات کی تھی! اسی پہلے ہی دن سے جب ان کا کمسومول بریگیڈ زراعتی کالج کے کمسومول طالب علموں کو ہوسٹل بنانے میں مدد دینے کے لئے آیا تھا۔ لیکن کیا کوئی ٹنڈرا کو سچ مچ بیان کر سکتا ہے؟ تانیا کہتی تھی وہ سمجھتی ہے۔ پھر بھی کیا وہ کبھی اس کے آبائی علاقے سے محبت کرنے لگے گی؟ اس نے تانیا کو ٹنڈرا سے محبت کرنا سکھا دیا ہوتا۔ شاید اچھا یہی ہوتا کہ وہ نہ جاتا؟

سے ملنا تھا اور ایک اور بہت ضروری کام کرنا تھا۔
اسے بورڈنگ اسکول نہیں جانا پڑا۔ کسی نے اس کی
بہن کو پہلے ھی خبر کر دی تھی کہ اس کا
بھائی پہنچ گیا ھے اور مارینا خود ھی بھاگتی ھوئی
گاؤں سوویت میں پہنچ گئی۔ وہ بڑی خوبصورت نکل
آئی تھی اور اس کی آنکھوں کی سیاہ چمک اور دانتوں
کی سفیدی نے اس کے خدوخال کو نکھار دیا تھا۔
اس نے ایدوارد کو پیار کیا اور پھر اتنی زور سے کہ
ساری بستی میں اس کی آواز سنائی دے جائے اس نے
پکار کر کہا کہ ساری لڑکیاں تو بہت ھی بوکھلائی
ھوئی ھیں۔ پھر اس نے ایدوارد کو ایک بار اور پیار
کیا اور کسی امتحان میں شریک ھونے کےلئے بھاگ
گئی۔ اس کی زندگی بھائی کے بغیر بھی بھری پری تھی۔
ایدوارد ڈاک خانے گیا۔خط پہنچنے میں تو بڑی
دیر لگےگی، اسے تار بھیجنا پڑےگا۔ اور تار میں
کوئی بھلا بہت سی باتیں کیسے کہہ سکتا ھے؟ پھر
بھی وہ تار کا مضمون بنانے کےلئے بیٹھ گیا۔ کیا وہ
تانیا سے کہے کہ وہ ابھی چیتہ میں رکے اور اس کا
کورس ختم ھونے تک انتظار کرے؟ یہ وہ نہیں کہنا
چاھتا تھا۔ ویسے تو ٹنڈرا کے مقابلے میں چیتہ اومسک
سے قریب ھے لیکن اگر تانیا ٹنڈرا میں اس کا انتظار
کرے تو بالکل ایسا لگےگا جیسے وہ اس سے زیادہ
قریب ھے۔ لیکن اسے یہ مشورہ دینا بھی ناممکن تھا۔
وہ تو ایدوارد کے پاس آ رھی تھی اور ایدوارد چلا جا
رھا تھا۔

اڑا اور جب تک میں وہ دوسرے سرے پر نکلا تب تک میں چولھوں کے دھوئیں سے کالا ہوچکا تھا۔ اتنے توردوخ تھے وہاں! اور پھر ایک بھیانک بیماری پھیلی اور لوگ مرنے لگے۔ پڑاؤ میں ایک بھی آدمی نہ بچا۔ اب آج کل ایسی بات نہیں ہو سکتی۔،، اوسوکان زور سے ہنس پڑے اور ان کی تنگ آنکھیں بھنچ کر ہلکی سی درز کی طرح رہ گئیں۔

''ارررر... ہوائی جہاز اڑ اڑ کر ہر صرف سے آئیں گے، ہیلی کاپٹر، ڈاکٹر لائے جائیں گے اور ایک بھی یوکاگیر کو مرنے نہ دیا جائے گا۔،،

بوڑھے اوسوکان دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ پھر انھوں نے اچانک اپنے آپ کو سنبھالا اور پچھڑنے والے کتوں کو زور سے ڈانٹا۔

* * *

وہ صبح تک بڑے اطمینان سے آندریوشکینو پہنچ گئے۔ گاؤں سوویت کام کر رہی تھی اور ریاستی فارم کا دفتر کھلا تھا۔ ایدوارد نے جلدی جلدی اپنے کاغذات ٹھیک کروا لئے۔ وہاں ہر شخص کو پہلے ہی سے اس کے منصوبوں کے بارے میں پتہ تھا۔ اسے اطلاع دی گئی کہ ڈاک والا ہیلی کاپٹر انجن میں کچھ جرابی ہو جانے کی وجہ سے دیر میں آئے گا، شام تک یہاں پہنچے گا اور اگلی صبح کو واپس جائے گا۔

ایدوارد کو اب اس پورے لمبے فرصت کے دن میں صرف دو کام اور کرنے تھے — اپنی چھوٹی بہن مارینا

ایدوارد کی طرف پھینکیں اور کھڑکی دھڑام سے بند کر دی۔

ایدوارد بھاگ کر گاؤں سوویت میں پہنچا، وہاں سے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور لپکتا ہوا گاؤں کے سرے کی طرف بھاگا جہاں ہیلی کاپٹر اترا تھا۔

آنےوالی ڈاک کی وصولی اور جانےوالی ڈاک کی سپردگی میں کل بیس منٹ لگے۔

ہیلی کاپٹر کا دریچه بند ہو گیا۔ پنکھے گھومنے لگے، رفته رفته تیز ہوتے گئے یہاں تک که بس ایک زناتا ہوا سیاہ دائرہ بن گیا۔ ہیلی کاپٹر نے ایک ہلکورا لیا اور زمین سے اوپر اٹھ گیا۔

ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کرنےوالی ڈاک خانے کی لڑکیاں ہیلی کاپٹر کے نیچے غائب ہوگئیں اور ساری بستی نظر آنے لگی۔ اس کے مکانات، ایک ستھرے منصوبے کے مطابق بنے ہوئے، دیاسلائی کی ڈبیوں کی طرح لگ رہے تھے اور الازئیا ندی ایک سفید فیتے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

ایدوارد کو یه احساس ہوا که اسے نیچے دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ اس کو تعجب ہوا اس لئے که یه کوئی پہلی بار تو وہ پرواز نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس کی سمجھ میں آگیا۔ پہلے وہ ہوائی جہاز میں پرواز کر رہا تھا اور آدمی کھڑکی سے جتنا چاہے باہر دیکھے پنکھ ہمیشه دکھائی دیتے تھے جن پر آنکھیں ٹک سکتی تھیں۔ ہیلی کاپٹر میں پنکھ تو

ایدوارد نے تار کے فارموں کا پورا ایک ڈھیر خراب کیا۔ ڈاک خانے والی لڑکی اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی لیکن ایدوارد نے ہار نہیں مانی۔ ایک اور خراب شدہ فارم کو پھاڑ کر پھینک دیتا اور جا کر دوسرا فارم مانگ لاتا۔

اچانک دور سے ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

''کاتیا!'' ڈاک خانے والی لڑکی نے پچھلے کمرے کی طرف پکار کر کہا۔ ''سن رہی ہو، ہیلی کاپٹر آگیا۔ دوڑ کے جاؤ اور ڈاک لے لو۔ میں اب یہاں بند کرتی ہوں اور بھیجنے والی ڈاک تیار کرتی ہوں۔''

ہیلی کاپٹر پہنچ گیا تھا۔ ڈاک خانہ بند ہونے والا تھا۔ ایدوارد نے سوچنا بند کر دیا اور لکھا:

''اوسسک جا رہا ہوں ایک سال کا مشین بندی کا کورس کرنے تار سے اپنے منصوبے کی اطلاع دو۔''

اور اپنے پتے کے طور پر اس نے ضلع کے صدر مقام کا پتہ لکھ دیا۔

ڈاک خانے والی لڑکی نے بڑے تجسس کے ساتھ اس کا فارم لیا اور پنسل کی مشاق کھٹا کھٹ سے الفاظ گنے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ناخوش ہے۔

وہ بڑبڑائی، ''لکھے تو جا رہا تھا فارم پر فارم۔ میں سوچ رہی تھی کچھ محبت کی بات ہوگی اور بات بس اتنی ہے کہ کورس کے لئے جا رہا ہے! لو اور دیکھو!''

اسی ناخوشی کے انداز سے اس نے رسید اور ریزکاری

نہ چلا اور وہ سو گیا اور ایسا سویا کہ تب آنکھ کھلی جب ہیلی کاپٹر دھپ سے ہوائی اڈے کی سخت زمین پر لگا ۔

یہ معلوم کرکے کہ اس کا ہوائی جہاز دو گھنٹے بعد جائے گا ایدوارد ایک ہری بس میں پائلٹوں کے ساتھ بستی میں چلا گیا ۔ وہ کمسومول ضلع کمیٹی کے دفتر گیا اور ظاہر ہے کہ ڈاک خانے ۔ اس کے لئے کوئی تار نہیں تھا ۔ ہو سکتا ہے جب تار پہنچا ہو تو تانیا گھر پر نہ رہی ہو ۔ یا ہو سکتا ہے وہ خفا ہو گئی ہو ۔ ایدوارد کا جی اداس ہو گیا ۔

وہ اسی ہری بس میں دوسرے مسافروں کے ساتھ ہوائی اڈے واپس آ گیا ۔

جلد ہی ہوائی جہاز پر سوار ہونے کا وقت آ گیا ۔ پہلے عملے کے لوگ جہاز میں داخل ہوئے اور پھر مسافر ۔ زینہ ہٹایا جانے ہی والا تھا کہ ہوائی اڈے کا مینجر بھاگتا ہوا بلڈنگ میں سے نکلا اور جہاز کی طرف لپکا ۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید کاغذ تھا جسے وہ سر سے اوپر اٹھائے ہوئے تھا ۔ عملے کا ایک رکن آگے بڑھ کر اس سے ملا ۔ جلد ہی وہ سفید کاغذ لئے ہوئے واپس آ گیا ۔

”مسافر تریتیاکوف یہاں ہیں؟“ ایدوارد فوراً کھڑا ہو گیا ۔

”ڈاک خانے نے آپ کے لئے ایک تار ہوائی اڈے پر پہنچایا ہے ۔ آپ کو اس کا انتظار تھا؟“

”ایسا ویسا انتظار تھا!“

ہوتے نہیں اور آدمی ہوا میں ٹنگا ہوتا ہے۔ بس یہ ہے ساری بات۔

جھیل یوخون مواول (جس کے معنی یاقوت زبان میں ہوتے ہیں، پڑاؤ کی جگہ) ہیلی کاپٹر کے نیچے سے گزر چکی تھی۔ ایک زمانے میں یاقوت لوگ یہاں مچھلیاں پکڑتے تھے اور بہار کی رات کے بعد مچھلیوں کے ڈھیر لےکر آتے تھے۔ اس جھیل نے جنگ کے زمانے میں بہتوں کی جان بچائی ہے۔ دن بھر جانفشاں محنت کرنے کے بعد اجتماعی کسان اپنے بھوکے بال بچوں کےلئے مچھلیاں پکڑنے کے واسطے رات یہاں بسر کرتے تھے۔

ایدوارد ان یادوں میں گم تھا اور ہیلی کاپٹر کے نیچے خالارچا کا چوکوت ٹنڈرا تیرتا ہوا گزر رہا تھا۔ ایدوارد کو ایک بار جب رینڈیروں کے گلہ بانوں کے اجتماع میں شرکت کےلئے کولیشیک بھیجا گیا تھا تب اس نے اس ٹنڈرا کو رینڈیروں پر پار کیا تھا۔ اسے بہت سی نشانیاں یاد تھیں جنھیں اب اوپر سے دیکھ کر اور پہچان کر خوشی ہوتی تھی۔ مثلاً وہ ادھر سیمیویے پہاڑی نظر آ رہی تھی جس کا نام شاید روسی لفظ ”زیموویے“ (جاڑوں کا پڑاؤ) سے بنا تھا۔ اُس اجاڑ ٹنڈرا میں کس نے پڑاؤ کیا تھا، کب اور کس لئے، کچھ پتہ نہیں لیکن لفظ زندہ ہے اور خود ان پراسرار لوگوں کی یاددھانی کراتا رہتا ہے۔

آگے کا علاقہ ایدوارد کےلئے بالکل نیا تھا۔ وہ چھتیس گھنٹوں سے نہیں سویا تھا چنانچہ اسے پتہ بھی

انور بیکچنتائیف

آسیه
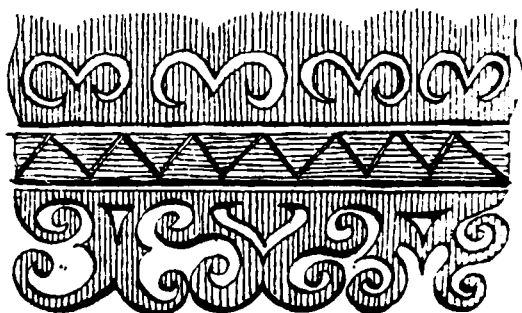
''اچھی طرح پڑھنا تمھارے والدین کے پاس پہنچ رہی ہوں بیٹی کی طرح رہنے کی کوشش کروں‌گی ہم ٹنڈرا ہی میں ملیں‌گے۔،،

یہ تھی تانیا — بہادر اور ذہین۔ اور نیک۔ ان میں واقعی سچی محبت تھی۔

جہاز اڑان بھرنے کی سڑک پر آگیا، انجن زوروں میں چلے، رفتار بڑھتی گئی اور وہ ہوا میں بلند ہوگیا۔

الوداع، شمالی وادیو اور نیچی پہاڑیو، الوداع جھیلو، الوداع نرم پروں‌والی بطخو — اس سال میں تمھارے شکار کو نہیں جا سکا — الوداع ماں اور بابا، الوداع تانیا! اگلے سال ہم ٹنڈرا ہی میں ملیں‌گے!

سوچا بھی نہیں جاتا۔ کبھی کبھار ایسی جھلسا دینےوالی گرمی پڑتی ہے کہ آپ نے اچھے خاصے پھول دیکھے اور گھنٹے بھر میں پھر جو نظر پڑی تو معلوم ہوا جیسے انھیں آگ کی لپٹ لگ گئی ہو۔ گرم ہوا سے منہ تپنے لگتا ہے اور حلق سوکھ جاتا ہے۔

ایسے وقت میں ہر شخص کو ٹھنڈک کی یاد اپنی اپنی طرح سے آتی ہے۔

غنی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، ''تمھیں کواس* کی وہ دکان یاد ہے جو سرکاری خرید کے دفتر کے سامنے ہے۔ مانو چاہے نہ مانو لیکن میں تو اگر اس وقت وہاں پہنچ جاؤں تو ایک سانس میں پانچ چھ ٹمبلر پی جاؤں اور پلک تک نہ جھپکاؤں!،،

''میں تو یہ کہوں گا کہ ٹھنڈی آئیران** ایسی گرمی میں سب سے اچھی رہےگی، برف پڑی ہوئی ہو یا پھر کنویں کے پانی میں بنائی گئی ہو!،،

''ارے اب ایسا ہی ہے تو میں ایک پیالہ چائے بھی پی سکتا ہوں، بغیر دودھ یا چینی کے، مگر چائے خوب گہری اور گرم ہو کہ ہونٹ جل جائیں اور سڑپا لگانا پڑے!،،

اپنی گدی کے نیچے میں نے محسوس کیا کہ دور

---

* کالے گیہوں کی روٹی سے بنایا جانےوالا مشروب۔ ایڈیٹر

** دودھ کو کھٹا کرکے بنایا جانےوالا ایک مقامی مشروب۔ ایڈیٹر

— ۱ —

''دکھائی پڑا کوئی؟''

''نہیں، کوئی بھی نہیں۔''

''سڑک بالکل خالی ہے؟''

''بالکل خالی ہے، کھانا لگنے سے پہلے دسترخوان کی طرح!''

''تاحد نظر؟''

''بالکل!''

''تو میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اور دن بیکار گیا!''

میرے دوست غنی نے غصے سے زمین پر تھوکا۔ اسے ہر وقت بال کی کھال نکالنے کی پڑی رہتی ہے اور وہ بڑا بےصبر ہے۔ اور مجھ میں بڑا تحمل ہے۔ میں اس کے سوالوں سے عاجز آجاتا ہوں۔ میں تو اسی طرح سڑک کنارے ہفتے بھر پڑا رہ سکتا ہوں۔ بڑے مزے سے!

بس ایک ہی تکلیف دہ چیز ہے کہ دھوپ سے بچنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اینٹوں کے چٹوں اور اوندھی سیدھی پڑی بلیوں کی ٹال کی آڑ میں اتنا سایہ نہیں ہوتا کہ آدمی پڑ رہے! اور تار کے کھمبے کی پرچھائیں کو تو سایہ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ ایک پیڑ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ بس چٹیل استیپ ہے۔

اور گرمی بھی ایسی ہے کہ اس کے بارے میں

11*

لگے - اور بالکل آخری لمحے میں جب یہ لگ رہا تھا
کہ اب یہ زمین پر گر پڑیں گی تو وہ دونوں ایک دوسرے
سے الگ ہو گئیں اور پھر دھیرے دھیرے ہوا میں
بلند ہونے لگیں - وہ آسمان کی چھت کے بالکل نیچے ہی
اڑنے کو ترجیح دیتی تھیں — وہاں ان کے لئے زیادہ
جگہ تھی! اور وہ ناقابل یقین خونخواری کے ساتھ لڑتی
تھیں! لیکن کیوں؟ کیا وہ سچ مچ آسمان کے حصے نہیں
کر پاتی تھیں؟ جی چاھتا تھا ان سے چلا کر کہوں،
''ارے تم بیوقوف پرندو، بس کرو! آسمان کے حصے بخرے
کرنے کی کوشش نہ کرو - وہاں اوپر تو سب کے لئے
جگہ ہے! ارے اتنی جگہ ہے کہ دیکھ کر ہوش اڑ
جاتے ہیں!،،

کچھ آدمی بھی ایسے ہوتے ہیں جو انھیں حریص
پرندوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں - ہمیشہ
بھاگم بھاگ میں رہتے ہیں، خود دم لینے کو رکتے
ہیں نہ دوسروں کو رکنے دیتے ہیں - میں قسم سے
کہتا ہوں یہ بڑی بیوقوفی کی بات ہے آخری وقت تک
بھاگتے ہی رہنا!

میری رائے میں اس زندگی میں خوش رہنا بہت آسان
ہے - آدمی کو اپنے سامنے سادہ اور آسان فریضے رکھنے
چاھئیں جنھیں انجام دیا جا سکتا ہو — یہی بہت سی
خوشیوں کا راز ہے - کسی بڑے مقصد کے حاصل نہ
ہونے کا دکھ اٹھاتے رہنے کے مقابلے میں چھوٹی کامیابیوں
پر مطمئن رہنا بہتر ہے...

غنی نے اپنے خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے کہا، ''اگر

کہیں زمین تھرتھرا رہی ہے۔ کوئی ٹرک ہوگی۔ آواز تیز ہوگئی اور اب اس کی تھرتھراہٹ مجھے اپنی پوری ریڑھ میں محسوس ہونے لگی۔ شاید ہمارے فورمین یہ ٹرک لےکر واپس آرہے ہیں؟ کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھ کر میں نے دیکھا۔ ٹرک زناتی ہوئی نکل گئی، ساٹھ یا ہو سکتا ہے ستر کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے۔ میں پھر سے لیٹ گیا اور اپنی نگاہوں سے حد نظر تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔

لمحے بھر کو حیرت انگیز سناٹا ہوگیا اور ایسا لگا جیسے پوری کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ یہ بس ایک گزراں احساس تھا۔ آدمی سنے تو ہزاروں مختلف آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں، بھانت بھانت کے گیت اور چیخیں، چڑیوں کی چہچہاہٹیں اور قیں قاں۔ پورا استیپ اپنے مخصوص خفیہ شارٹ ویوبینڈ پر اپنی خبریں بھیجتا رہتا ہے۔

دو چیلیں ٹھیک میرے سر کے اوپر آسمان میں چکر لگا رہی تھیں۔ شاید گرمی سے پاگل ہو رہی تھیں جو ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں اور لڑنے لگیں! کیا چاہتی تھیں وہ؟ انھیں کس چیز کے حصے بخرے کرنے تھے؟

میں پہلی بار چیلوں کو لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان مضبوط شکاری پرندوں نے خاموشی سے ایک دوسرے پر وار کئے، نہ درد کی چیخیں نکالیں نہ جنگی چنگھاڑیں لگائیں۔ ایک دوسرے سے گتھ کر وہ ایک گیند کی طرح نیچے گرنے لگیں۔ ان کے سیاہ پر ادھر ادھر بکھرنے

علاج کا ایک بڑا سینی ٹوریم تعمیر کریں گے ۔ لیکن ابھی تو ہم یہاں اکیلے ہیں... پروجکٹ کی تعمیر کے لئے سارا اینٹ مسالا اور سارا ساز و سامان دو دن پہلے یہاں پہنچا دیا گیا تھا ۔ بس ایک چوک ہو گئی ۔ ان لوگوں نے نیو نہیں کھودی ۔ چنانچہ اب ہم مزے سے دھوپ سینک رہے ہیں اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

ہمارے اناؤلے فورمین ابوبکر ایشمورزین اس انتظار میں بیٹھے نہیں رہے کہ کھدائی مشین آئے تو کام شروع ہو ۔ وہ ادھر جاتی ہوئی ایک ٹرک میں بیٹھ کر ہمہ وین کوسیٹر تک گئے ہیں جہاں ایک اور سروس اسٹیشن تعمیر کیا جا رہا ہے ۔ وہ گئے اور بس غائب ہو گئے ۔ خود لوٹ کر آئے نہ کھدائی مشین ہی آئی ۔

ہم اپنی ٹیم میں چار آدمی ہیں ۔ ابھی ٹیم پوری ہونے میں ایک کی کمی ہے ۔ محکمۂ تعمیرات نے، جس کے ماتحت ہم کام کرتے ہیں، پانچواں نفر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے ۔ اگر بھول نہ گئے تو بھیج دیں گے ۔ بھول گئے تو ہم چار ہی کسی نہ کسی طرح بس سروس اسٹیشن تعمیر کر لیں گے ۔ ہمارے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔

ہمارے فورمین ابوبکر چوڑے کندھے، میانہ قد اور چکنی چمکتی ناک والے آدمی ہیں ۔ وہ ان سپاہیوں میں ہیں جنھیں فوج سے جلد ہی سبکدوشی مل گئی ۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ انھیں تو فوج ہی میں رکھنا چاہئے تھا اور کچھ نہیں تو اسی لئے کہ انھیں سب کچھ

منمگن ہوتا تو میں ہوا کے دوش پر اس سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا جاتا ۔ مطلب یہ کہ اس کو بنا چکنے کے بعد ۔،،

عجیب آدمی ہے یہ بھی! آخر کیوں یہ اس طرح کی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے؟ ایک میں ہوں کہ میرے سر میں کبھی سفر کرنے کا خیال بھی نہ آئے گا ۔ مجھے افق کے اس پار دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

فورمین نے کہا، ''ہماری سڑک تو مغرب میں دور کہیں دو ہزار کلومیٹر ادھر سے شروع ہوتی ہے اور پھر اس طرف مشرق میں کوئی دس ہزار کلومیٹر تک جاتی ہے ۔ اتنی لمبی ہے یہ سڑک!،،

مجھے پتہ نہیں کہ دوسری ٹیمیں کیسا کام کر رہی ہیں لیکن ہمارے حصے کی سڑک پر تو گاڑیوں کی آمدورفت شروع ہو چکی ہے حالانکہ سڑک ابھی سرکاری طور پر کھلی نہیں ہے ۔ ڈرائیوروں کو کشادہ سڑک استعمال کرنے کی جلدی ہے اس لئے کہ گڈھوں بھرے راستے میں جھنجوڑے جانا اور دھول کے بادلوں سے اٹ جانا تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا ۔

دراصل ہم سڑک بنانے کا کام نہیں کرتے، ہم تو معمار ہیں اور ۱۸۳ ویں کلومیٹر پر ایک بس سروس اسٹیشن تعمیر کر رہے ہیں ۔ ہمارے بعد دوسرے معمار آئیں گے اور جھیل کے کنارے کومیس* سے

---

* گھوڑی کے دودھ سے بنایا جانے والا ایک مشروب۔ ایڈیٹر

هیں ۔ اس کے هاتھ بھی لمبے هیں بلکه ناخن بھی لمبے لمبے هیں اور وہ انھیں جان کر بڑھاتا بھی هے ۔ همارے فورمین کو وہ ایک آنکھ نه بھایا ۔

ابوبکر نے اس کی نوکیلی ناک کو گھورتے هوئے پوچھا، ''تمھاری قومیت کیا هے؟،،

ژیگن نے ذرا بھی گھبرائے بغیر آنکھ ماری ۔

''جو میں نہیں جانتا، چیف، وہ میں کیسے بتا سکتا هوں ۔ هاں اگر کوئی فارم بھرنے کا معامله هے تو بڑا بڑا لکھ دیجئے که میری رگوں میں سات قوموں کے خون کا ایک عظیم مرکب رواں دواں هے ۔،،

ابوبکر قاعدے اور ترتیب کے پکے پجاری، وہ اس طرح کے جواب سے بالکل مطمئن نہیں هوئے ۔ ژیگن کو اگر محکمے نے نه بھیجا هوتا تو آپ یقین کیجئے که وہ اسے پاس بھی نه پھٹکنے دیتے ۔ لیکن محکمے کے حکم کی خلاف‌ورزی تو نہیں کی جا سکتی ۔ اس لئے ابوبکر نے بس ایک سوال اور پوچھا :

''تم نے اپنا پیشه همیشه کےلئے چھوڑ دیا هے یا بس کچھ دنوں کےلئے کوئی دوسرا کام کر لینے کا اراده هے؟،،

ژیگن نے جواب دیا، ''همیشه همیشه کےلئے ۔ میں اس کے سر کی قسم کھا کر کہتا هوں...،،

''اپنی بیوی کے سر کی؟،،

''نہیں ۔ ،،

''داشته؟،،

''محبوبه...،،

ٹھیک ٹھاک رکھنے کا بڑا شوق ہے۔ ان کی رگ رگ میں ڈسپلن رچی بسی ہوئی ہے! اگر انہیں موقع ملے تو میں سچ کہتا ہوں کہ ہماری ٹیم پر آہنی ڈسپلن مسلط کر دیں۔ ان کی اس کمزوری کو جانتے ہوئے ہم ان کی بات کے جواب میں اکثر کہتے ہیں :

''جی، کامریڈ لانس کارپورل!''

''جو حکم، کامریڈ لانس کارپورل!''

''آپ فکر نہ کریں، کامریڈ لانس کارپورل، ہم کام چلا لیں گے!''

ہمارا تو اس میں کچھ لگتا نہیں اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

ژیگن کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتانے کی ضرورت ہے۔ وہ جیل سے چھوٹ کر سیدھے ہماری ٹیم میں آیا تھا۔

ٹیم میں شامل ہوتے وقت اس نے اپنا تعارف کرایا، ''پیشے کے اعتبار سے میں چور ہوں۔ دو بار جیل کاٹ چکا ہوں۔ اب مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے۔ مجھ میں کوئی اور خوبی نہیں ہے۔ جو نہیں ہے سو نہیں ہے...''

ہمیں پہلے کبھی اس طرح کے آدمی کے ساتھ کام نہیں کرنا پڑا تھا اور اس لئے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے ساتھ کیسے پیش آئیں۔ ہر روز آنکھ کھلتے ہی ہم اپنی جیبیں دیکھتے ہیں لیکن ابھی تک تو کسی کی کوئی چیز نہیں گئی۔

ژیگن کے بال بڑے فیشن ایبل نوجوانوں جیسے لمبے

اکیلے کھیلنے میں ژیگن اکثر چراغ پا ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے خیالی مقابل سے کہہ رہا ہے، ''چیف، اگر آپ نے پتا چل دیا ہے تو چیف، اب بس کیجئے اور پتے کو جہاں ہے وہیں پڑا رہنے دیجئے۔ اب پان کے بادشاہ چلئے، سنا نہ آپ نے! چلئے چیف، چلئے۔''

مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ جیل میں اس کے ساتھ کھیلنے والے سب کے سب پتےباز تھے پکے اور ژیگن نے ابھی تک ان کو بخشا نہیں ہے۔

شروع شروع میں اس کی حرکتیں ہمیں عجیب لگتی تھیں لیکن اب ہم ان کے عادی ہوگئے ہیں اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔

غنی اور ولی (یعنی میں) دونوں ایک ہی ضلع کے رہنے والے ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان میں بیٹھے اور جیسا کہ ہوتا ہے دونوں فیل ہو گئے، بس ایک ایک نمبر سے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ میں تو شروع ہی سے نہیں سمجھتا تھا کہ مجھے کافی اچھے نمبر ملیں گے۔ لیکن یہ بات میں نے اپنے دوست سے نہیں کہی تھی اس لئے کہ وہ ہر بات کو جی سے لگا لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ امتحان میں ناکامیاب ہونے کے بعد آدمی کو اپنے اطراف میں واپس جاتے شرم آتی ہے۔ چنانچہ ہم معمار بن گئے — اب تو اس پیشے کو خاصی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دل کھول کر بات کرنے کے لمحوں میں غنی کبھی

''وہ اوفا ھی میں رہ گئی؟''

''اب میں کیا جانوں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ھے؟''

''بات یہ ھے، چیف کہ میں تو جانتا بھی نہیں کہ وہ کون ھے۔ ھو سکتا ھے وہ خوبصورت ھو، اور ھونے کو یہ بھی ھو سکتا ھے کہ خوبصورت نہ ھو۔ کالے بالوں‌والی ھے یا سنہرے بالوں‌والی، یہ بھی میں نہیں جانتا۔ بات یہ ھے، چیف کہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔ لیکن اس بات کا مجھے یقین ھے کہ اس دنیا میں کہیں نہ کہیں وہ میری عورت موجود ھے۔ مجھے یقین ھے کہ میری اینٹ کی بیگم ھے ضرور۔''

یہ ژیگن ہر اعتبار سے عجیب آدمی ھے۔

باتیں کرنا تو جانتا ھی نہیں، ھفتوں اس طرح چپ رہ سکتا ھے کہ اس کے ھونٹوں سے ایک بھی اچھا یا برا لفظ نہ نکلے۔ کام میں البتہ بالکل جنگلی جانور تھا۔ کوئی بھی اس سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ مگر پالی ختم ھونے کے بعد وہ فرصت کا سارا وقت تاش کھیلنے میں صرف کرتا ھے یعنی اگر سو نہ رہا ھو تو۔

اس وقت وہ تار کے کھمبے کی آڑ میں بیٹھا ھوا ھے، دنیا سے بیگانہ، اور اپنے ھی مقابلے میں تاش کھیل رہا ھے۔ غنی اور میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لئے کہ ''اسنورٹ'' کھیلنا ھم جانتے نہیں اور ''فولس'' یا ''سکسٹی سکس'' کھیلنے میں زیادہ خیال یہ ھے کہ وہ بالکل اوب جائے گا!

ھیں کہ جب کوئی پکارتا ھے ''اے، غنی ولی!،، تو ھم دونوں مڑ کر دیکھتے ھیں۔

یہ دوسرا بس سروس اسٹیشن ھے جو ھم تعمیر کر رھے ھیں۔ پہلا والا ھم نے ٥ ویں کلومیٹر پر ٹھیک تین ھفتے میں بنا دیا تھا۔ یہی ھم نے یہاں بھی کرنے کی ٹھانی تھی لیکن خواہ‌مخواہ ھمارا ایک دن ضائع ھو گیا۔

میں ابھی کروٹ لے کر ذرا چین سے لیٹا ھی تھا کہ غنی نے سوال کردیا:

''اب بھی کچھ نہیں نظر آتا؟،،

''میں تمہیں بتا چکا ھوں کہ نہیں!،،

اس کے ھر وقت کے سوالوں سے میں تنگ آچکا ھوں۔

میں نے جھنجلا کر کہا، ''تم نے کیا مجھے سڑک پر نظر رکھنے کےلئے ملازم رکھا ھے؟ نہیں انتظار کیا جاتا تو اٹھو اور خود ھی سڑک پر نظریں گاڑ دو۔،،

— ۲ —

تقریباً شام ھو چلی تھی جب ایک لال بس، جس کے پہلوؤں پر پیلی پٹی تھی، ھمارے پاس آ کر اچانک رک گئی۔ پرانی طرز کی ۳۲ سیٹوں‌والی لاری تھی۔ میں‌نے دل ھی دل میں سوچا، ''کیا ھمارے فورمین واپس آگئے؟ جو کچھ چاھئے تھا وہ بالآخر انھوں نے حاصل ھی کر لیا!،،

کبھی وھی ایک راگ الاپے جاتا ھے۔ وہ کہتا ھے دیکھو، دو سال ھم لوگ معماری کا کام کریں گے، ھماری خدمت کی مدت کافی ھو جائے گی اور ھم پھر یونیورسٹی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ وہ لوگ کام کرنے والے آدمی کو داخلہ دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسے اپنے اوپر بڑا اعتماد ھے۔ مجھے نہیں ھے۔ ذھنی طور پر میں یونیورسٹی کو خدا حافظ کہہ چکا ھوں۔ آخر کوئی ایسا قانون تو ھے نہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم ضرور ھی حاصل کرنی چاھئے! میری رائے میں ایسے لوگ بھی اس زندگی میں ضرور ھونے چاھئیں جو جانتے ھوں کہ گھوڑوں کو چارا کیسے کھلایا جاتا ھے (جہاں کا میں رھنے والا ھوں وھاں سیدھے سادے لوگوں کے بارے میں یہی کہا جاتا ھے)۔ بہرصورت تعلیم کے بغیر بھی آدمی اپنی روزی تو کما ھی سکتا ھے۔ میں نے سنا ھے کہ کچھ انجینیر ھیں جو اوفا میں معمولی سی تنخواہ کے لئے کرسیاں توڑتے ھیں۔ اور میں اگر چاھوں تو ڈھیروں روپیہ کما سکتا ھوں، انجینیر نہیں ھوں تو کیا ھوا۔

اب لگے ھاتھ اپنے لوگوں کی نئی عرفیت بھی بتا دوں۔ غنی گٹھے ھوئے بدن کا آدمی ھے اور اس کی ناک چپٹی ھے جبکہ میں کارخانے کی چمنی کی طرح لمبا اور تارکول کی طرح کالا ھوں۔ اس فرق کے باوجود لوگوں کو ھم میں کچھ مشابہت نظر آتی ھے اور شاید اسی لئے انھوں نے ھمیں ایک ھی عرفیت دی ھے — غنی‌ولی۔ اور ھم اس کے اتنے عادی ھو گئے

محض قبول صورت لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔
البتہ میں نے یہ ضرور دیکھا کہ ڈرائیور اس سے
کسی طرح رخصت ہی نہیں ہو چکتا اور پتنگے کی
طرح اس کے چاروں طرف ناچ رہا تھا اور سانس لئے
بغیر چہکے جا رہا تھا جیسے اس کو اجرت دے کر
کسی شادی میں میرمحفل مقرر کیا گیا ہو۔ میں
یہ بھی بتا دوں کہ ہم نے سوچا اس سے ہمیں کیا لینا
دینا۔ ہم بالکل غیرجانبداری کی پالیسی رکھتے ہیں۔
مجھے پتہ نہیں کہ کیوں لیکن ڈرائیور کی لال
لال مونچھیں، اس کے الجھے الجھے بال اور اس کی
چرب زبانی — مختصر یہ کہ اس کی ہر چیز مجھے
پہلی ہی نظر میں مکروہ لگی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا
ہے! ہو سکتا ہے وہ سچ مچ اتنا اجڈ نہ رہا ہو۔
ایسے لوگوں سے بھی ملنا ہو جاتا ہے جو اس سے بھی
زیادہ گھناؤنے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کر ہی کیا سکتے
ہیں۔ بس کوئی شخص اچھا نہیں لگتا اور پھر وہ
کبھی اچھا نہیں لگے گا!

آخرکار جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو
چکے تو بس بادل ناخواستہ روانہ ہوئی۔ لیکن وہ
لڑکی پھر بھی ہمیں جیسے دیکھنا ہی نہ چاہتی تھی۔
دیر تک وہ رومال ہلا ہلا کر بس کو الوداع کرتی
رہی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ جا کہاں رہی ہے۔
شاید وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے آبائی آؤل (گاؤں)
جا رہی تھی۔ ایک تو ہمارے بالکل قریب ہی
واقع تھا... اور چھٹیوں کے لئے موسم بھی اچھا تھا۔

لیکن نہیں، فورمین کی تو پرچھائیں بھی نہ تھی۔ سب سے پہلے ھمیں جو چیز نظر آئی وہ تھیں ڈرائیور کی لال رنگ کی بڑی بڑی مونچھیں جو مختلف سمتوں میں پھیلی ھوئی تھیں۔

"کیا حال‌چال ھیں، یارو ؟"، لال مونچھوں نے پوچھا۔

غنی نے جواب دیا، "کچھ ایسا برا نہیں ھے، بس یہاں بیٹھے ھوئے ابل رھے ھیں۔"

ڈرائیور نے مذاقیہ انداز میں کہا، "میں نے سوچا بس کو سدھالوں، اسے ذرا معلوم ھو جائے کہ کہاں رکنا ھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ھے یہاں بھی ھمارا ایک پڑاؤ ھوا کرے‌گا۔"

اس نے سڑک کے کنارے ھرے رنگ کا ایک سوٹ کیس رکھا جس پر بڑا سا تالا لگا ھوا تھا۔ ڈرائیور کے پیچھے پیچھے بس میں سے ایک لڑکی نکلی جو چوڑے پائینچوں کی پتلون پہنے تھی۔

تو یہ بات ھے!

اچھی شکل صورت کی لڑکی تھی، جسم بھی سڈول تھا لیکن پتلون نہ اسے زیب دیتی تھی نہ ٹھیک سے فٹ تھی۔ اور میں آپ کو یہ بتا سکتا ھوں کہ بڑے بڑے شیشوں‌والی کالی عینک سے صنف نازک کی کوئی آرائش نہیں ھوتی۔ دانت تو بس دانت ھوتے ھیں اور ھونٹوں کا بھی یہی ھے... لیکن جب تک آپ کو کسی کی آنکھیں نہ دکھائی دیں تب تک آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ خوبصورت ھے یا نہیں۔ لیکن ھمیں تو سب سے خوبصورت لڑکیاں چاھئیں، ھمیں

لڑکی نے همیں اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ یه بات بھی همیں اچھی نہیں لگی۔

''فورمین گئے هوئے هیں ایک کھدائی مشین لینے ور هم کام نہیں شروع کر سکتے جب تک که نیو نه کھد جائے۔ یه هے اصل بات!،،

جنک اس نے سوال کیا، ''بیلچے هیں کیا؟،،

''وہ تمہیں کس لئے چاهئیں؟،،

غنی بولا، ''وہ ادهر پڑے هیں، اینٹوں کے پیچھے۔،،

لڑکی نے حیران هوکر پوچھا، ''تو پھر هم بیکار کیوں پھر رهے هیں۔ چلو کھدائی شروع کریں۔ جو کچھ هو سکتا هے وہ تو کریں۔،،

اس کی بات پر همیں هنسی آئی۔

میں نے اپنا سر پکڑتے هوئے کہا، ''ارے، اگر کھدائی مشین مل سکتی هے تو کون بیوقوف پھاوڑا چلائے گا۔،،

هم باتوں میں اتنے محو تھے که هم نے دهیان هی نہیں دیا که ژیگن همارے پیچھے آکر کھڑا هوگیا تھا۔ اس نے پورے منٹ بھر لڑکی کو گھورا اور پھر هیٹ اتارکر احترام کے ساتھ اس نے سر جھکایا۔

''میرا نام هے ژیگن،، اس نے کہا۔ ''خاندانی نام کوئی نہیں۔ میرا مطلب یه که هے هی نہیں۔،،

اس نے جواب میں اپنا نام بتایا، ''آسیه تومبائیوا،، اور اپنا هاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

ژیگن شہری کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرکے پھر سے اپنے سابق شغل میں لگ گیا...

بالآخر ہماری طرف متوجہ ہوکر وہ بولی :
''شام بخیر۔''
''شام بخیر ۔''
صرف ژیگن نے جواب نہیں دیا۔ وہ ابھی تک اپنے تاشوں میں کھویا ہوا تھا۔
''کچھ کام کاج نہیں کر رہے ہیں ہم لوگ، ہے نہ؟''
اس کے سوال نے ہم لوگوں کو جھنجوڑ دیا۔
میں نے تیکھے پن سے جواب دیا، ''تمھیں اس سے کیا مطلب؟''
غنی نے اس میں اضافہ کیا، ''میں نے پہلے تو تمھیں افسروں میں کبھی نہیں دیکھا...''
ہمیں یہ مذاق پسند آیا اور ہم زور سے ہنس پڑے۔ لڑکی ذرا سٹپٹا گئی لیکن اپنی بات پر اڑی رہی :
''میں تمھاری افسر تو نہیں ہوں لیکن تمھاری ٹیم سے میرا بھی کچھ واسطہ ہے۔ مجھے یہاں کام کرنے کےلئے بھیجا گیا ہے۔''
''کیا؟'' غنی چونک پڑا، ''تو تم ہمارے پاس آئی ہو؟ کس قدر غیرمتوقع بات ہے! لیکن ہم تو تم کو ٹیم میں بھرتی نہیں کر سکتے، تمھیں ابوبکر کا انتظار کرنا پڑےگا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، ہے نہ ولی؟''
میں نے سر ہلاکر ہامی بھری ۔
''وہ تو غائب ہیں اور پتہ نہیں کب واپس آئیں گے۔''

گیا۔ اس کے استقلال پر ہمیں غصہ آنے لگا۔ ذرا دیکھو تو یہ چوڑے پائینچوں کی پتلون پہننےوالی ذرا سی لڑکی کر کیا رہی ہے! اب تو ہم بھی پڑے نہیں رہ سکتے کہ کچھ کریں ہی نہ۔ لیکن اس کی مدد کرتے ہمیں شرم آتی تھی۔

میں نے اس سے کہا، ''تھوڑا کام کرکے ذرا دم لے لو۔۔۔''

غنی بولا، ''جب تھک جائےگی تو خود ہی رک جائےگی۔ ٹھیک ہے نہ؟''

یوں ہی آدھ گھنٹے تک یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہم باتیں بناتے رہے۔ لیکن اس طرح کی خالی خولی باتیں کوئی کب تک کر سکتا ہے؟

میں نے سرگوشی میں کہا، ''یہ تو بات کچھ بنی نہیں۔ ایسے تو کام نہیں چلنے کا!''

غنی نے تیوری چڑھا کر جواب دیا، ''تمھیں نے تو پہلے کام سے جی چرایا تھا۔ پھر اب مجھے کیوں ڈانٹتے ہو؟''

''بدھو، تو آخر غصہ کس بات پر کر رہا ہے'' میں نے بھی غصے میں کہا۔

اس نے جواب دیا، ''اچھا، اب بس! اور تم پہلے کیا کر رہے تھے؟ تم بھی کوئی عقلمندی کی بات نہیں کر رہے ہو۔''

''خیر، اگر میں اکیلا ہوتا تو مجھے پتہ ہوتا کہ کیا کرنا چاہئے۔ تم نرے احمق ہو!''

پھر اس نے مجھے گاؤدی کہا اور میں نے جواب دیا

آسیه نے اپنی آستینیں چڑھائیں اور بیلچوں میں سے چھانٹنا شروع کیا۔ جب اسے سب سے چھوٹے دستےوالا ایک بیلچہ مل گیا تو اس نے جا کر کھدائی شروع کر دی۔ اس پر ہماری زبان چل پڑی۔
''ذرا خیال کرکے، ہاتھ میں گٹے نہ پڑیں،، غنی نے بلند آواز میں ہمدردی جتائی۔ ''احتیاط کرنا اچھا ہی رہتا ہے۔،،
میں نے نصیحت کی، ''جو کھونٹیاں گڑی ہیں ان کی سیدھ کا خیال رکھنا تو کوئی غلطی نہ ہوگی۔،،
اس نے ہمیں جواب سے مشرف نہیں کیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کھدائی کرنے میں اسے مشکل ہو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ اس کام کے عادی نہیں تھے۔ اور کھدائی تو ویسے بھی جب آدمی کرتا ہے تو ساری دنیا کو برابھلا کہتا ہے۔
غنی بولا، ''فکر کی کوئی بات نہیں، پورا کر لوگی۔،،
''ہے بڑی جوشیلی،، میں نے تعریف کی۔
''یہاں پہنچتے دیر نہیں ہوئی اور کام شروع کر دیا۔ یہ تو ماننا پڑےگا کہ اسے اپنا نقشہ جمانا آتا ہے۔''
''بالکل فورسین کا ہوبہو نمونہ ہے۔ وہ تو اس سے بہت خوش ہوگا!،،
آسیہ ہماری بات‌چیت سن تو رہی تھی لیکن اس‌نے اپنے کام سے دھیان نہیں ہٹایا۔ دھیرے دھیرے مگر قطعی طور پر اس کے پیچھے مٹی کا ڈھیر بڑھتا

12*

ہی مسکرانے لگتے۔ اور وہ زبان سے اگر صرف اتنا
کہہ دیتی کہ ''ذرا یہ کر دینا،، یا ''میں اس مدد
کے لئے تمھاری بہت شکرگزار ہوں گی،، تو ہم
خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ سچ مچ یہ کس قدر
حیرت کی بات ہے ! صرف ایک ہستی پہنچ جاتی ہے
اور پورا استیپ روشن ہو جاتا ہے!

چوڑے پائینچوں کی پتلون والی لڑکی جب سے ہماری
ٹیم میں شامل ہوئی ہے تب سے ژیگن نے اپنا ایک اور
فرض مقرر کر لیا ہے۔ وہ اپنی کاہلی پر کافی قابو
پا کر ہر صبح کو قریب ترین جھیل تک جاتا ہے اور
وہاں سے سوسن کے دو پھول لاتا ہے۔ اب جہاں
آسیہ کام کرتی ہے وہاں ایک گلاس میں دو پھول
لگے ہوتے ہیں۔ اسے وہ بہت ہی پسند ہوتے ہوں گے۔
دیوار جیسے جیسے اونچی ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے
سوسنوں کا گلاس بھی بلند ہوتا جاتا ہے۔

میں یہ بات تو نہ چھپاؤں گا کہ اگر مجھے بھی ذرا
سی اور بہت ہی معمولی طریقے سے بھی اس کی مدد
کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو میں بھی بڑا خوش
ہو جاتا ہوں۔ مثلاً آسیہ ساہول سے کام نہیں لے
سکتی۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ ساہول معمار کا
سب سے بڑا سادھن ہوتا ہے۔ ساہول ہی سے وہ برابر
اپنی دیوار کی سیدھ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے
بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔

شروع شروع میں تو آسیہ بس امدادی کام کرتی
تھی، ہمارے لئے اینٹیں اٹھا کر لاتی یا سیمنٹ ملا کر

کہ وہ گینڈا ہے۔ پھر میں نے اسے نکما کہا اور مجھے معلوم ہوا کہ میرا شمار تو بہت دنوں سے سب سے کم عقل کودنوں میں ہوتا ہے...

مجھے معلوم نہیں کہ اگر سورج نہ ڈوب گیا ہوتا تو ہماری یہ گالم گلوج کیسے ختم ہوتی۔ دھندلکا ہوتے ہی آسیہ نے اپنا بیلچہ پھینک دیا اور یہ کافی تھا ہمارے جھگڑے کے خود بخود ختم ہو جانے کے لئے۔

خوش قسمتی سے ہمارے فورمین اگلی صبح کو واپس آگئے۔ اور اکیلے نہیں آئے۔ ان کے ساتھ کھدائی مشین بھی تھی۔

— ۳ —

ناشتے کے وقت آسیہ نے فورمین سے بات کی۔ وہ اپنی دھوپ کی عینک نہیں لگائے تھی اس لئے ہم اس کی آنکھیں دیکھ سکے۔ میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نے کل یہ آنکھیں دیکھ لی ہوتیں تو ہرگز ایسی بیوقوفیاں نہ کی ہوتیں۔ اس کا تو میں ذمہ لے سکتا ہوں۔

پہلی بار دیکھ کر تو یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ وہ آنکھیں کیسی ہیں۔ جب وہ مسکرائی تو اس کی آنکھیں شفاف گہرے نیلے رنگ کی ہو گئیں اور جب وہ خفا ہوئی تو ان کا رنگ آسمانی ہو گیا۔

صبح ہی سے وہ ہمارے کنبے کی پوری رکن اور اس کی مالکن بن گئی۔ ہم اسے دیکھتے ہی خواہ مخواہ

سب سے، سوائے میرے!،، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ٹیم میں کوئی بھی میری طرح نہیں ہے، ایسا ڈیل ڈول کہ خدا کو اس پر شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اتنی طاقت کہ اس کی کبھی کمی نہ محسوس ہو۔ بس ایک چیز گڑبڑ ہے — جھائیاں ہیں، کان تک پر، لیکن میرے خیال میں یہ ایسی چیز ہے کہ مردوں میں اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

اور میں اپنے برتاؤ کی بنا پر بھی دوسروں سے ممتاز ہوں۔ میں فورسین کی طرح آسیہ کے پیچھے نہیں پڑا رہتا، میں ژیگن کی طرح اس پر جان نہیں چھڑکتا، میں غنی کی طرح اس کے لئے کڑھتا نہیں۔ مختصر یہ کہ میرا برتاؤ بالکل درست اور قاعدے کے مطابق ہے۔

همارے ابوبکر خیمے کے سامنے ایک بکسے پر بیٹھ گئے ہیں۔ اپنی سپاهیوں والی عادت کے مطابق وہ روزانہ گھر خط لکھتے ہیں۔ لفافے کی پشت پر وہ ہمیشہ لکھ دیتے ہیں، ''پوسٹ‌مین، ذرا تیز قدم بڑھانا!،،

ژیگن اپنے ہی ساتھ تاش کھیل رہا ہے۔ غنی آگ جلانے کی کوشش کر رہا ہے اس لئے کہ شام کا کھانا اسی کے ذمے ہے...

آسیہ سائے میں بیٹھی ہم لوگوں کے موزے رفو کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے استیپ میں گھر کا سا سماں ہے۔

اچانک وہ بس پھر آگئی اور ہمارے پاس آکر

گارا بناتی۔ ہمیں یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ کسی کام سے انکار نہ کرتی تھی۔

حرفہ‌جاتی اسکول نے، جیسا کہ کرنا چاہئے اس میں نظری علم تو ٹھونس کر بھر دیا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس سے عملی کام بہت زیادہ نہیں کرایا تھا۔ اس لئے ہمارے فورمین نے اسے کام کی باتیں سکھانی شروع کیں کہ کرنی پکڑنے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے اور اس کے بغیر کس طرح کام چلایا جا سکتا ہے۔

پانچویں دن آسیہ اکیلے ہی اینٹوں کی چنائی کرنے لگی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں صلاحیت بڑی تھی! اب ہمیں ایک ہی فکر رہتی تھی کہ کسی طرح اس سے پچھڑیں نہیں اور ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

مثلاً آج ژیگن اور غنی امدادی کام کر رہے ہیں اور آسیہ اور میں چنائی کر رہے ہیں۔ ہمارے چڑچڑے فورمین نے آج باورچی کا کام کرنا منظور کر لیا ہے۔ صبح سویرے سے وہ وعدہ کر رہے ہیں کہ ہمیں بےنظیر ''بیش برماق،، کھلائیں‌گے جس سے ان کے کہنے کے مطابق ہمارے منہ میں پانی آ جائے‌گا۔ اب اس کا انتظار کریں‌گے اور دیکھیں‌گے۔ میں دل میں سوچ رہا ہوں، ''ابوبکر بھی ہماری لڑکی کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے آسیہ کی آنکھوں کا کارنامہ!،،

کام کے بعد خوشبودار گھاس پر لیٹے لیٹے میں نے سوچا، ''اس لڑکی نے ہم سب سے گھٹنے ٹکوا لئے ہیں...

''آسیه، میں تمھارے لئے تازہ اخبار لایا ہوں۔ وہ وین کوسیٹر پر جو نیا بس سروس اسٹیشن ہے وہاں ابھی سے ایک نیوز اسٹال کھل گیا ہے۔''

میں کھڑے ہوکر ان کی باتیں سنتا رہا۔ مجھے اس قسم کی دوستی پسند نہیں ہے۔ صرف لڑکی کے خیال سے میں ضبط کئے رہا۔ مونچھیں کے بارے میں میں نے دل میں سوچا، ''کبھی کسی سنسان گلی میں ملاقات ہوگئی تب تمھاری خبر لوں گا۔''

بس جیسے ہی گئی ویسے ہی آسیہ چہکنے لگی، ''وہ تازہ اخبار لایا ہے۔ کہو تو میں کچھ پڑھ کر تم لوگوں کو سناؤں!''

میں نے رکھائی سے کہا، ''دیر ہو چکی ہے اور ہمیں کل صبح سویرے ہی اٹھنا ہے۔ اچھا یہ ہوگا کہ ہم لوگ کچھ کھاپی لیں اور سو جائیں۔''

چاہے کچھ بھی ہو، میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آسیہ وہ اخبار پڑھے جو مونچھیں لایا تھا۔

ہماری بات‌چیت میں فورمین بھی شامل ہوگئے۔ غصے سے بولے، ''یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ پڑھو، آسیہ! خبریں سننے میں ہمیشہ مزہ آتا ہے۔''

جب پوری ٹیم اکٹھی ہو گئی تو آسیہ نے کسی مصور کے بارے میں ایک تبصرہ پڑھنا شروع کیا جو لگتا ہے کہ کسی بھی زرد دھبے کو سورج بنا سکتا تھا جبکہ دوسرے لوگ سورج کو بھی ایک زرد دھبا بنا دیتے ہیں!

مجھے یہ موازنہ پسند نہیں آیا۔ میری رائے میں

اس نے بریک لگائیں ۔ میں نے کبھی اتنا دق کرنےوالا ڈرائیور نہیں دیکھا ۔ یہ آخر کیوں اس نے ۱۸۳ ویں کلومیٹر پر رکنے کی عادت ڈال لی ھے؟ کیا وہ ٹھہرنے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں پسند کر سکتا؟

بس سے باھر آتے ھوئے اس نے اپنا بایاں ھاتھ لہرایا، ''ھلو یارو !''

ھم میں سے کسی نے بھی جواب نہیں دیا ۔ میں مونچھوںوالے ڈرائیور کے پاس گیا اور اس کے کندھے پر ھاتھ رکھ کر بولا، ''سنو، کیا تم اشارہ بالکل ھی نہیں سمجھتے؟ تو تم روز ھی آنے لگے ھو ۔ کیا اپنا پڑاؤ کہیں اور نہیں لے جا سکتے؟''

وہ میرے سلیقے سے دئے جانےوالے مشورے پر خوش نہیں ھوا ۔

اس نے تیوری چڑھا کر کہا، ''بیوقوف مت بنو ۔ تم کیوں ایسی چیزوں میں اپنی ٹانگ اڑاتے ھو جن سے تمھارا کوئی مطلب نہیں ھے !''

آسیہ ظاھر ھے کہ اس کی پکار ھی پر نکل آئی تھی ۔ ڈرائیور سے ھاتھ ملاتے ھوئے وہ میری طرف مخاطب ھوئی اور بغیر کسی بدمزاجی کے بولی، ''یہ کوا دھکار ھے ! اچھا اب تم چلتے بنو !''

میں مونچھیں سے زیادہ باتیں تو نہیں کر سکا لیکن اپنا مطلب کسی نہ کسی طرح اسے سمجھا دیا تھا ۔ اگر سمجھ گیا ھوگا تو ضرور یاد رکھےگا ۔

اتنے میں ڈرائیور نے پھر آسیہ کے اردگرد واری‌نیاری ھونا شروع کر دیا ۔

ہمارے بڑوں کی نصیحت ہے کہ ''پتھر کا پل بھی پار کرنا ہو تو اس کو لکڑی سے آزما لو اور پھر کوئی گڑبڑ نہ ہوگی۔'' اور بڑوں ہی کا یہ بھی کہنا ہے نہ کہ ''کمزور کو لوگ کچل دیتے ہیں، مضبوط کو پھانسی دے دیتے ہیں اور بیچ والے کو اپنا سرغنہ بنا لیتے ہیں''؟

میانہ روی اس دنیا میں بڑا اچھا وطیرہ ہے! اب میں خوب کہ ہمیشہ درمیانہ ہی رہنا چاہتا ہوں اور مجھے کبھی پچھتانا نہیں پڑتا۔ دیکھئے نہ، میں ایک معمولی معمار ہوں۔ تو کیا اس کی بنا پر میں کسی سے بدتر ہوں؟ ہرگز نہیں!

معتدل مزاج آدمی جانتا ہے کہ گرتا وہی ہے جو اوپر چڑھتا ہے۔ معتدل مزاج آدمی پانی کی تھاہ لینے کے لئے دونوں پاؤں کبھی پانی میں نہیں ڈالتا۔ اور سب سے پہلے وہی درخت کاٹا جاتا ہے جو سب سے اچھا ہوتا ہے!

آسیہ ہر وقت ہم کو لیکچر دیا کرتی ہے۔ وہ ہماری زندگی میں بڑی بےچینی پیدا کر رہی ہے۔ میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، ''یہ سب بیکار ہے بالکل، اور میں عاجز آچکا ہوں!''

آسیہ پڑھتے پڑھتے ایک ادھورے ہی لفظ پر رک گئی۔

فورسین نے مجھے غصے سے چپ کرایا، ''تم صریحی غلط بات کہہ رہے ہو!''

آسیہ نے دوسرا مضمون پڑھنا شروع کر دیا اور میں اٹھ کر استیپ میں چلا گیا...

سورج کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاھئے اور دھبوں کو بھی۔ آخر موازنہ کیا ھی کیوں جائے؟ کس کو اس کی ضرورت ھے؟

آسیہ کی عجیب عادت ھے کہ وہ ھمیشہ اخباروں میں ''تعلیمی،، مضامین ڈھونڈ لیتی ھے۔ وہ ھمارے درمیان پروپگنڈہ کئے اور ھمیں تعلیم دئے بغیر رہ ھی نہیں سکتی۔ اگر اس کا بس چلے تو ساری دنیا کو ازسر نو تعلیم دے ڈالے! اور یہ چیز مجھے بالکل پسند نہیں ھے۔ میں اپنی ازسر نو تعلیم کرنا چاھتا ھی نہیں! میں جیسا ھوں ویسا ھی رھنا چاھتا ھوں!

دوسرا مضمون تیز دوڑ میں مقابلہ کرنےوالے ایک سیاہ فام آدمی کے بارے میں تھا جو دوڑ میں اول آنے کے بعد بیہوش ھوکر اپنے ساتھیوں کی بانھوں میں گر پڑا۔ آسیہ کی آواز میں ایک قسم کی ناراضگی تھی۔ اس نے بتایا کہ جو لوگ دوسرے اور تیسرے نمبر پر آئے تھے ان میں پھر بھی اتنا دم باقی تھا کہ اسٹیڈیم کا چکر لگاکر حاضرین کی تالیوں کا شکریہ ادا کر سکیں۔

میرے خیال میں آسیہ کی رائے اس کے بارے میں ٹھیک نہیں ھے۔ مثلاً آپ میری مثال لے لیجئے۔ مجھے کوئی بھی اس حد تک نہیں دوڑا سکتا کہ میں بیہوش ھو جاؤں۔ جان پر بن جائے تو بھی نہیں! آدمی کو ھر چیز میں اپنا پیمانہ جاننا چاھئے۔ لوگ کہتے ھیں کہ ''کملی دیکھ کے پاؤں پسارو،،۔

ـں کے سوٹ کیس میں رکھی تھی اور اس میں سے
ممبر بیڑ انڈیل کر ساری کی ساری ایک سانس میں
چڑھ گیا۔ آسیہ نے تو یقیناً اس سے کوئی ناخوشگوار
بت نہ کہی ہوگی؟ ان کے درمیان کیا بات‌چیت ہوئی؟
جب فورمین نے ژیگن کو کروٹ دلا کر چت لٹا
دیا تب جاکر اس کا کراھنا اور اپنی اینٹ کی بیگم
کی آواز دینا بند ہوا۔
بارش اب بھی سر پر گرے جا رھی ھے۔ پورا
ستیپ تربتر ھو چکا ھے مع ھمارے بس سروس اسٹیشن
کے، جس پر ابھی تک چھت نہیں پڑی۔ ھم کو ایک
عارضی پرچھتی لگانی پڑی تاکہ ھماری لڑکی کا کوئی
ٹھکانا ھو جائے۔ آخر ھم اس کو اپنے ساتھ اپنے
خیمے میں تو نہ رکھ سکتے تھے!
غنی نے اچانک میرے کان میں کہا، ”سنو، اب
ھمیں مناسب اقدام کرنے چاھئیں!“
”کیا مطلب ھے تمھارا، کس چیز کے بارے میں؟“
”مونچھیں ھماری لڑکی کا دماغ خراب کر رھا
ھے۔ میرا خیال ھے کہ اب ھم مونچھیں کو آٹے
دال کا بھاؤ بتا دیں۔“
”کیا تیرے پاس سوچنے کو اور کچھ نہیں رہ
گیا؟“
”شاید اس لڑکی سے بھی ھم لوگوں کو ذرا سختی سے
بات کرنی چاھئے؟“
سوچ تو میں بھی کچھ اسی طرح رھا تھا لیکن کوئی
مناسب تمہید نہیں گھڑ سکا تھا۔ میں نے جواب دیا،

... ایسی آواز ہو رہی ہے جیسے کوئی ہمارے خیمے کی چھت کھرچ رہا ہو ۔ بارش ہو رہی ہے، ہلکی جھڑی لگی ہے، اکتا دینے والی ۔

میرے دل میں ایک بےچینی سی ہے اس لئے کہ بارش نے ہم سب کو خیمے میں بند کر رکھا ہے، اس لئے کہ غنی ناکام محبت کے درد میں مبتلا ہے، اس لئے کہ فورسین خط لکھتا رہتا ہے اور لفافے پر ہمیشہ یہ ہدایت لکھتا ہے کہ ''پوسٹ‌مین، ذرا تیز قدم بڑھانا!،، اب اسے ایک بڑی خوشی حاصل ہو گئی ہے — اس کے ہاں بیٹی ہوئی جس کا نام ان لوگوں نے نائلہ رکھا ہے ۔

صرف ژیگن نے ایک نئی حرکت شروع کر دی ہے ۔ وہ سارے کپڑے پہنے بستر پر لیٹا ہے ۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹک رہا ہے ۔ وہ نیند میں اپنے آپ سے زور زور سے باتیں کر رہا ہے۔ کسی اینٹ کی بیگم کو پکار رہا ہے...

یہ اسے ہو کیا گیا ہے؟ صبح سویرے وہ معمول کے مطابق سوسن کے پھول لانے کے لئے جھیل کے کنارے گیا تاکہ لاکر ہماری لڑکی کو دے! ہم اس ادائے عاشقانہ کے عادی ہو چکے ہیں ۔ البتہ بعد کو اس کا برتاؤ کچھ بڑا ہی عجیب سا ہو گیا ۔ یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اس کے ہوش و حواس بالکل درست ہیں اور آخر دم تک اس کا ارادہ ایسے ہی رہنے کا ہے، اس نے اچانک وادکا کی بوتل نکالی جو

اس نے مسکرا کر کہا، ''یہ کھلونا نہیں ہے، یہ اپنے آپ کو خود ہی پڑھانے کا ایک طریقہ ہے۔ میں انگریزی سیکھ رہی ہوں۔ ایک طرف روسی لفظ لکھا ہے اور دوسری طرف اس کا ہم‌معنی انگریزی لفظ۔ اس طرح یاد کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا،'' میں نے کہا، ''کہ تم ایک راج معمار ہو، تم کو کوئی بیرونی زبان جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ آدمی انگریزی جانے بغیر بھی اینٹوں کی چنائی بڑی اچھی طرح کر سکتا ہے۔ ہے نہ ایسا؟.. میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''سیٹ تم کو خود ہی بنانی پڑےگی۔'' میں نے جلدی ہی کچھ اینٹیں جمالیں۔ ''سبھی جانتے ہیں کہ آدمی بس دنوں کے دھارے پر نہیں زندہ رہتا۔ میں اب کے خزاں میں ایک انسٹی‌ٹیوٹ میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ آدمی کی اگر آرزوئیں نہ ہوں، اگر وہ خود کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کرے تو بڑی بھیانک صورت حال ہوگی۔ آدمی بس ایک فرض کے سہارے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔''

میں نے کہا، ''میں سمجھا نہیں کہ تمھارا مطلب کیا ہے؟''

آسیہ نے جواب دیا، ''میں نے ایک مشہور عالم کی کتاب میں پڑھا ہے کہ ہر شخص کے کم سے کم تین فرائض ضروری ہونےچاہئیں۔''

''اس طرح کے معاملوں میں کسی اور کی موجودگی اچھی نہیں رہتی۔ میرے اوپر بھروسا رکھو، مجھے ان چیزوں کا کچھ نہ کچھ تجربہ ہے۔''

ہمت پیدا کرنے کے لئے میں نے ایک گھونٹ وادکا پی لی جو ژیگن نے بوتل میں چھوڑ دی تھی۔ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا!

میں نے کہا، ''اس نے میری قمیص تو دھو ہی لی ہوگی جس کا وعدہ کیا تھا''، اور کندھوں پر برساتی ڈال کر میں بارش میں نکل گیا۔

اگرچہ شراب میرے اندر اثر کر رہی تھی پھر بھی مجھ سے یہ نہ کیا گیا کہ میں آسیہ کی پناہ گاہ میں گھستا چلا جاؤں۔ پہلے میں نے بس سروس اسٹیشن کی بےشیشوں والی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اور دیکھتا کیا ہوں کہ لڑکی اینٹوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہوئی بہت ہی چھوٹے چھوٹے کارڈوں کو الگ الگ کر رہی ہے۔ کارڈ بس اتنے بڑے تھے جیسے دیاسلائی کی ڈبیا۔ خوب! کیا کھیل نکالا ہے اپنے لئے!

''کیا میں ذرا دیر کو تمھارے پاس آ سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''آ جاؤ۔''

''یہ تم نے اپنے لئے کیا کھلونا بنایا ہے؟'' میں نے پوچھا یہ دیکھ کر کہ وہ پہلے کارڈ کے ایک طرف دیکھتی ہے پھر دوسری طرف اور ساتھ ہی کچھ بدبداتی بھی جاتی ہے۔

وپر چڑھتا ہے اور اچھا پیڑ سب سے پہلے کاٹا جاتا ہے۔

میری پوری بات سنے بغیر ہی آسیہ زوروں سے ہنس پڑی۔ اور بولی، ''تم پورے کے پورے دقیانوسی ہو۔ آخر آسودہ خاطری اور جہالت کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر کوئی خواب ایسا ہے کہ جس کی خاطر تم آگ اور طوفان بھی جھیل سکتے ہو تو وہ خواب بڑا خوبصورت ہے۔ کہ آدمی اپنے آدرش تک پہنچنے کےلئے جو تکلیف‌دہ محنت کرتا ہے اس میں خوشی ہوتی ہے! رہیں تمھاری کہاوتیں تو میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ ان میں کوئی دانائی نہیں ہے! تم ذہن کو سن کر دینےوالی کہاوتوں سے بیس ہوکر زندگی کی عظیم شاہراہ پر نہیں چل سکتے! دوسری کہاوتیں بھی ہیں!''

میں نے اس سے کہا، ''کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟''

اس نے حیران ہوکر میری طرف دیکھا اور کہا، ''تم ایک طرح سے بھنچے ہوئے ہو۔ تم اگر بس ذرا سا مختلف ہوتے تو ظاہر ہے کہ پھر کسی بھی لڑکی کےلئے تم سے محبت کرنا آسان ہوتا۔''

''تمھارے لئے بھی؟'' میں نے پوچھا۔

اور اپنے دل میں میں نے سوچا، ''بات‌چیت تو اس طرح شروع ہونی چاھئے تھی بجائے اس کے کہ بیکار کا فلسفہ بگھارا جائے!''

اس نے مسکرا کر کہا، ''اب تم سے میں کیسے

''میرے خیال میں تم ناممکن سی بات کہہ رہی ہو !''

''مثلاً میں ہوں، تم جانتے ہو کہ میں کام کرتی ہوں اور تمھیں ابھی ابھی معلوم ہوا کہ میں تعلیم بھی حاصل کر رہی ہوں۔ حالانکہ ابھی میں اپنا تیسرا مشغلہ نہیں طے کر پائی۔ ''

اس کے ضرورت سے زیادہ جوش پر مجھے ہنسی آگئی۔ اس وقت وہ مجھے بچے کی طرح لگ رہی تھی۔ تو یہ کرنا چاہتی تھی وہ۔ تین شخصوں کی زندگی بسر کرنا۔ میں اس سے کہنا تو چاہتا تھا، ''لڑکی، تجھے شادی کر لینی چاہئے۔ تیرا تیسرا عظیم فرض یہی ہے اور اسے طے کرنے کے لئے کوئی طول طویل مدت بھی نہیں درکار ہے !'' لیکن میں نے یہ سب نہیں کہا۔ میں ضبط کئے رہا حالانکہ میں اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکا۔

اس نے مجھ سے پوچھا، ''تمھیں مجھ سے اتفاق نہیں ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم متفق نہیں ہو۔ ''

ذرا سی شراب پینے کے بعد میں خاص طور سے دلیر ہوجاتا ہوں۔ میں نے اس سے بحث کرنا اور اس کی آرزو کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

میں نے کہا، ''ہم سارسوں کی آرزو نہیں کر رہے ہیں، ہمیں پدیاں ہی دے دو۔ '' پھر میں نے ایک ایک کرکے اس کی دلیلوں کو رد کرنا شروع کیا۔ میں نے وہ کہاوتیں بھی سنا دیں کہ گرتا وہی ہے جو

...ن گئی تو کیا ھوگا — تب تو سارا معاملہ ھی
گڑبڑ ھو جائےگا!

لیکن ھم نے اپنے آپ کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ
ھم جب ۱۸۳ ویں کلومیٹر پر اس بس سروس اسٹیشن
کی تعمیر کر چکیں گے تو اس کے بعد ۸۱۹ ویں
کلومیٹر پر ھمیں ایک اور اسٹیشن تعمیر کرنا ھے۔
اس کو سمجھانے اور اپنی حرکت کا جواز پیش کرنے
... بغیر بھی کافی وقت رھےگا۔

بالآخر کام کا آخری دن آگیا۔ کل ھمیں امید
ھے کہ ریاستی کمیشن پہنچ جائےگا جو ھم سے بس
سروس اسٹیشن کا چارج لے لےگا۔ معمول کے مطابق
ھم لوگ پلک درست کر رھے ھیں، آخری کیلیں لگا
رھے ھیں اور عمارت کو جھکاجھک کر رھے ھیں۔

دوسرے لوگ چھت پر پینٹ کا ایک اور کوٹ
کر رھے ھیں۔ آسیہ فرش دھو رھی ھے اور میں دروازوں
اور کھڑکیوں پر تالے اور ھینڈل لگا رھا ھوں۔

اچانک میں نے بس کی رفتار کم ھوتے سنی اور
کھڑکی سے باھر جو دیکھا تو جانےپہچانے مونچھیں
کو بس سے نکلتے دیکھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں
آتا کہ یہ کیوں ھم لوگوں کے پیچھے پڑا ھے؟ غنی
ٹھیک کہتا ھے کہ اسے سبق پڑھانا ھی پڑےگا تاکہ
یہ جلد ھی اپنی اس عادت سے باز آ جائے۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اور بغیر کچھ
کہے سنے میں نے حیران مونچھوں والے ڈرائیور کو
پکڑا اور زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ اسی لمحے میں نے

کہوں؟ ہم محبت ایسوں سے کرتے ہیں جو ذرا سرپھرے ہوں۔ تمھاری حالت ویسے اتنی خراب نہیں ہے کہ تمھیں ہاتھ ہی نہ لگایا جائے...،،

مجھے یہ خیال پسند آیا۔ ایسا لگا جیسے اب میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ ایسی میٹھی میٹھی بات‌چیت کے بعد تو اس کا منہ چوم لینا بھی ممکن ہوگا۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کا ڈھب آتا ہے اور کافی سے زیادہ تجربہ بھی ہے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے!،، وہ اچھل پڑی اور بڑی پھرتی سے اس نے ایسا طمانچہ مارا جیسا میں نے کبھی نہ کھایا تھا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بات بنانے کے انداز میں بولا:

''ذرا اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو، ایں؟ یہ بلاوجہ ہی کیوں ادھر ادھر چلتے رہتے ہیں؟،،

جواب میں اس نے کہا، ''نکل جاؤ یہاں سے، جب شراب کا نشہ اتر جائے گا تب میں تم سے بات کروں گی۔،،

مجھے یاد نہیں کہ میں خیمے تک کیسے پہنچا۔ غنی نے بعد میں بتایا کہ '' تم نے ایک ایک حرکت بالکل ژیگن ہی والی کی۔ اپنے گندے بوٹ پہنے پہنے بستر پر پڑ رہے۔،،

جب مجھے پھر ہوش آیا تو میں نے اپنے دل میں بس ایک ہی بات سوچی، ''کیسے سور ہو تم بھی!،، مجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ وہ ہنگامہ کرے گی — یہ تو پریشانی کا صرف ایک حصہ ہوگا۔ اگر وہ سچ‌مچ

ٹیکسی گیروں کا دھندا ہو! کچھ قاعدے قانون بھی ہیں،
تیسیز ہے۔ اگر ایسے ہی ہر شخص جب جی چاہے
جانے اور جب جی چاہے چل دے تو...،،
سیہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ وہ بولی، ''میں
س۔ نی تو نہیں کر رہی ہوں۔ میرے پاس حکم
کے کاغذات ہیں! اور بہرحال آپ کے پاس تو میں عارضی
طور پر آئی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی تھا!،،
یہ بات اس نے بار بار کہی جیسے وہ ڈر رہی ہو
کہ ہم لوگ کہیں اسے روکنا نہ شروع کر دیں یا
یہ کوشش نہ کرنے لگیں کہ وہ اپنی رائے بدل دے۔
یہ دیکھ کر کہ ہم سب چپ ہیں وہ جلدی سے اپنا
سوٹ کیس نکال لائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ
بات صرف حکم کی نہ تھی، وہ تو ہمیشہ بدلوایا جا سکتا
ہے۔ بلکہ خود اس کے جذبات کا معاملہ تھا۔ ہم
میں اس کو کوئی کشش نہ نظر آئی تھی اور اس کی
سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم سے کیسے جان چھڑائے۔
آخر کو ژیگن غیر متوقع طور پر ہم سب کی
طرف سے بولا۔
''ینٹ کی بیگم، یہ تم نے کیا کیا؟!،،
سیہ بوکھلا گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن
بغیر کچھ بھی نہ بولی... اچانک ہڑبڑا کر اس نے
نورسین سے ہاتھ ملایا، پھر غنی سے اور ژیگن سے۔
بغیر کچھ کہے بغیر اس نے اپنا ہاتھ میرے بے ھنگم
ہاتھ میں دے دیا اور بس بھاگ کر بس میں چلی گئی۔
مارے بوکھلاھٹ کے یا کسی اور وجہ سے ہم

محسوس کیا کہ مجھے کوئی پیچھے سے ٹھوکا لگا رہا ہے۔ میں نے مڑکر دیکھا تو آسیہ تھی۔ ظاہر ہے کہ میرا لڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، میں تو بن بلائے مہمان کو بس ذرا تنبیہ کرنا چاھتا تھا۔

''چھوڑ دو اسے!،،

جب میں نے اس کی گھنی بھوؤں کو اس کی خوبصورت غضبناک آنکھوں کے اوپر ایک تیوری میں جٹتے دیکھا تو میں نے ڈرائیور کو بڑی احتیاط سے زمین پر رکھ دیا۔

اتنے میں ڈرائیور نے ایک کاغذ آسیہ کے ھاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے کاغذ کو دیکھا اور پھر ایسی زور سے اپنے گیلے پونچھے کو زمین پر پھینکا کہ پورا استیپ اس کی ''چھپاک،، کی آواز سے گونج اٹھا۔

اس نے چلا کر کہا، ''میں جا رھی ھوں،،۔ اور پھر میری طرف مڑکر بڑی خوشی اور جوش کے ساتھ بولی، ''خدا حافظ!،، اس کے بعد وہ تین قدم پیچھے ھٹی اور اس نے چھت کی طرف نظر اٹھائی، ''کامریڈ فورمین، اور تم ژیگن، اور تم غنی، سب کو خدا حافظ!،،

اس کا مطلب کیا ھوا؟ کہاں جا رھی ھے وہ؟ کیوں؟

باقی لوگ ظاھر ھے کہ دوڑ کر نیچے آگئے۔

ھمارے فورمین بولے، ''یہ تم کیا اوٹ پٹانگ بک رھی ھو۔ یہ ٹیم ریاست کےلئے کام کر رھی ھے، تم اس طرح من‌مانی نہیں کر سکتیں کہ جیسے کوئی
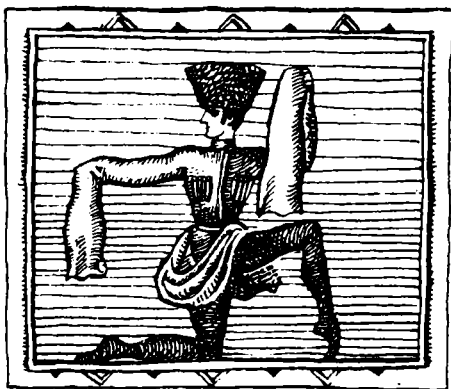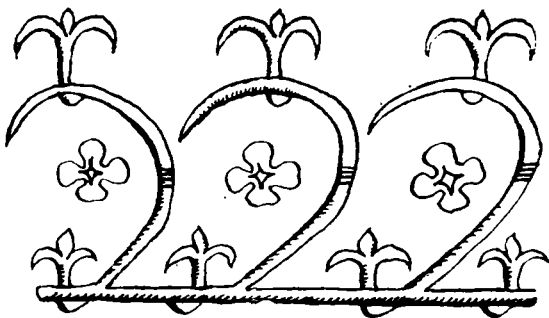
رئیسہ احمدووا

کوہستانیوں کا فرزند

(محمود ایساامبائیف)

کچھ نہ بولے۔ اور پھر ٹھیک اپنے کان کے پاس میں نے ایک کرخت آواز سنی :

''اچھا، بس اب کافی ہو گیا !،،

یہ بات فورمین نے کہی تھی۔

بس دور نکل گئی اور چھوٹی ہوتی گئی۔

ہم نے اس بس سروس اسٹیشن کو تعمیر کرنے میں تین ہفتے صرف کئے تھے۔ ایک طرح سے ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اتنی ہی مدت، اتنا ہی سال مسالا، وہی منصوبہ، وہی تخمینے بھی۔ لیکن ان اکیس دنوں میں کوئی چیز بدل گئی تھی، کوئی بہت اہم چیز میری زندگی میں آگئی تھی۔ اچانک میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ لڑکی نہیں بلکہ خود زندگی، خوبصورت، وجدان انگیز، ہنگامہ‌خیز اور طوفانی، مجھ سے بھاگی جا رہی تھی اور میں پیچھے چھوٹا جا رہا تھا...

میں نے دور تک نظر دوڑائی۔ بس افق کے اس پار غائب ہو چکی تھی۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ابھی تک سڑک کے کنارے ہی کھڑا تھا۔ باقی لوگ بس سروس اسٹیشن کی چھت پر چڑھ چکے تھے اور خاموشی اور توجہ سے اس پر گہرے سبز رنگ کا پینٹ کر رہے تھے جو بےانتہا فاصلوں کا رنگ ہوتا ہے۔

نوسیبرسک اور آدیسا، چلیابنسک اور والگاگراد،
کیمیرووہ اور لینن گراد...

کون ہے وہ جادوگر، رقص کی روح کو سمجھنے والا،
وہ جو اپنی زندگی ہی میں ایک افسانہ بن گیا ہے؟
اس کے کوہستانی ہموطن اسے بڑی یگانگت اور
محبت سے "عمر محمود" کہتے ہیں۔

محمود ایسمبائیف... زبان پر صرف یہ نام لانے کی
دیر ہوتی ہے کہ فوراً ہی یادوں کا، اس کے کمال
کو دیکھنے کی والہانہ خوشی کا، امیدوں کا ایک
ہجوم امنڈ آتا ہے، ایک بار پھر اس کے خوبصورت
فن سے دوچار ہونے کی نئی امیدیں۔

محمود ایسمبائیف — یہ محاکات، کرداروں، چہروں
کی ایک پوری دنیا ہے، یہ ایک پوری دنیا ہے احساسات،
خیالات اور جذبات کی، یہ ایک پوری دنیا ہے رقاص
کے عظیم مرتبے کی شہری دانست کی۔

... بہار ہر چیز کو تازہ‌دم اور نئی کر دیتی ہے۔
ہمارے علاقے میں زمین مئی میں خاص طور سے بڑی
خوبصورت ہوتی ہے۔ نئی نویلی هریالی پر بادلوں کی
پہلی گرج، باغوں میں لائلک کے بنفشئی پھولوں کی
بہار، پہاڑی ندیوں کا پرشور بہاؤ اور چڑیوں کی
اچھی چہچہاہٹ — قدرت جیسی فنکار کے ساحرانہ
ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ تصویریں ساری زندگی
یاد رہتی ہیں۔

چیچینو انگوشیتیا آپ کو جانا پہچانا ہوا لگے گا
چاہے آپ وہاں پہلے کبھی نہ گئے ہوں۔ جب آپ

عزیز قاری، اس کے بارے میں لکھنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ سبھی اس سے واقف ہیں، اس لئے کہ اس کے بارے میں جو بیشمار مضامین لکھے گئے ہیں ان میں سبھی خوبصورت الفاظ استعمال کئے جا چکے ہیں اور اب لغات میں بھی مزید الفاظ کی تلاش لاحاصل ہوگی۔

عزیز قاری، اس کے بارے میں بات کرنی بھی مشکل ہے اس لئے کہ وہ خود ایک ایسا باکمال داستان گو ہے کہ اس سے زیادہ ماہر داستان گو تلاش کر لینا ممکن نہیں ہے۔

اس کی استادی کو بیان کرنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ فن کی دنیا میں غالباً کوئی نام ایسا نہیں ہے جس کا ہمسر اسے نہ قرار دیا جا چکا ہو۔ اسے ''رقص کا شلیاپن،،، ''رقص کا پگانینی،،، ''رقص کا استرادیوارئیس،، کہا جا چکا ہے۔

یہاں لوگ اس سے محبت کرتے ہیں، ایسی محبت جیسی دھوپ سے کی جاتی ہے، خوبصورتی سے کی جاتی ہے۔ یہاں لوگ اس کا انتظار کرتے ہیں، جیسے وہ مسیحا ہو۔ جہاں کہیں بھی وہ رقص کرتا ہے لوگ پرزور تالیوں سے اسے داد دیتے ہیں، چاہے وہ ماسکو کے تھیٹروں کی اسٹیج پر ہو یا دوردراز برازیل میں، چاہے چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں ہو یا گرم اور روشن ہندوستان میں ہو۔ اس نے تقریباً پورے سوویت یونین کا دورہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے بےشمار سفر کئے ہیں — ولادیوستوک اور ریگا،

کبھی کیوں نہیں تلاش کیا، کہ پہلے تو عام طور
سے جنگلی ندیوں کے پرشور حسن کے پیچھے پڑے
رہے اور پیڑوں کے سائے میں چھپے ہوئے چھوٹے
چھوٹے چشموں کی حیرت انگیز منکسر خوبصورتی کی
طرف دھیان ہی نہ دیا، کہ کبھی کبھی سورج کی
تیز ناقابل برداشت روشنی میں ایسے محو ہوگئے کہ
جنگلوں کی میناکاری اور دھوپ چھاؤں کی پیچ در پیچ اور
پر سکون دولت کی طرف توجہ ہی نہ کی۔
اور پہاڑ؟ چیچینو انگوشیتیا کے پہاڑوں کو
بے شمار گہرائیوں نے کاٹ بانٹ رکھا ہے جن کی تہ
میں ندیوں کی طرح تند دریا ڈکراتے رہتے ہیں۔
چوٹیوں کی سر کو چکرا دینے والی کگر پر ذرا دیر
کو ٹھہر جائیے اور پہاڑ کی حیرت‌انگیز طور پر
راحت بخش ہوا میں ابھر کر سانس لیجئے۔
اور اگر آپ نے محمود ایسامبائیف کا ساحرانہ
رقص دیکھا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس مسرور اور
حیرت زا علاقے میں آپ آچکے ہیں۔
پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ خوش‌قسمتی سے میں
ماسکو میں محمود ایسامبائیف کے پاس پہنچ گئی۔ ہم
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے
کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے
آئے، عظیم‌الشان اور پرسکون۔ ان کی محو فکر نیلی
آنکھوں کو دیکھ کر ان کے آبائی علاقے کا نیلا
آسمان یاد آگیا اور ان کا سجیلا گٹھا ہوا بدن اور
قابل رشک پتلی کمر ایسی تھی جیسی قدیم پہاڑی

انجانے جنگل کی سر سبز راہداری میں پہلا ھی قدم رکھتے ھیں تبھی اس کے بیچ بیچ کے روشن صاف قطعوں کی خیرہ کر دینے والی خوبصورتی آپ کو نظر آتی ھے، اس کے غیرمعمولی طور پر صاف اور شفاف چشمے دیکھ کر اکثر آپ کا دل کھل اٹھتا ھے کہ جیسے آپ نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ھو اور ایسا لگتا ھے کہ آپ کو بہترین شے حاصل ھو گئی ھو، کہ اب آپ کے لئے اس پرمسرت جنگل سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ھے۔

اور اگر آپ چیچینو انگوشیتیا بار بار آئیں اور اس کے ھرے بھرے کنجوں میں گھومیں پھریں تو آپ اس پر فریفتہ ھو جائیں گے۔ آپ کو ان پوری طرح سے پراسرار دلکش جگہوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور بھا جائےگی جہاں ھریالی کی گجھن چلمن میں سے چھن کر روشنی اور رنگ کی دمکتی ھوئی جھانکیاں اتر آتی ھیں اور اپنی خوبصورتی کی زبان حال سے آپ کو سرد تیرگی پر نور کی فتح کا افسانہ سناتی ھیں، جہاں پیڑوں کی پتیوں کی اور خوشبودار گوندنیوں کی مہک دل و دماغ کو فرحت بخشتی ھے، جہاں چشمے اس طرح چھپے ھوتے ھیں کہ سرسری نظر میں دکھائی ھی نہیں دیتے۔

ان چشموں میں پانی سیاہ لگتا ھے اس لئے کہ ان کی سطح پر ترمراتی ھوئی سوئیاں تیرتی رھتی ھیں لیکن اگر آپ اچھوتے صاف منبع تک پہنچ جائیں تو بےاختیار یہ خیال ھوتا ھے کہ اس حیاتبخش پانی کو پہلے

معمور تھے۔ ان کی بلیغ آنکھیں کبھی تو لڑکپن کے سے جوش کی آگ سے دمک اٹھتیں اور کبھی نکرسند ہو جاتیں۔

رقص کی دیوی کا یہ منظور نظر کیا سوچ رہا ہے؟ وز شاید میرے خیال کو بھانپ کر محمود نے مجھ سے کہا:

''معلوم ہے تمھیں، میں بہت خوش ہوں۔ میں سوویت بیلے کے ستارے، نام کی فنکاروں کی جماعت کے ساتھ لاطینی امریکہ جا رہا ہوں۔،،

...بڑے بڑے ستارے اور بالکل ہی مٹر کے دانے جیسے بھی، پہاڑی گاؤں استاری اتاگی کے اوپر بالکل نیچے ہی ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ گاؤں پہاڑی راستے کے بالکل سرے پر واقع تھا — چاروں طرف سے اسے اونچی اونچی چوٹیوں کے دندانے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس پہاڑی گاؤں کے لوگوں کو حور کے بلند و بالا پیڑوں پر بڑا ناز ہے جن کا سلسلہ ارگون ندی کے کنارے تک چلا گیا ہے۔

...رات کا وقت ہے۔ بس وہی دونوں ہیں اور کوئی نہیں — بوڑھا موسیقار اور ایک لڑکا۔ آگ میں رہ رہ کر ٹہنیاں چٹخ اٹھتی ہیں، الاؤ میں شعلہ لپک اٹھتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے آگ کی لپٹیں لڑکے کے دبلے پتلے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ بوڑھے موسیقار بار بار سوکھے جھنکاڑ آگ میں ڈالتے جا رہے تھے۔ محمود آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا ہے اور تاروں بھرے آسمان کو دیکھ رہا ہے۔ کس

داستانوں کے نوجوان سورماؤں کی بیان کی جاتی ہے۔
ہماری بات‌چیت بڑی رات گئے تک جاری رہی۔ وہ بات کر رہا تھا... مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے میں برسوں کی آشنا روح نغمہ کا دربار سجا ہو، کہ یہ رقص کا جادوگر اردگرد کی چیزوں کو چھوئے بغیر ہی اگر چاہے تو ان میں آواز پیدا کر سکتا ہے...

ان کے ظاہری خد و خال سے درحقیقت ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی حرکات و سکنات میں زندگی کی تصدیق کرنےوالی موسیقی رچی بسی ہوئی ہے۔

اس نغمے کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟ ان کے کمال کی دلکشی اور عظمت کو کس طرح سمجھایا جاسکتا ہے؟ ان کے گرویدہ بنا لینےوالے رقص کا جادو جس قدرت و اختیار کے ساتھ ہم پر طاری ہوجاتا ہے اسے کیا کہا جا سکتا ہے؟

اس کی تشریح کرنا مشکل ہے، تقریباً ناممکن ہے۔ شومان نے کہا ہے کہ موسیقی سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے اس کی تشریح کرنا اور اس کے بارے میں لکھنا اسی طرح ناممکن ہے جیسے کہ چاندنی کو تولنا۔ اس عظیم نغمہ‌نگار کے الفاظ کا اطلاق محمود ایسامبائیف کے فن پر پوری طرح کیا جا سکتا ہے جو انتہائی باکمال فنکار ہیں اور جنھیں فن رقص کے اسرار کو پوری طرح سمجھنے کی سعادت حاصل ہے۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس شام کو محمود خاص طور سے زندہ دل اور کسی مسرت بخش توقع سے

علاءالدین کی نظر زائرہ پر پڑ گئی ۔ اور نوجوان کے دل کا چین جاتا رہا ۔ اور ادھر بدطینت جادوگر ادریس بہت دنوں سے زائرہ کو اغوا کرلے جانے کی فکر میں تھا ۔

''بہار کی ایک صبح کو زائرہ چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی اپنے محبوب علاء الدین کے بارے میں سوچ رہی تھی ۔ عیار جادوگر دبے پاؤں لڑکی کے بالکل پاس تک پہنچ گیا، جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور لےکر دور بہت دور چلا گیا ۔ علاءالدین بہت دنوں تک زائرہ کو تلاش کرتا رہا ۔ کوئی حساب نہیں لگایا جا سکتا ان مشکلوں کا جو اسے اٹھانی پڑیں ۔ کوئی انتہا نہ تھی ان راستوں کی جن پر وہ اپنی محبوبہ کی تلاش میں بھٹکا پھرا ۔ آخرکار وہ ڈگر اسے مل ھی گئی جو جادوگر نے اپنائی تھی ۔ علاءالدین نے اس کا تعاقب کیا اور اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں وہ عیار چھپا ہوا تھا ۔ جادوگر نے جب دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو اس نے زائرہ کو گہرے کھڈ میں ڈھکیل دیا ۔ زائرہ کے بغیر علاءالدین کیسے زندہ رہ سکتا تھا ۔ ذرا بھی سوچے بغیر وہ بھی زائرہ کے پیچھے ھی پیچھے کھڈ میں کود پڑا ۔ لیکن اسے کوئی چوٹ نہیں آئی ۔ اسے تو عشق نے اپنی اماں میں لے رکھا تھا ۔ جادوگر غصے سے پاگل ھوگیا اور اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا ۔ اس نے ایک تندرو دریا کا دھارا گھاٹی کی طرف موڑ دیا ۔ ایسی چنگھاڑ کے ساتھ کہ کان

قدر خوبصورت ھیں یہ ستارے! لیکن ایک سب سے زیادہ روشن اور سب سے زیادہ دور ھے ۔ وھی اس نوعمر پہاڑی کے تخیل پر چھا جاتا ھے ۔ ایسا تو نہیں ھے کہ یہی میرا ستارہ ھو؟ مجھے اس تک پہنچنا چاھئے...

بوڑھے موسیقار کی شہرت اس کے آبائی گاؤں کی حدوں کو پار کرکے دور دور تک پہنچ چکی ھے ۔ وہ محمود سے بہت محبت کرتا ھے، اسے اکثر اپنے پاس لاتا ھے اور بڑی خوشی سے گا گا کر اسے داستانیں سناتا ھے ۔

یہیں، اسی الاؤ کے پاس بیٹھ کر محمود نے سب سے پہلے حسین زائرہ اور اس کے عاشق علاؑ الدین کے دردناک انجام کی داستان سنی ۔ اس موسیقار و مغنی کی مدھم آواز، اس کے سوکھے، ابھری ھوئی رگوں والے ھاتھ، اس کا تنا ھوا سفید سر محمود کو ساری زندگی یاد رھا ۔

''...دور بہت دور پہاڑوں اور گھاٹیوں میں بوڑھا مختار اپنی خوبصورت بیٹی زائرہ کے ساتھ رھا کرتا تھا ۔ اس کی زلفیں، جن کی وہ ناگنوں جیسی چوٹیاں بنا کر رکھتی تھی، کالی راتوں جیسی تھیں اور آنکھیں، ستاروں کی طرح ھر وقت خوشی سے دمکتی رھتی تھیں ۔ اس کی قیامت‌خیز قامت ایسی سڈول اور سبک تھی جیسے حور کا جواں سال درخت ۔ اس کا حسن تھا کہ چندے ماھتاب و چندے آفتاب ۔

''ایک بار شکار کے زمانے میں بانکے سورما

وس کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پہاڑوں کی
سبز پیاخ کے اوپر پرسکون لاجوردی آسمان تنا
ھو تنہا۔ ارگون ندی نہ جانے کیوں زوروں میں
موجیں مار رہی تھی اور شور کر رہی تھی۔
پہاڑ کے دامن میں طرح طرح کی پہاڑی جڑی بوٹیوں
کی تیکھی مہک بسی ھوئی تھی۔

ور اس لڑکے کے دل میں پہلی بار ایک سمجھ
میں نہ آنےوالی ھلچل ھوئی... بےاختیار جی چاھا
کہ وہ ناچے... لیکن کیا سچ مچ کوئی ناچ
بھی ھو سکتا ھے جو صبح کی نغمگی کو
ضے کی حرکت کے روپ میں ظاھر کر سکے؟
کیا یہ ممکن ھے کہ اس زیر آسمان وسعت کا،
دندانے دار پہاڑوں اور اخروٹ کے پیڑوں سے
ڈھکی ھوئی ڈھلوان اور پھسلینی پہاڑیوں کا افسانہ
ج کی زبان میں سنایا جا سکے؟ دل میں کھلبلی
مچا دینےوالے ارگون کے راگ کو ناچ کی تال
میں ڈھالا جا سکے؟

گھر کے احاطے کے ادھر سے ماں کی گونجتی چکر
کھاتی ھوئی آواز سنائی دی، ''محمود! ا... ے...
مح... مو... د... یا اللہ... جانے کہاں غائب
ھو گیا یہ!''

اور ننھا محمود ابھی تک اپنے خیالات میں گم‌سم،
بادل ناخواستہ ساکلیہ میں لوٹ آیا۔

صبح ھو چکی تھی۔ بھیڑ بکریاں ایک دوسرے

کے پردے پھٹ جائیں اور راستے کی ہر چیز کو
خس و خاشاک کی طرح اپنے ریلے میں بہاتی ہوئی
دیوانی ندی گھاٹی میں گر رہی ہے اور علاءالدین
اپنی زائرہ کو ڈھونڈے جا رہا ہے۔ آج تک تیز و
تند ارگون جب زبردست چٹانوں سے گزرتی ہے تو
پتھروں کی گرفت میں آکر چیختی، چنگھاڑتی اور
گرجتی ہے اور پتھر کے ان دیووں سے ندی کی
لڑائی کی زبردست گھن گرج کو گونج دور بہت دور
تک لےجاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں علاءالدین
آج تک اپنی زائرہ کو ڈھونڈھ رہا ہے لیکن وہ اسے
نہیں ملتی، کسی طرح نہیں ملتی...''

''دادا، اور سنائیے...''

اور موسیقار پھر سے گانے لگتا ہے۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ کیسے کہر پہاڑوں سے
اترتی ہے اور چنار کی پتیوں پر موتی ٹانک جاتی ہے۔
میں دیکھ رہا ہوں کہ پہاڑوں پر کیسے گلابی بادل
منڈلاتے رہتے ہیں اور صبح کو ان میں عقابوں کے
پٹھے غسل کرتے ہیں...''

چھوٹے سے ساکلیہ میں پڑا ہوا محمود سو نہیں
سکا۔ دور پر پھٹتی ہوئی پو پر نظریں جمائے
ہوئے وہ سوچ رہا تھا، ''طاقتور کا قانون؟ لیکن
بدطینت جادوگر ادریس زائرہ اور علاءالدین کو مار
نہیں سکا... محبت بدی کی طاقت سے زیادہ طاقتور
ہوتی ہے...''

وہ صحن میں نکل آیا۔ حور کے درختوں سے

شام ہوجاتی۔ گھاس میں ٹڈے ٹرانے لگتے اور جھاڑوں سے ٹھنڈک نیچے اترنے لگتی۔ محمود جمدی جلدی گھر کی طرف چل پڑتا۔ پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی گاؤں کی طرف جاتی تھی۔

دور بہت دور پر جگہ جگہ روشنیاں جلتی ہوئی دکھائی دیتی، کبھی لگتا کہ بجھ جاتیں اور کبھی پھر سے جھلملا اٹھتیں۔ وہ پاس آنے کا اشارہ کرتیں اور ننھے چیچین کا جی چاہتا کہ جلد ان تک پہنچ جائے۔ یہ روشنیاں ایک عرصے سے اس کے تخیل کو بےچین کر رہی تھیں۔ کون‌سا شہر ہے یہ، روشنیوں میں نہایا ہوا؟ وہاں تو شاید آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہوں‌گی، اتنی زیادہ روشنی ہوگی وہاں۔ بڑا جی چاہتا تھا محمود کا کہ کسی طرح وہ ان روشنیوں کا راز معلوم کرلے!

...طویل راستہ، دھول سے اٹا ہوا۔ اگست کی جھلسا دینے‌والی دھوپ اور سامنے بہت دور پر زبردست آسمان آکر زمین سے مل گیا ہے۔ افق نیلا ہو جاتا ہے۔ گاڑی پر گھریلو سامان لدا ہوا ہے اور اس کے پہیے آہستہ آہستہ چرچرا رہے ہیں۔ باپ چپ ہیں۔ ماں آہستہ سے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لیتی ہیں۔ آبائی گاؤں بہت پیچھے رہ گیا۔ ابھی تو وہ بہ‌مشکل نظر آنے‌والے نقطے کی طرح دکھائی بھی دے رہا ہے لیکن جلد ہی وہ بالکل غائب ہو جائے گا۔

سے دھکم دھکا کرتی ہوئی گھاس پر سے اوس کی نمی چاٹ رہی تھیں۔

ماں نے ایک تھیلے میں نان، پنیر اور پیاز رکھا اور محمود نے پھٹی پرانی پپاخ دھپ سے سر پر رکھی، روئی بھری سرزائی کندھوں پر ڈالی اور بھیڑیں لےکر پہاڑوں میں نکل گیا۔ اس چھوٹے سے گلہ بان کے گلے میں نو بھیڑیں تھیں اور ایک بکری۔ لیکن پھر میمنے پیدا ہوگئے۔ لڑکا بڑا دلگیر ہوگیا، ''اب انہیں گنا کس طرح جائے؟''، ماں نے تحمل کے ساتھ اسے سکھایا۔

''میرے بیٹے، تو ایسے کر کہ ہر بھیڑ کے لئے ایک ایک انگلی موڑتا جا، جب ساری انگلیاں موڑ لےگا تو بچیں گی دو بھیڑیں۔''

اور ایسا ہی وہ کرنے لگا۔ انگلیاں موڑ موڑ کر وہ انہیں دن میں کئی کئی بار گنتا۔ اور اگر ایک بھی کم ہوتا تھا تو بڑا پریشان ہو جاتا تھا۔ محمود زوروں میں دریا کی طرف بھاگتا، ساری جھاڑیوں اور نشیبوں میں تلاش کرتا اور تھکا ہارا، رنجیدہ، ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لئے ہوئے وہ گھر واپس آتا۔ لیکن زیادہ‌تر دن اطمینان اور سکون سے کٹ جاتے۔ گلہ چین سے چرنے لگتا تو اس کو موقع ملتا تھا اپنے محبوب‌ترین مشغلے کی طرف دھیان دینے کا — اور وہ کھو جاتا تھا اپنے تخیل کی دنیا میں۔

گنبد کی چھت کے بالکل نیچے ہی بڑے بڑے لیمپ روشن ہو گئے۔

''یہ تو جادو ہے جادو!'' محمود نے سوچا۔ ''آخر کون سی قوت انھیں روشن کرتی ہے، اور ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ ہی بہت سے! تو کیا سچ سچ یہ بلب مٹی کے تیل کے بغیر ہی جل جاتے ہیں؟'' پتہ نہیں وہ اسی چکر میں کتنی دیر الجھا رہتا اگر کرتب بازوں کی ٹولی سرکس کے میدان میں نہ آجاتی۔ اور ان کرتب بازوں نے کیا کیا کمال نہیں کر دکھائے! انھوں نے پہیوں کی طرح چکر کھائے، بالکل دوھرے ہو ہو گئے، ہوا میں قلابازیاں کھائیں۔ اور پھر ایک دبلا پتلا سا لڑکا سامنے آیا، جگمگاتا ہوا لباس پہنے، وہ تو سانپ کی طرح کنڈلی مار لیتا تھا اور اسے دیکھ کر محمود کو لگا کہ اس چھوٹے سے آرٹسٹ کا جسم جیسے ربڑ کا بنا ہوا ہے، ورنہ تو کیسے وہ اپنے آپ کو لپیٹ کر گانٹھ کی طرح بندھ جاتا تھا اور پھر کھل کر سیدھا ہو جاتا تھا!

گھر لوٹتے لوٹتے ان لوگوں کو کافی دیر ہو گئی۔ محمود اپنی بہن کے ساتھ بڑوں کی طرح چل رہا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو اور کسی قوت نے اسے اپنے بس میں کر لیا ہو۔ باپ چیخے کہ وہ اپنے قدم ذرا تیز کرے، بہن نے جانے کتنی بار

لڑکا راستے پر چلا جا رہا ہے۔ کون جانے اس شہر میں اسے کیا کچھ دیکھنا پڑے گا؟

شہر گروزنی نے محمود کا استقبال بڑے زور شور سے کیا۔ اس کی سمجھ ھی میں نہ آ رہا تھا کہ وہ عمارتوں کو دیکھے، شہریوں کی بھیڑ کو دیکھے، موٹروں کی آمدورفت کی طرف دھیان دے یا پھولوں کے سجے سجائے تختوں اور باغوں سے آنکھیں سینکے۔ ہر چیز نئی تھی، ہر چیز اس کی پہنچ سے باہر تھی۔

ایسامبائیف کا خاندان پسیلیانسکایا سڑک پر ایک چھوٹے سے مکان میں بس گیا۔ اور اسی سڑک کے چھوٹے بچوں کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ محمود ایسامبائیف کے اولیں کنسرٹ دیکھیں۔

اس کی ابتدا یوں ہوئی...

گروزنی میں سرکس آیا۔ پارک میں ترپال کا ایک بہت بڑے سے گنبد کی شکل کا شامیانہ لگا تھا جسے دیکھ کر اہرام مصر کا خیال آتا تھا۔ ہر شام کو وہاں تہوار کے سے لباس پہن کر لوگ جمع ہوتے۔ آرکسٹرا بجتا۔

ایک شام علی سلطان ایسامبائیف کا خاندان بھی سرکس دیکھنے گیا۔ محمود بےچین تھا کہ سرکس شروع ہو اور اسے لگتا تھا کہ انتظار کی گھڑیاں کبھی ختم ھی نہ ہوں گی۔ لیکن اچانک آرکسٹرا نے مارچ کی پرمسرت دھن بجانی شروع کی اور

''میں وہ سب کرنا سیکھوں گا جو سرکس والا لڑکا کرتا تھا،، اس نے چیخ کر جیسے دیواروں سے کہا۔ ''میں آرٹسٹ بنوں گا! بنوں گا!،،

باپ نے بڑی سختی کے ساتھ ڈانٹا، ''میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تو خاندان کے منہ پر کالکھ لگائے، ہرگز نہیں! یہ مردوں کا پیشہ ہے کہ تو دوسروں کا دل بہلا کر اپنی روزی کمائے گا!،،

لیکن محمود کو باپ کی ڈانٹ ڈپٹ روک سکی نہ ماں کا رونا دھونا۔ پاس کے صحن میں اس نے ایک خفیہ ''تھیٹر،، قائم کر لیا۔ پسیلیانسکایا سڑک کے لڑکے لڑکیاں بڑوں سے چھپ چھپا کر جمع ہوتے اور اپنے ساتھی کو ناچتے ہوئے بار بار دیکھتے۔ سب کے سب خوش ہو کر چلاتے، ''شاباش محمود، شاباش!،،

اور وہ کچھ جھینپا ہوا مگر بہت خوش خوش اس جانی پہچانی ''پبلک،، کے سامنے جھک کر آداب بجا لاتا۔ ''کنسرٹ،، ختم ہونے کے بعد لڑکے بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ ٹھونکتے اور بڑوں کے سے انداز میں کہتے، ''محمود، تم ضرور فنکار بنو گے!،،

محمود کو پتہ بھی نہ چلا اور بچپن ختم ہو گیا۔ گھر کے سامنے کے چھوٹے سے صحن پر چنار کا ایک پرانا پیڑ سایہ کئے رہتا تھا جس کے زرد زرد پتے کبھی کبھی ڈال سے ٹوٹ کر زمین پر

اس کی آستین پکڑ کر گھسیٹی لیکن وہ ویسے ھی اپنے آپ میں گم سم رہا۔

اپنے ہم‌عمروں کے ساتھ ساتھ محمود بھی بڑا ہوا اور ظاہر میں وہ ان سے کسی طرح ممتاز بھی نہیں تھا بس یہ کہ اس کی آنکھیں ذرا زیادہ چوکنی تھیں اور مزاج میں سب کچھ جاننے کی کرید تھی۔

یہ لڑکا خود بھی شاید اپنے ہم‌عمروں کی طرح یہ خواب دیکھتا تھا کہ وہ ایک جانباز سورما بنے گا، اچھی طرح ہتھیاروں سے لیس ہوگا اور گھوڑے پر سوار ہوکر ہوا سے باتیں کرے گا۔ اور یہ لڑکا تو بہت کچھ خواب دیکھ سکتا تھا۔

نیند سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں کہ اس نے بےانتہا جوش اور خوشی کے ساتھ یاد کیا، ''کیا چیز ہے یہ سرکس بھی! اور وہ جگمگاتے ہوئے لباس پہنے ہوئے لڑکا، معلوم ہوتا تھا ربڑ کا بنا ہوا ہے، جو خود کو لپیٹ کر گانٹھ کی طرح باندھ لیتا تھا۔ ''

صبح ہوئی اور تھوڑی ھی دیر بعد محمود کے چھوٹے سے کمرے میں دھوپ کے خوش و خرم خرگوش آ گئے اور دیواروں پر پھدکنے لگے۔ تیز روشنی کی وجہ سے محمود نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں، اچھل کر بستر سے نکلا، ہاتھوں کے بل کھڑے ہوکر اس نے اپنے پاؤں اوپر اٹھا دئے لیکن ویسے ھی دھم سے فرش پر گر پڑا۔

بھی والدین کا بڑا وقار اور احترام تھا لیکن وہ
بھی محمود کی آرٹسٹ بننے کی دلی لگن پر
غالب نہ آ سکے ۔ باپ کے ساتھ تنازعہ برسوں تک
چلتا رہا ۔ لیکن محمود پوری طرح سے اپنے مقصد
کے حصول میں لگا رہا ۔ وہ موسیقی کے اسٹوڈیو کے
رقص کے کلاس میں شریک ہوتا رہا، سخت محنت
کرتا رہا، تھک کر گرگر پڑتا لیکن پھر
سے اٹھ کر ریاض جاری رکھتا ۔

ایسا لگتا ھے جیسے کلنڈر کے صفحات شہرت یافتہ
رقاص محمود ایسامبائیف کی زندگی کے صفحات کی
جھلکیاں دکھا رھے ھوں ۔

۱۶ سال کے ایک نوجوان کی حیثیت سے اس
نے آرٹسٹوں کی ایک جماعت کے ساتھ محاذ کے
نزدیک قریب فوجیوں کے سامنے اپنے فن کا مظاھرہ
کیا ۔ ٹھنڈ اور کیچڑ میں پہاڑی گاؤں کا سفر
کیا اور چین آرام سے بےنیاز ھوکر کارخانوں
میں مزدوروں کے لئے رقص کرتا رہا ۔

اور پھر وہ پیشہورانہ اسٹیج پر پہنچ گیا ۔
پہلے اس نے الماآتا کے اوپیرا تھیٹر میں رقص کیا
اور پھر فرونزے آ گیا ۔

ھر انسان کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے ھوتے
ھیں جو ھمیشہ کے لئے اس کے ذھن پر نقش ھو
جاتے ھیں - ۱۹۵۷ء کو محمود اپنی زندگی کے
اھم برسوں میں شمار کرتے ھیں ۔ اس سال ماسکو
میں نوجوانوں کا عالمی جشن ھوا تھا ۔ بیلے کے

آ گرتے۔ محمود کے والد علی سلطان اداس بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔

...پہلے کبھی ان کے پاس تھوڑی سی زمین تھی۔ وہ اور ان کی بیوی بکاتو صبح سے شام تک اس پر محنت کرتے۔ لیکن پھر وہ زمین بھی ان سے چھن گئی۔

انھوں نے زار کے وزیر کو عرضی بھیجی۔ پیسے پیسے کرکے جوڑی ہوئی ساری بچت مقدمے کے کاغذات تیار کرانے میں کھپ گئی اس لئے کہ وہ خود تو پڑھے لکھے تھے نہیں۔ پھر شمالی قفقاز میں سفید گارد والے آ گئے اور علی سلطان سرخ چھاپےماروں سے جا ملے۔

توپوں کی گھن گرج اور لڑائیوں کے دھوئیں کے ساتھ چیچینو انگوشیتیا کی سرزمین پر انقلاب آیا۔ وادیوں اور گھاٹیوں پر آزادی کا سورج طلوع ہوا اور پہاڑوالوں کے ساکلیوں میں بھی زندگی نے قدم رکھا اور سارے پرشور دریاؤں، ناگزار جنگلوں، پہاڑوں، کھیتوں اور چراگاھوں کو اور سب سے بڑھکر لوگوں کو بڑی اھمیت حاصل ھو گئی۔

گاؤں‌والوں نے اپنے اولیں اجتماعوں ھی میں سے ایک میں علی سلطان کو گاؤں سوویت کا صدر چن لیا...

اس معزز چھاپےمار نے زارشاھی کی لاقانونیت اور ناانصافی کو خود بھگتا تھا اس لئے اس کی دلی آرزو یہ تھی کہ محمود جج بنے۔

سارے پہاڑ والوں کی طرح محمود کے دل میں

محمود کو کتنی دشواریوں پر عبور حاصل کرنا پڑا ہوگا تب جاکر اس کے ریاض کی اس جان‌لیوا تہذیب نفس نے اپنی عین ضد یعنی آزادی کا قالب اختیار کیا ہوگا! رقص کی وہ آزادی جس کے بغیر اعلی درجے کی استادی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

محمود کے فن کے مخصوص اور طبعزاد انداز کو روزبروز زیادہ شہرت اور ناموری حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا رقص جذباتی، انتہائی درست اور کلاسیکی ہوتا ہے۔

ہماری نگاہوں کے سامنے سے ملکوں ملکوں کے رقصوں کا ایک رنگارنگ سلسلہ گزرتا ہے۔ الگ الگ آہنگ، مختلف لہجے، مختلف عہد اور قومیں، اور ہر رقص میں، چاہے وہ چیچینو انگوشیتیا کا ہو، اسپین کا ہو، ہندوستان کا ہو، یہودیوں کا ہو، نیگروؤں کا ہو یا تاجیکوں کا، نہ صرف یہ کہ اس رقص کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، ادا کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے بلکہ اس میں اس قوم کی روح بھی موجود ہوتی ہے، زندہ و تابندہ۔

ایک بار محمود نے ایک اسپینی رقص پیش کیا تو اس کے بعد مشہور اسپینی رقاصہ ماریتا البیرنگو نے کہا:

"محمود، تم تو اس لئے پیدا ہوئے ہو کہ کستیل اور آراگون میں رقص کرو۔"

اس سے بڑی تعریف اور کیا ہو سکتی ہے۔

استاد فن لیو کماروفسکی کے گھر میں اس کا استقبال یوں کیا گیا جیسے وہ ان کا رشتےدار ہو ۔ ایلیونورا گریکورووا نے اسے ایک ہندوستانی رقص سکھایا جس کا نام قرار پایا ''سنہرا دیوتا''۔ الکساندرا گریازنووا اور ماریتا البیرنگو نے اسے اسپینی ناچ سکھائے اور تمارا زائیفرت نے ایگر موئیسیئف کے مشورے سے اسے خنجروں کا جنگی ناچ سکھایا۔

ماسکو میں سات سہینوں کے قیام میں اسے طلائی تمغے ملے۔ کل سوویت یونین مقابلے اور بین الاقوامی مقابلے میں اس نے انعامات حاصل کئے۔ پوسٹروں پر اس کا نام اکثر نظر آنے لگا اور اس کے ہنر کے قدردانوں کی تعداد شمار سے باہر ہوگئی۔ اسے شہرت حاصل ہوئی...

فطری ملکہ، مزاج، جادو گری...

لیکن محمود کے بارے میں باتیں کرتے وقت ان چیزوں میں شدید محنت کا بھی اضافہ کرنا چاہئے۔ محنت کی ناقابل یقین صلاحیت، ہر چیز سے بےنیاز ہوکر بس ایک مقصد کی لگن، فن کی بےلوث خدمت — یہ ہے محمود ایسامبائیف کی استعداد کا دوسرا رخ۔

پہلودار فن بہت ہی شدید بلکہ جان‌لیوا تہذیب نفس کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہر رقص کو بےنظیر اور فن کا بلند و برتر اظہار بنا دینے کے لئے ایک ایک حرکت کو سوسو بار مشق کرکے پختہ کرنے کی ضرورت تھی۔

رکھا ہی تھا کہ وہ بےشمار لوگوں کے دوستانہ نرغے میں پہنچ گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ پھولوں اور مصافحوں کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔

بل کھاتی ہوئی سڑکوں سے، جن پر جگہ جگہ سرنگیں تھیں، موٹروں کا قافلہ راجدھانی میں داخل ہوا۔ محمود کو یہ انوکھا شہر بہت پسند آیا۔ موٹرکار کی کھڑکیوں سے شہر کا پرانا حصہ نظر آ رہا تھا جو پہاڑ کی ڈھلانوں پر بسا ہوا تھا اور جسے دیکھ کر کریمیا کے گاؤں یاد آتے تھے۔ اور ادھر کراکاس کا دوسرا حصہ تھا — حد سے زیادہ جدید، فلک‌بوس عمارتیں، چیختے ہوئے اشتہارات اور جدیدترین ماڈلوں کی موٹر کاروں کا سلسلہ۔

شام کو کنسرٹ ہونےوالا تھا۔ آرام کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔ محمود اور اس کے ساتھیوں کو فرصت کے اوقات میں سوویت عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بےشمار سوالوں کے جواب دینے ہوتے تھے۔

رفتہ رفتہ شہر پر شام کا دھندلکا چھا گیا۔ اشتہارات کی نیون لائٹیں بجلی کے کوندوں کی طرح یہاں وہاں دمک اٹھتی تھیں اور آنکھوں کو خیرہ کر جاتی تھیں۔ تھیٹر کراکاس میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔

محمود کے دل میں ایک عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے آبائی وطن

اور سچ یہی ہے کہ اس فنکار کے دائرۂ فن کی
وسعت اور کسی بھی کردار کا روپ دھار لینے
کی صلاحیت ہی کی بات نہیں بلکہ ایک شے
اس سے بھی بڑی ہے۔ ایسامبائیف کے سارے رقص
اپنے آپ میں انسان کی روحانی زندگی کے تمام
دائروں کو سمو لیتے ہیں اور اس کی آئینہ‌داری
کرتے ہیں۔ اگر استانسلافسکی کے الفاظ استعمال کئے
جائیں تو محمود نے ''انسانی روح کی زندگی'' کو
رقص کی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے۔

...ہوائی جہاز بہت بلندی پر پرواز کر رہا
تھا۔ نیچے بحیرۂ کاریبیہ یوں لگ رہا تھا جیسے
کوئی دیو پڑا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جم
گیا ہو۔ بس اس کی آئینے جیسی سطح پر دھوپ
کی چندیاں پھول بکھیر رہی تھیں۔ ہوائی جہاز
پر سوویت بیلے کے مشہور و معرو ستارے وینیزوئیلا
کی راجدھانی کراکاس جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز
جب زمین پر اترا تو شام ہو چکی تھی حالانکہ
گھڑیاں، جو ابھی تک ماسکو کے وقت کے مطابق
چل رہی تھیں، صرف ساڑھے پانچ دکھا رہی تھیں۔
ہر ایک کا جی یہی چاہتا تھا کہ ابھی سوتے
رہیں۔ لیکن اس دورنگی کا تو عادی ہونا ہی پڑا
جس کا سامنا لاطینی امریکہ کے سفر کے دوران میں
سچ مچ قدم قدم پر ہوتا تھا۔

ہوائی اڈا شہر سے کافی دوری پر تھا لیکن پھر
بھی بیلے رقاصوں نے ہوائی جہاز سے باہر قدم

آهستہ آهستہ پدم آسن لگا کر بیٹھ جاتا ہے لیکن
یہ اس قدر آهستہ آهستہ هوتا ہے کہ ناظرین
محمود کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ ہی نہیں پاتے۔
کرا کاس کے ناظرین بے اختیار کہہ اٹھے "لاجواب"
اور انهوں نے زوردار تالیاں بجا کر سوویت فنکار کو
داد دی۔

اور رقص سچ مچ لاجواب انداز میں پیش کیا
گیا تھا۔ اس میں هندوستان کا روشن سورج بھی
تھا اور لوک فن کے موضوعات کا عام استعمال بھی
اور موجیں مارتی ہوئی گنگا کا شور بھی۔

سوویت بیلے کا فتح مندانہ دورۂ لاطینی امریکہ
ختم ہونے کو آگیا۔ وینیزوئیلا اور کولمبیا، میکسیکو
اور کیوبا، هزاروں کلومیٹر کے سفر، تالیوں کی
مسلسل گونج اور داد لینے کے لئے فنکاروں کا بار
بار پردے کے باهر آنا، مصافحے، پھول، نیک
خواهشات کے ساتھ وداعیاں پیچھے رہ گئیں۔ اب
بس برازیل، چیلی اور ارجنٹائنا آنے کو ہے جہاں
نئے کنسرٹ اور نئے ناظرین سے نئی ملاقاتیں ہونی
ہیں۔

برازیل جیسے بڑے ملک کو دیکھ کر محمود
پر ایک عجیب تاثر ہوا۔ یہ نمایاں دھوپ چھاؤں
کا، بے حساب قدرتی وسائل، بے انتہا دولت اور
ناقابل بیان مفلسی کا ملک ہے۔ اور برازیل کی
راجدھانی ریو دی ژنائرو کو دیکھ کر حیرت انگیز
احساس ہوا۔ قصوں کہانیوں کی طرح کا خوبصورت

سے باهر اپنے فن کا مظاهره کرنے جا رها تها۔ اس کے وجود کا رووان رووان یه محسوس کر رها تها که لوگ اس کو اس کے وطن کے ایک جزو کی حیثیت سے دیکھ رهے هیں۔ ایک بار بچپن میں محمود بجلی کے بلب کے سامنے مبهوت کهڑا هوا روشنی کے راز کو سمجھنے کی کوشش کر رها تها۔ آج وه اتنے بهت سے ناظرین کے سامنے رقص پیش کر رها تها جنهیں تیز روشنیوں نے منور کر رکها تها۔ روشنی اتنی تهی که اس زبردست هال میں بالکل دن کا سماں تها۔

اس شام محمود نے اپنا رقص ''سنهرا دیوتا،، پیش کیا۔

...هندوستان میں زمانهٔ قدیم سے رقص کے مختلف اسالیب موجود هیں۔ ان میں سب سے مشکل اسالیب میں بهرت ناٹیم بهی هے۔ رقص ''سنهرا دیوتا،، اسی اسلوب میں ترتیب دیا گیا هے۔ اس کی خصوصیت هے آنکهوں اور ابروؤں کی حیرتِ میں ڈال دینےوالی جنبشیں، چهرے کے اتار چڑهاؤ اور هاتهوں کے بهاؤ۔ محمود اپنے رقص کے ذریعے بارش، دریائے گنگا، رات کے سیاه دیوتا اور دن کے سنهرے دیوتا کی کهانی بیان کرتا هے۔ محمود کے رقص میں ابد کا، من کی شانتی کا، دن اور رات کے، وقت کے لاستناهی سلسلے کا بیان هے۔ محمود طوفان‌خیز عناصر کے جشن فراواں کی تصویر کشی کرتا هے۔

اور پهر اچانک سکوت هو جاتا هے اور وه

کے ساتھ ایک معمولی سے چھوٹے سے کمرے میں رہتی ھیں۔

رقاصہ نے انھیں بتایا کہ ''ریودی‌ژنائرو میں مجھے ایکٹرس کی حیثیت سے سبھی لوگ جانتے ھیں لیکن گورے ویسے بھی مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔،، محمود نے دیکھا کہ اس سیاہ فام ایکٹرس کی آنکھوں میں تلخی اور بیدلی ھے۔ محمود کے بہت زیادہ احترام اور ان سے عقیدت کے طور پر میرسیدیس نے ان کو رقص ''سکومبا،، سکھایا۔

...ریو دی ژنائرو سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مندر ھے جسے برازیل میں قدیم مذھبی رقصوں کے بہترین استاد ژوزے گومیس نے خود اپنی پس‌انداز کردہ جمع پونجی سے تعمیر کرایا ھے۔ اس مندر میں سال میں ایک بار رقص ''سکومبا،، ناچا جاتا ھے۔ لیکن اس بار دو مرتبہ ''سکومبا،، ناچا گیا۔ یہ سوویت فنکاروں کے اعزاز میں کیا گیا۔ محمود قدیم مذھبی رسم کے شروع ہونے کا انتظار بڑی بےچینی سے کر رھے تھے۔ شام کے سات بجے۔ ایک پروھت اور ژوزے گومیس آئے۔ ژوزے گومیس جوان، سڈول اور بڑا ھی وجیہ‌ار جسم رکھتے ھیں۔ وہ سفید قمیص اور سرمئی پتلون پہنے ہوئے تھے۔

ژوزے گومیس نے گانا شروع کیا اور اندر کے دروازوں سے ھاتھ میں دئے ہوئے لوگ نکلنے

شہر جہاں قدرت اور انسان نے اپنی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو یکجا کردیا ہے اور اس کے نتیجے میں مجموعۂ عمارات کی بےمثال ہم‌آہنگی وجودپذیر ہوئی ہے۔ سرسبز پہاڑیاں اور چٹانی چوٹیاں ریو دی‌ژنائرو کے بیچوں بیچ میں سر بلند ہیں یا پھر ساحل کو کاٹتی ہوئی سمندر میں دور تک دھنسی چلی گئی ہیں۔ لیکن محمود کی خوشی کافور ہوجاتی ہے۔ قابل‌دید فلک‌بوس عمارتوں اور دولتمندوں کے بنگلوں کے پاس ہی وہ گندی جھونپڑیاں، تنگ و تاریک جھگیاں بھی دیکھی جو کھڑی ڈھلانوں سے چپکی ہوئی کھڑی تھیں۔ محمود کے لئے اس خیال کا عادی ہونا بڑا مشکل تھا کہ ایک برازیلی تو پیڑوں کی ڈالیوں پر رات بسر کرتا ہے اور دوسرا ایک فلک‌بوس عمارت کی تیسویں منزل پر، کہ ایک کے پاس اتنا کچھ ہے کہ اپنی زندگی‌بھر میں وہ اس سب کا جائزہ تک نہیں لے سکتا اور دوسرا دن میں صرف ایک بار روٹی کھاتا ہے اور وہ بھی تب جب قسمت اس پر مہربان ہوتی ہے۔

برازیل کی باکمال رقاصہ میرسیدیس باپتستا کے ساتھ اپنی ملاقات محمود کو ساری زندگی یاد رہےگی۔ میرسیدیس اپنی چھوٹی سی منڈلی کو لے کر امریکہ اور یورپ کا دورہ کر چکی ہیں۔ ان کی ہر پیش‌کش کا خیرمقدم بےانتہا جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر محمود کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میرسیدیس اپنی ماں

''ایسامبائیف کو اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ انھیں پرزور تالیوں کے تقاضوں سے مجبور ہوکر اپنے رقص مکرر پیش کرنے پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی کبھی اس قسم کی پیش کش نے ہمارے ملک میں اس سے زیادہ جوش و خروش پیدا کیا ہو۔''

سوویت بیلے کے فنکاروں نے لاطینی امریکہ میں ستر دن گزارے۔ ایک لاکھ ۴۰ ہزار لوگوں نے فن کی اس پیچیدہ نوع کے بہترین استادوں کے کمال کو دیکھا جن میں رقص کی دیویوں کا افسانوی پروہت، پہاڑوں کا بیٹا محمود ایسامبائیف بھی تھا۔

گروزنی اپنے منظور نظر کا خیرمقدم کر رہا تھا۔ ایسا ہوگیا ہے کہ محمود جب بھی اپنے آبائی وطن آتے ہیں تو یہ موقع اپنی طرح کا ایک تہوار بن جاتا ہے۔ لیرمونتوف ناٹک تھیٹر کا بڑا ہال کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ سارے لوگ بےچینی سے محمود کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

اسٹیج پر رات کا سماں تھا اور چاندنی کی دودھیا روشنی۔ ہال میں مکمل خاموشی، بالکل ہو کا عالم۔ اچانک ایک غیرمعروف موسیقی نے خاموشی کو توڑ دیا۔ محمود نے منتروں کا آتشین ناچ، خود کو نذر آتش کر دینے کا ناچ ''سکومبا'' پیش کیا۔

...ریڈ انڈین قبیلے پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ

شروع ہوئے۔ یوں رقص ''مکوسبا،، شروع ہوتا ہے۔ اس شام کو ژوزے گومیس کے ساتھ محمود ایساسبائیف بھی ''مکوسبا،، ناچے۔

محمود سے رخصت ہوتے وقت برازیلی دوستوں نے انھیں تحفے کے طور پر تیندوے کی کھال کا لباس اور اناکوندا کی کھال کی بنی ہوئی بہت بڑی ٹوپی دی...

ہوائی جہاز نے سانتیاگو کے ہوائی اڈے کے اوپر چکر کاٹا اور زمین پر اتر آیا۔ کوردیلیرو کی برفپوش چوٹیوں کی اوٹ سے سورج آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ خوبانی کے درختوں پر کاسنی پھول کھلے ہوئے تھے۔ چیلی میں اس سال بہار جلدی آ رہی تھی۔

سوویت فنکاروں نے چیلی میں دس دن قیام کیا اور ملک کے مختلف شہروں میں انھوں نے کنسرٹ پیش کئے، ناظرین نے پروگرام کی ساری چیزوں کو بےحد پسند کیا۔

اخبار ''اونیون،، نے لکھا کہ ''بغیر کسی مبالغے کے کہا جا سکتا ہے کہ سب سے زیادہ کامیابی محمود ایساسبائیف کے غیرمعمولی رقص کے حصے میں آئی جنھوں نے پہلی پیش کش میں ''خنجروں کا جنگی ناچ،، بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا اور دوسری پیش کش میں افسانوی کلاسیکی طرز کے ہندوستانی رقص پیش کرکے ناظرین سے خراج داد و تحسین حاصل کیا۔

ھیں لیکن پھر بھی بالکل ایسا نہیں ھے۔ بدی کی قوتوں کے خلاف انسان کی بےلوث جدوجہد میں فنکار نے نہ صرف جدوجہد کو بلکہ اس جذبے کو بھی دیکھا جو موت اور زندگی کی اس لڑائی میں شامل ھوگیا تھا۔

محمود ایسامبائیف اس آھنگ‌دار، دور دیس کے قدیم مذھبی رقص سے اسی طرح گزرتے ھیں جیسے جیسے کا اداکار ڈرامے میں اپنے کردار سے گزرتا ھے۔ اور اسی وجہ سے یہ رقص صرف لاجواب ھی نہیں، انتہائی غیرمعمولی بھی بن جاتا ھے۔

جب انھوں نے برازیل میں رقص ''مکومبا،، پیش کیا تو اخباروں نے لکھا کہ ''محمود ایسامبائیف کے رقص کے دیوتا سے بڑا قریبی رشتہ ھے،،۔

...ھال میں روشنی ھوچکی ھے لیکن پھر بھی بہت سے لوگ وھاں سے جانا نہیں چاھتے۔ ان کے ھم‌وطن کے کمال نے ان پر جادو سا کردیا ھے۔

میں جلدی جلدی پردے کے پیچھے گئی۔ محمود یک بڑی سی آرام کرسی پر سر ذرا سا پیچھے کو جھکائے ھوئے بیٹھے تھے۔ ان کے تن پر ابھی تک تیندوے کی کھال کا لباس تھا۔

انھیں دیکھ کر مجھے خیال ھوا ''سچ‌مچ رقص کے دیوتا سے ان کا قریبی رشتہ ھے،،۔

جن جن ملکوں میں محمود نے اپنے فن کا مظاھرہ کیا ھے ان سب میں محمود نے وھاں کے عوامی

پڑا ہے۔ صرف جادوگر ہی انھیں اس بدنصیبی سے نجات دلا سکتا ہے۔ وہ تیندوے کی کھال پہنے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ نیم‌تاریکی میں اس کے سرپوش کے پر دمک رہے ہیں۔ جادوگر صرف رات ہی کو نکلتا ہے۔ اس کے چہرے پر خون پتا ہوا ہے، وہ بدروح کے بھیس میں ہے اور اسے اپنے اس بہروپ سے دھوکا دیتا ہے۔ وحشیانہ، پرزور موسیقی بلند ہوتی ہے۔ جادوگر ناچنا شروع کرتا ہے۔ ناچ کے دوران میں بدروح اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور اسے مار ڈالتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بدروح خود بھی مرجاتی ہے۔ قبیلے کو مصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ ''مکوسبا،، جس گھر میں ناچا جاتا ہے وہاں خوشی لاتا ہے...

اس رقص کا مسحورکن پیرایۂ اظہار، انسان پر نازل ہونےوالی برائیوں کے خلاف اس کی جدوجہد کا ڈرامائی تناؤ ناظرین کی روح کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ وہ اسٹیج پر سے اپنی نگاہ تک نہیں ہٹا سکتے، ہلتے اور سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

...ایک لمحہ اور گزرتا ہے اور وہ اپنی جگہوں سے اچھل پڑتے ہیں کہ ان کے دل میں جو جو کچھ ہے اسے ظاہر کردیں — جوش اور خوشی، بوکھلاہٹ اور فنکار کے لاجواب کمال کے لئے شکرگزاری۔

پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے کہ محمود رقص ''مکوسبا،، خالص برازیلی روح کے ساتھ پیش کرتے

نہ جانے کتنے خوبصورت شہر میں نے دیکھے
لیکن کسی بھی شہر کو کبھی میں اپنے شہر
کے بدلے میں قبول نہ کر سکتا تھا۔ چاہے میں
کہیں بھی رہا ہوں مجھ میں اور اس شہر میں
نظر نہ آنے والے رشتوں نے مجھے اس شہر سے جوڑے
رکھا ۔ میں ہمیشہ اپنے آبائی وطن کی طرف کھنچتا
رہتا ہوں ۔''

محمود نے بڑی دیر تک اپنے سفروں اور اپنے
تاثرات کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں کیں ۔

اور وہاں بہت دور افق پر صبح صادق کی
سپیدی نمودار ہو گئی ۔ محمود ہر چیز کو غور
اور توجہ کے ساتھ دیکھتا ہے اور جب اس نے طلوع
ہوتی ہوئی سحر کے چہرے کو دیکھا تو وہ
مجھے بےانتہا خوبصورت نظر آیا ۔ وہ کھڑا ہوا
تھا، یونانی سنگتراشی کے فنکارانہ نمونے کی طرح،
جمال و جلال کا پیکر ۔ اور ہر طرف پرتقدس خاموشی
چھائی ہوئی تھی ۔

... کبھی کبھی زندگی میں ایسے واقعات ہوتے
ہیں جن کی سچائی پر یقین کرنا بڑا مشکل ہوتا
ہے ۔ ایسا کم ہوتا ہے پھر بھی ہوتا ہے ۔ اور
میں اپنے قارئین کو ایک ایسے ہی واقعے کے
بارے میں بتانا چاہتی ہوں ۔

یہ خیرسون میں ہوا تھا...

ایک تہذیبی و تعلیمی خصوصی اسکول کے طالب
علم اناتولی باریگن نے سڑک پار کرتے ہوئے

اور قدیم مذہبی رقصوں سے دلچسپی لی۔ ان رقصوں کو انھوں نے سیکھا، اپنے پروگرام میں انھیں شامل کیا اور ان سے دوسرے ملکوں کے ناظرین کو روشناس کرایا۔

میں نے پوچھا، ''محمود، اب کے بار ہم لوگوں کے پاس کچھ دنوں رہوگے؟''

''ہاں، اس بار زیادہ دنوں رہوں گا''، انھوں نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

محمود کو ایک فلم ''میں رقص کروں گا''، میں حصہ لینا تھا۔

ہم تھیٹر سے باہر آئے۔ شہر پر گرمیوں کی رات طاری ہوچکی تھی۔ سونژی کے ساحلوں سے بہت ہی ہلکی ہلکی ہوا آ رہی تھی جو پیڑوں کی پتیوں کو ہولے ہولے چھیڑ رہی تھی۔ ہم سرسبز خیابان پر چلتے رہے۔ کبھی کبھار راہ گیر ملتے جو دیر ہوجانے کی وجہ سے جلدی جلدی گھر کی طرف جا رہے ہوتے۔ محمود کو پہچان کر وہ ٹھٹک جاتے اور پرمسرت نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ اور وہ، وجیہ اور سڈول، اس شہر کی سڑک پر خراماں چلا جا رہا تھا جس نے بچپن میں اس کے تخیل کو متحیر کردیا تھا۔ محمود رات کی ٹھنڈک میں سانس لے رہا تھا اور شفقت کے ساتھ اپنے شہر کے خطوط کا جائزہ لے رہا تھا۔

پھر وہ بولا، ''میں نے بہت سے ملکوں کا سفر

کے ساتھ اس نے محمود کو تحفے کے طور پر اپنا فوٹو دیا جس پر یہ معنی‌خیز عبارت لکھی تھی:

''معالج جادوگر کی خدمت میں۔ اناتولی باریگن''۔

...گاؤں استاری اتاگی پر ایسا لگ رہا ہے کہ شباب آیا ہوا ہے اور ایک جشن کی سی کیفیت ہے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا ہے اور پہاڑوں کی نوکیلی چوٹیوں پر ایک سیاہ شال کی طرح چھا گیا ہے جس پر جادوئی ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ آج کوئی بھی اپنے گھر پر نہیں رک رہا ہے، سرد و گرم زمانہ دیکھے ہوئے بڈھے نہ بانکے نوجوان۔ کلب میں ان کے ہم‌وطن کے بارے میں فلم دکھائی جانے‌والی ہے۔ بوڑھوں کو تو ابھی تک اس کے باپ علی سلطان بھی یاد ہیں اور خوب یاد ہے کہ لڑکا سا محمود کیسے گلے کو چرانے لے جاتا تھا، کیسے پہاڑی ڈھلانوں پر بھاگتا پھرتا تھا اور کیسے تند و تیز ارگون میں مچھلیاں پکڑتا تھا۔

وہ دن اور آج کا دن — جانے کتنی بار پہاڑوں کی چوٹیاں برف کی پیاخ پہن چکی ہیں، جانے کتنی بار لینڈین میں پھول آ چکے ہیں۔

گاؤں والے یہ فلم پہلی بار نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ان کے ہم‌وطن نے حصہ لیا ہے اور اپنی حیرت‌انگیز استادی سے دنیا کو تسخیر کیا ہے۔

اس وقت فنی ستاروں سے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے پرشور تھیٹر میں پیرس‌والے زوردار تالیاں بجا کر

لاپروائی برتی اور دو موٹروں کے بیچ میں آ گیا۔ اور اس سے وہ اتنا سہم گیا کہ اس کی بولنے کی قوت سلب ہوگئی اور بہت شدید بیمار ہوگیا۔ ڈیڑھ سال گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے خصوصی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے لیکن اس نوجوان کی بولنے کی قوت کسی طرح نہ واپس آئی۔

اسی عرصے میں محمود اس شہر میں آئے اور وہ اناتولی والے خصوصی اسکول کے رقص کے شعبے میں بھی گئے۔

اناتولی نے ایک کاغذ پر لکھ کر محمود سے سوال کیا، ''میں گونگا ہوں تو بھی کیا ناچنا میرے لئے ٹھیک رہے گا؟'' محمود نے جواب دیا، ''یقیناً۔ رقص کی زبان تو سب سے خوبصورت زبان ہے۔''

شام کو تھیٹر میں اختتامی کنسرٹ ہوا۔ جس وقت رقص ''مکوسبا'' اپنے نقطۂ عروج پر تھا اس وقت بالکنی سے ایک چیخ سنائی دی ''محمود!'' اناتولی یہ چیخ مار کر بیہوش ہو گیا۔ جب فنکار محمود کے کمرے میں اسے ہوش آیا تو وہ ھانپتا ہوا مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتا رہا۔ جتنے لوگ تھے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اناتولی کی بولنے کی قوت واپس آ گئی تھی...

جس دن محمود وہاں سے روانہ ہونےوالے تھے اس دن اناتولی ان کے پاس آیا۔ خوشی اور شکر گزاری

دیتی ہے جس میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی لیکن ہر حال میں ہرحرکت شاعرانہ ہے۔

فن کے شائستہ ذوق رکھنےوالے اور بڑے سخت گیر پیرس نے اس شام دل کھول کر محمود ایسامبائیف کو داد دی۔

...کشادہ کھڑکی پر سے چلمن ہٹاکر محمود نے پیرس پر، شاندار اور خوبصورت پیرس پر تشویق و محبت کی نظر ڈالی۔ دریائے سین بڑے سکون سے بہ رہی تھی۔ برف جیسے سفید بادلوں کے ہلکے ہلکے لکوں کو چھیدکر سورج کی کرنیں پر اسرار کیسائے نوتردام پر سونا نچھاور کر رہی ہیں۔

صبح کا پیرس آدمی کو اپنے مسحورکن حسن سے اپنا گرویدہ و شیدا بنا لیتا ہے۔

اور بار بار عظیم ایکٹرس ژوزیفین بیکر یاد آتی ہیں جو گاتی تھیں "پیرس، میرے محبوب، پیرس..." اور پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھتا تھا۔ ایک لمحہ گزرتا ہے۔ اور پھر ان کا ایک بوڑھی بھکارن والا روپ یاد آتا ہے جب وہ بڑے رنج اور درد کے ساتھ گاتی تھیں، "...میں ایک نیگرو ماں ہوں۔ غموں کے بوجھ سے میرے کندھے جھک گئے ہیں، میرے جسم کی رنگت سیاہ ہے اور یہی میری اور میری قوم کی بدنصیبی ہے۔"

ہال میں انتہائی گراں موسیقی گونجتی ہے اور سنگ مزار کی طرح یہ الفاظ گرتے ہیں "محنت کر! نیگرو، محنت کر!"

ایک سوویت فنکار کو داد دے رہے ھیں جو
چھوٹے سے گاؤں استاری اتاگی کا رہنےوالا ایک
چیچین ھے۔ اور یہ اتفاقی بات نہیں ھے کہ محمود
اپنا پروگرام ایک چیچین رقص ''لیزگنکا،، سے شروع
کرتے ھیں۔

کھچاکھچ بھرے ھوئے ھال میں پہاڑ کی
ایک تازہ ھوا کا جھونکا آجاتا ھے، پہاڑی ندیوں
کا شور گونجتا ھے، جھرنوں سے پھواریں چنگاریوں
کی طرح اڑتی ھیں۔ فنکار ایک نظم پیش کر
رھا ھے جس میں اپنے آبائی وطن پہنچنے کی خوشی
کا اظہار کیا گیا ھے۔

...بہت دنوں تک دور رہنے کے بعد ایک نوجوان
اس جگہ واپس آتا ھے جو اسے دل سے عزیز ھے۔
وہ جانی پہچانی پگڈنڈیوں پر چلتا ھے اور جنگل
کی مانوس ٹھنڈک کو محسوس کرتا ھے۔ اچانک
وہ ایک چشمے کے پاس پہنچ جاتا ھے۔ بےاختیار
وہ اس پر جھک پڑتا ھے۔ اس کے رخساروں پر
آنسو ڈھلک آتے ھیں۔ خونی انتقام کی ایک بہت
پرانی رسم نے یہاں اسے موت کی دھمکی دی تھی۔
وہ گاؤں میں نہیں داخل ھو سکتا لیکن اسے همیشه
کےلئے چھوڑ دینا بھی اس کے بس میں نہیں ھے۔
اپنی آبائی زمین سے همیشه کے لئے جدا ھوجانے
سے تو یہاں مر رہنا ھی اچھا ھے... اس رقص
کی ھر حرکت ناظرین کے دلوں میں خیالات،
احساسات اور یادوں کی ایک پوری دنیا کو جگا

فن کا بھی کوئی وطن ہوتا ہے؟،، محمود کا جواب بہت ہی مختصر مگر معنیٰ‌خیز تھا، ''اگر آدمی محب‌وطن نہیں ہے تو وہ فن میں کچھ بھی نہیں کر سکتا،،۔ محمود کے اپنے فن کی دانائی نے، خود اس کے غیرمعمولی مقدر نے بار بار ان الفاظ کی تصدیق کی ہے۔ اس کا فن آج ہمارے فن رقص و نغمہ کا ممتاز اظہار قرار دیا جاتا ہے۔ چینوئے سے گاؤں استاری اتاگی کا محمود ایساسبائیف چیچینو انگوشیتیا خود اختیار سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کا عوامی فنکار، روسی وفاق کا محترم فنکار، اپنے جمہوریہ کی اعلی سوویت کا رکن، کل سوویت یونین مقابلے کا اور نوجوانوں کے عالمی جشن میں دو بین الاقوامی مقابلوں کا انعام یافتہ اور اپنی قوم کا سایۂ افتخار بن گیا۔

ایر ہوسٹس کی خوشگوار آواز گونجی:

''ہم اپنے وطن کی راجدھانی ماسکو کے قریب پہنچ رہے ہیں۔،،

محمود نے آگے جھک کر جہاز کی بیضوی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ نیچے دریائے مسکوا کا فیتہ بل کھا رہا تھا۔ سورج کی کرنوں سے پرانے کیساؤں کے سنہرے گنبد جگمگا رہے تھے۔ زیرتعمیر مقامات نظر آرہے تھے۔ محمود کو ایک مصرع یاد آیا... ''وطن کا دھواں بھی پسند اور گوارا...،، اگلے دن محمود نے چائیکوفسکی نامی ہال میں کنسرٹ پیش کیا۔

ایکٹرس گانے لگتی ہے... ''اے خدائے بزرگ و برتر، آخر تو نے مجھے کالی چمڑی کیوں دی؟ کیا ہمارا دل ایسا نہیں ہے جیسا کہ گوروں کا دل ہوتا ہے؟ کیا ہمارے بچے ماں کو اسی طرح آواز نہیں دیتے؟ کیا ہم بھی درد اسی طرح محسوس نہیں کرتے جیسے گورے لوگ محسوس کرتے ہیں؟ خدایا، تو نے کیوں ہمارے لئے سیاہ مقدر بھیجا ہے!،،

محمود پر ایک پریشان کن احساس طاری ہو گیا۔ اس کا سارا روحانی وجود اپنے وطن کے لئے بیقرار ہو اٹھا۔ واپسی کا دن طے ہو گیا۔ محمود پیرس سے رخصت ہوا — اس شہر سے جو اس کی استادی کا شیدا ہو گیا تھا۔ اخباروں نے اسے ''باتیں کرتی ہوئی آنکھیں،،، ''پرواز کرتے ہوئے ہاتھ،، لکھا۔ اس کے کمال کو شلیاپین اور پگانینی کا ہم‌پلہ قرار دیا گیا۔ اور وہ خود، ایک منکسر اور محنتی انسان، سوویت فن پر نازاں ہے۔

ہوائی جہاز ماسکو کی طرف روانہ ہوا۔ محمود میں اور وطن میں جدائی کی اب صرف چند گھڑیاں رہ گئی تھیں۔ اس کا سینہ خوشی کے زبردست احساس سے پر تھا۔

آرام کرسی سے ٹیک لگا کر محمود یادوں کی دنیا میں کھو گیا۔

ایک بدنصیب رپورٹر نے نیویارک میں محمود سے سوال کیا، ''مسٹر محمود، یہ بتائیے کہ کیا

ہمارے ملک میں اس رقص کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اس کے مرکزی خیال کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ انسان کو خودکار مشین ہرگز نہ بننا چاہئے۔ یہ رقص مالکوں کی دنیا کی مذمت کرتا ہے جس نے انسان کو بنے وجود کے لئے بڑی شدید جدوجہد پر مجبور کر دیا ہے اور انہیں خودکار مشین بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

محمود ایساسبائیف کا فن اپنے جوہر کے اعتبار سے رجائیت پسند ہے، اس وقت بھی جب وہ کوئی المیہ کردار پیش کرتے ہیں۔ ان کے تخلیق کئے ہوئے کردار نہ صرف خوش‌نما ہیں بلکہ ناظرین کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔

شہرۂ‌آفاق بیلے رقاصہ آننا پاولووا نے اپنی شہرت کے عروج کے دنوں میں اپنی یادوں میں لکھا تھا:

''اب میں دیکھتی ہوں کہ میری زندگی ایک سالم کل بن گئی ہے۔ کہیں رکے بغیر ایک ہی مقصد کے لئے کوشاں رہنا — یہ ہے کامیابی کا راز...''

محمود ایساسبائیف جب ۹ سال کے تھے تبھی انہوں نے اپنا مقصدزندگی معین کر لیا تھا۔ اس نے ''سکوسبا''، ''سنہرا دیوتا''، ''خودکار مشین''، ''ہنس سکھ درزی'' اور بہت سے دوسرے رقصوں کا روپ اختیار کیا۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ چاہے کہیں بھی کسی کے بھی سامنے کریں اسے ہمیشہ

...اسٹیج پر ایک شخص ہے جس کا میک اپ بہت ہی خوبصورت ہے۔ سنگ مرمر کا سا سفید چہرہ، شوخ ہونٹ اور شیشے کی سی بیجان آنکھیں۔ اس کا لباس بڑا خوش وضع ہے، سیاہ اسموکنگ جیکٹ، سیاہ ہیٹ، سیاہ پیٹنٹ کے جوتے، سفید دستانے، سفید بو اور سفید گیٹرس۔ وہ سڈول اور بانکا ہے، لیکن بالکل بے روح ہے۔ یہ ایسا انسان ہے جس کا دل مردہ ہو چکا ہے۔ وہ ایک خودکار مشین ہے۔ وہ حکم کے مطابق ناچتا ہے، اس کی ہر حرکت انتہائی درست ہے لیکن اس میں جان نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر کسی بہت بڑی چابی دار گڑیا کا خیال آتا ہے۔ چابی ختم ہو جاتی ہے تو پھر سے بھر دی جاتی ہے۔ روز اور ہر روز یوں ہی ہوتا رہتا ہے۔

''خودکار مشین،، محمود ایسامبائیف کے ترتیب دئیے ہوئے رقصوں میں سے ایک ہے جس میں ایک ایسے شخص کی تصویرکشی کی گئی ہے جسے سرمایے کی دنیا نے ''روبوٹ،، بنا دیا ہے جس میں کوئی بھی انسانی صفت، محسوس کرنے کی، محبت کرنے، سوچنے اور تخلیق کرنے کی صلاحیت نہیں رہ گئی ہے۔ گہری نفسیاتی سمجھ، خیالات کی عظمت، تیکھا طنز اور ایسا رنج و غم جس سے کوئی مفر نہیں ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ فنکار کے وقار، قوت و حرکت اور لوچ لچک اس رقص میں یکجا ہو گئے ہیں۔
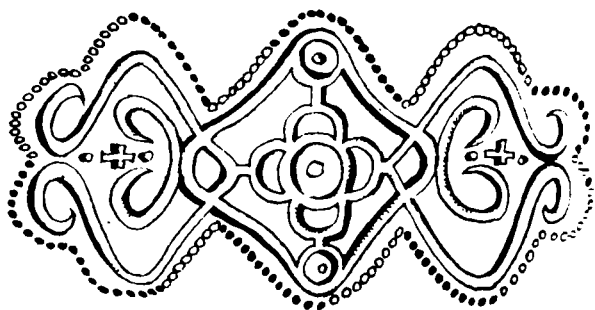
ولادیمیر سانگی

نیلی پہاڑیاں

بےحد پسند کیا جاتا ہے اور اس سے بڑی دلچسپی لی جاتی ہے۔ محمود ایسامبائیف کا نام بڑی زبردست مقناطیسی قوت رکھتا ہے۔

مجھ سے ایک بار انھوں نے بات‌چیت کے دوران میں کہا تھا، ''میں نیم دلی سے کوئی کام نہیں کرتا۔ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح فن کے لئے وقف کر دیا ہے۔''

محمود خوش بخت ہیں۔ ان کا نام رقص کے خوبصورت اور وجدانی فن کی علامت ہے جس کے لئے چھوٹے سے گاؤں استاری اتاگی کے رہنےوالے کوہستانیوں کے فرزند نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔

ذرا ریچھوں کے مقابلے میں بہادری دکھائی ہوتی
جو جنگل میں اتنے ہیں جتنے ہماری بستی میں
کتے ہوں گے۔ جا ان کا شکار کر۔ ،،

خاکون بیچارہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اس کا
سارا غرہ ہوا ہو گیا۔ وہ جلدی سے ایک گلی میں
مڑگیا اور اپنے گھر کے پھاٹک میں غائب ہو گیا۔

اسی موسم بہار میں کورلان ٦٥ سال کا ہوا
تھا لیکن اس سن میں بھی وہ ھٹا کٹا تھا۔ اس کی
بلند قامت پر، جو نیوخیوں کے لئے خلاف معمول
تھی، عمر کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ تائیگا کے لارچ
کے پیڑ کی طرح سیدھا اور تنا ہوا تھا۔ وہ اپنے
سر کو ہمیشہ بائیں طرف کو تھوڑا جھکا کر
رکھتا تھا۔ اوپر کے ہونٹ پر ایک زخم کا نشان
تھا جس کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ ایک بھونڈی
سی مسکراھٹ اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی
ہے۔

پچھلی گرمیوں میں اس نے اپنا ٤٨ واں ریچھ
مارا تھا۔

گاؤں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اب اس کے
بعد اس نے اپنا خطرناک مشغلہ چھوڑ دیا ہے
اور ان افواہوں کی تصدیق کے طور پر ریچھوں
کا یہ شکاری پت جھڑ کے پورے موسم میں شکار
پر نہیں گیا۔

اس سال گرمیاں یوں شروع ہوئیں کہ اجتماعی
فارم کے اکاؤنٹنٹ کی بڑی دودھار گائے، جو دو

ہمارے علاقے میں کورلان کی شہرت یہ ہے کہ وہ ایسا آدمی ہے جسے شکار کا جنون ہے۔ وہ جس قسم کے شکار کو ترجیح دیتا تھا اس کے لئے ہنرمندی، جانکاری، دم اور قوت ارادی کی ضرورت تھی۔ وہ معمولی شکاریوں کو اور خاص طور سے آبی پرندوں کا شکار کرنے والوں کو ذرا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک دن موسم بہار میں پوری بستی نے ایک عجیب بات چیت سنی۔ نوجوان ماہی گیر خاکون شکار سے لوٹ کر خاص سڑک پر چلتا ہوا اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس کے کندھے سے پانچ بطخیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ تیزتیز جا رہا تھا اور یہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ دن میں دسیوں کلومیٹر چل چکا ہے۔ جب وہ کورلان کے گھر کے سامنے سے گزرا تو گھر کے مالک کی تیز آواز نے اسے ٹوکا:

"تجھ ایسے تندرست سانڈ کو شرم نہیں آتی ان معصوم پرندوں کو مارتے ہوئے؟ تیرا کیا خیال ہے کہ یہ آدھی دنیا پار کرکے یہاں اڑکر اس لئے آئے تھے کہ تیرے پیٹ میں پہنچ جائیں؟ اگر تیرے جیسا ہر بدھو پانچ پانچ بطخیں مارے تو جلد ہی بطخوں کا نام و نشان بھی نہ رہ جائے گا۔ اور آج سے بطخوں کے چار گھونسلے کم ہوگئے! اور کہتا ہے خود کو شکاری! بڑا بہادر بنا ہے! ڈھونڈ لیا کہ کسے نشانہ بنانا ہے۔ ارے

ے سگریٹ لےلی اور زرکون نے دیاسلائی جلائی
تو بوڑھے نے سگریٹ سلگا لی اور بڑے چاؤ کے
ساتھ ایک لمبا کش لیا۔ صاف دکھائی دے رہا
تھا کہ آج ابھی تک اس نے سگریٹ نہیں پی تھی۔
''پتہ ھے آپ کو، وہ ریچھ تو بہت بڑا ھے۔
میں ۸ نمبر کا جوتا پہنتا ھوں لیکن اس کے پنجے
کا نشان تو میرے جوتوں سے بھی بڑا ھے۔''
''تو پھر کیا ھوا؟ جنگل میں کیا بڑے ریچھوں
کی کمی ھے؟''
''اور پتہ ھے آپ کو، بوڑھے لوگ تصدیق
کرتے ھیں کہ وہ اگلے بائیں پاؤں سے لنگڑاتا
ھے۔'' اور فوراً کورلان کے چہرے سے بےنیازی
غائب ھوگئی۔
''کیا کہا تو نے؟ اس کے پنجے کا نشان بڑا
ھے؟''
''یہی تو کہا میں نے، کہ میرے بوٹ سے
بھی بڑا ھے۔''
کورلان کی ٹیڑھی‌میڑھی انگلیوں میں سگریٹ
کانپنے لگی۔ دھواں بل کھاتا ھوا چھت کی طرف
جا رہا تھا:
''میں بتاؤں، تمھارے پاس کچھ وقت ھے؟''
''بات کیا ھے؟''
''چلو وھاں چل‌کے دیکھتے ھیں۔ میں اس کے
پنجوں کے نشان دیکھنا چاھتا ھوں۔''
وہ دونوں بستی سے باھر نکلے اور کچھ ٹیلوں

سال پہلے یوکرین سے سخالین آیا تھا، لوٹ کر بستی میں نہ آئی۔ دوسرے دن وہ گاؤں کے سرے پر والے گھر سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر ملی۔ جن لوگوں کو گائے کے انجر پنجر ملے تھے وہ بےانتہا ڈر گئے۔ بوکھلائے ہوئے وہ دوڑ کر بستی میں آئے اور سب ایک ساتھ بولتے ہوئے بتانے لگے کہ انھوں نے کیا دیکھا ہے۔

رات کے ڈراسے کے بچے کھچے آثار کو دیکھنے کے لئے تقریباً پوری بستی وہاں پہنچ گئی۔

ایک اکیلے کورلان پر جیسے اس سب کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ جب ساری بستی میں ہلچل مچی ہوئی تھی تو اس نے سڑک پر نکل کر دو بلیوں پر جال پھیلایا اور اس کی مرمت کرنے لگا۔

دوپہر کو ماہی گیری کی ٹولی کا لیڈر زرکون ادھر سے گزرا۔

''اتکیچخ* ابھی سے ہیرنگ پکڑنے کی تیاریاں شروع کردیں؟''

''تجھے کیا دکھائی نہیں دیتا کہ یہ سالمن پکڑنے کا جال ہے۔''

زرکون لکڑی کے ایک کندے پر بیٹھ گیا۔ جیب سے اس نے سگریٹ کیس نکالا اور بوڑھے کی طرف بڑھایا۔ بدستور خاموش رہتے ہوئے بوڑھے

---

* ''اتکیچخ'' نیوخی زبان میں دادا کو کہتے ہیں۔ ایڈیٹر

بستی میں اسے پتہ چلا کہ ایک ریچھ نے رینڈیروں کے ایک غول پر حملہ کر دیا تھا جو ڈانسوں سے بچنے کے لئے بستی سے نکل کر کھاڑی کے کنارے گئے تھے۔ ریچھ نے ایک بڑے نر رینڈیر کو پکڑ لیا تھا لیکن اسے کھا نہیں پایا تھا اس لئے کہ لوگ وہاں پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اسے بھگا دیا تھا۔

لوگوں نے کورلان کو وہ جگہ دکھائی جہاں مردہ رینڈیر پڑا ہوا تھا۔ اس کو یہ دیکھ کر بڑا ہی دکھ ہوا کہ یہ تو اس کا اکیلا نر رینڈیر تھا جس پر جاڑوں میں سوار ہوکر وہ سمور کے شکار کے لئے جاتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا، ''لٹیرا، چور کہیں کا!،، اور بلند آواز میں بولا، ''اتنے بڑے غول میں تو کسی اور رینڈیر کو نہ پکڑ پایا۔ میرے پاس تو سواری کے لئے بس یہی ایک جانور تھا۔،،

کورلان نے فیصلہ کیا، ''ٹھہر جا تو، میں تجھے مزہ چکھاؤں گا لوگوں کو لوٹنے کا!،،

یہ طے تھا کہ ریچھ اپنے شکار کے پاس لوٹ کر ضرور آئے گا۔

چنانچہ کورلان دن ڈھلتے ہی چھپ کر گھات میں بیٹھ گیا۔ یہ جگہ سپاٹ تھی۔ آس پاس کوئی پیڑ نہ تھا۔ قریب‌ترین جھاڑی کوئی ۸۰ میٹر کے فاصلے پر تھی۔ گھات کے لئے اتنی دوری بہت تھی۔ اس لئے شکاری ایک چھوٹا مگر موٹا کندہ

کو پار کرکے جنگل میں داخل ہو گئے۔ بوڑھے شکاری کو ریچھ اور گائے کی جھڑپ کے آثار دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی طرف اس نے کوئی توجہ بھی نہیں کی بلکہ وہ آگے چلا گیا۔

''آپ جا کہاں رہے ہیں؟''

''اس جگہ کے نشان دیکھنے چاھئیں جب وہ اطمینان سے چل رہا تھا۔ یہاں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا، پنجے کے نشان سب گڈمڈ ہوگئے ہیں۔''

انھیں پنجوں کے کچھ نشانات مل گئے جنھیں دیکھتا ہوا بوڑھا شکاری اور تیزتیز آگے بڑھتا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس لاگو درندے کے پنجے کے نشان اسے مقناطیس کی طرح کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ اچانک وہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ہو گیا اور نم ریت پر بنے ہوئے پنجوں کے نشانات کو غور سے دیکھنے لگا۔

''ہاں، یہ وہی ہے! برسوں سے وہ ہمارے علاقے سے غائب تھا اور اب بڑھاپے میں اس نے پھر کورلان سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

* * *

...یہ آٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

سمندر کنارے سے گھر لوٹتے ہوئے کورلان نے ریچھ کے بڑے بڑے پنجوں کے تازہ نشان دیکھے۔

خوشی ور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ هوا ریچھ
کی طرف سے آ رهی تھی اس لئے وہ اعتماد
کے ساتھ چلا آ رہا تھا اور اسے اجنبی مہک نہ
مل سکی۔ پھر وہ مردہ رینڈیر سے چند قدم کے
فاصلے پر ٹھٹک کر کھڑا هوگیا اور اس کے
چاروں گھومنے لگا۔ ریچھ نے کوئی نئی چیز
محسوس کی تھی۔ کون سی چیز هو سکتی ہے؟
شکاری نے مذاق اڑایا، ''اچھا، تو رہا نہیں
گیا! اب ڈر رہا ہے! دیکھ لے، گھوم گھوم کر
دیکھ لے!''
لیکن ریچھ چکر پورا کئے بغیر هی شکاری کی
طرف مڑ پڑا اور هوا میں زور زور سے سانس لینے
لگا۔
''کیا ڈھٹائی ہے! سیدھا میرے اوپر هی آ رہا
ہے۔ اور سونگھ رہا ہے جیسے میں کوئی ٹھنٹھ،
جھاڑی یا سڑاگلا پیڑ هوں۔''
کوزلان نے اپنی توهین محسوس کرتے هوئے ریچھ
کے چوکور سر کے بیچوں‌بیچ میں نشانہ باندھا۔
لیکن درندے کا سر هل رہا تھا اور خاص طور
سے اندھیرے میں اس پر نشانہ لگانا مشکل تھا۔
کوزلان نے سوچا، ''میں تجھے بتاتا هوں کہ سیدھے
میرے اوپر آنے کا نتیجہ کیا هوتا ہے!'' اور
اس نے لبلبی دبا دی۔ گولی کی آواز اور ریچھ
کی چنگھاڑ ایک ساتھ بلند هوئی۔
گولی چلنے کے کوندے سے شکاری کو کچھ

گھسیٹ کر لایا۔ اس سے آڑ بھی ہو گئی اور بندوق ٹکانے کےلئے پشتہ بھی۔ کورلان اس کی آڑ میں لیٹ گیا۔

جلد ہی سورج پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا اور افق پر دھکتا ہوا قرمزی رنگ چھا گیا جو جلد ہی ماند پڑ گیا اور اندھیرا ہو گیا۔ دیر سے لوٹنےوالی بن‌مرغیاں اپنے رین بسیرے کی طرف تیزی سے اڑتی ہوئی شکاری کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ساحل کی جھاڑیوں میں چہچہانےوالی چڑیاں خاموش ہو گئیں۔ دور کے ٹیلے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ جھٹ‌پٹا وقت ختم ہو گیا۔ پہاڑی کے اوپر نیا چاند کسی خون میں تر خنجر کی طرح ٹنگا ہوا تھا جیسے کسی کی گردن پر گرنے کے لئے تیار ہو۔

رات ہو گئی۔

منٹوں کا لامتناہی سلسلہ گزرتا رہا، کورلان اندھیرے میں اس شدت سے آنکھیں گڑوئے ہوئے تھا کہ دکھنے لگیں۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ کوئی سیاہ چیز اس کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن جب وہ اور غور سے دیکھتا تو وہ غائب ہو جاتی۔

بالکل سناٹا تھا۔ بس ہلکی ہلکی لہروں کی آواز سنائی دیتی یا پھر دور کہیں کسی کتے کے بھونکنے سے رات کی خاموشی ٹوٹ جاتی۔

ریچھ اچانک ہی نمودار ہو گیا، بلکہ غیرمتوقع طور پر۔ اس کی بڑی سی پرچھائیں ٹیلے سے الگ

جہاں گرا تھا وہاں خون کے تھکے تھے۔ اس سے
آگے ریچھ لنگڑاتے ہوئے اپنا اگلا بایاں پنجہ گھسیٹتے
ہوئے گیا تھا۔

کورلان نے ریچھ کے آنے کے نشانات بھی دیکھے۔
اس کے دائیں پنجے میں ایک ناخن نہیں تھا۔ غالباً
کسی دوسرے ریچھ سے لڑنے میں یہ ناخن جاتا
رہا ہوگا۔

اب کورلان اس درندے کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔
شکاری پانچ مہینے علاقائی اسپتال میں پڑا رہا
اور جب اپنی بستی میں لوٹ کر آیا تو پہلا سوال
اس نے یہی کیا کہ ''اس ریچھ کو کسی نے
مارا؟''

لوگوں نے جواب دیا، ''نہیں، کسی نے نہیں
مارا۔''

ریچھ اس جنگل سے چلا گیا تھا اور پھر کبھی
دکھائی نہیں دیا۔

اس واقعے کے بعد کورلان نے بیس سے زیادہ
ریچھ مارے۔ اور اب جب اس نے ہمیشہ کے لئے
ریچھ کا شکار ترک کر دیا تھا تب اس کا پرانا
دشمن اس کے سامنے آ موجود ہوا...

* * *

زرکون نے پوچھا، ''کیا دیکھا آپ نے؟''

کورلان نے رک رک کر جواب دیا، ''ہماری
مڈبھیڑ اس سے پہلے بھی ہو چکی ھے۔ یہ وھی

نہ دکھائی دیا اور وہ اچک کر کھڑا ہونا ہی چاہتا تھا کہ ایک زبردست تودے نے اسے گرادیا اور اپنے سارے بوجھ سے اسے دبا لیا۔ کورلان کا جو ہاتھ خالی تھا اس نے اپنے چہرے کو ڈھک لیا۔ اپنے بائیں کندھے میں اسے شدید درد کا احساس ہوا۔ دایاں ہاتھ مضبوطی سے بندوق پکڑے ہوئے تھا۔

لیکن جب ریچھ تمہارے اوپر ہی چڑھا بیٹھا ہو تو تم نشانہ کیسے لگاتے؟

کورلان نے بندوق کی نالی کو ریچھ کے دھڑ کی طرف کھسکانا شروع کیا اور اس کا رخ ریچھ کے سینے کی طرف کر لیا۔ دیر کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

گولی چلنے کے ساتھ ہی کچھ سانس سمائی، سینے پر لدا ہوا بوجھ کھسک گیا تھا۔ کورلان بیہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو سورج ٹیلوں کے اوپر آچکا تھا۔ کندھے کا درد ناقابل برداشت تھا، اور لگ رہا کہ سارے چہرے پر کھرونچوں کے گھاؤ ہیں۔ بایاں ہاتھ بالکل ہلایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے بندوق ٹیک کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ کھڑا ہو پایا۔ ریچھ کے پنجوں کے نشان دیکھنا ضروری تھا۔ اس نے دیکھا کہ گولی لگنے کے بعد ریچھ ہوا میں اچھلا تھا اور ناک کے بل بالو پر گرا تھا۔

تنہا رہ کر زیادہ دنوں تو نہیں جیا جا سکتا! اس
لئے اس نے انسانی آبادی کے قریب ڈیرا جما لیا
تھا جہاں کسی خاص کوشش کے بغیر وہ پالتو
جانوروں کو پکڑ سکتا تھا۔

زرکون اس شام کو کئی گھنٹے کورلان کے
ساتھ رہا لیکن بالٹی کے برابر کیتلی بھر تیز چائے
پی جانے کے بعد بھی یہ سوال طے نہ ہوا۔

مہمان کو باہری زینوں تک رخصت کرنے کے
بعد کورلان دیر تک تاریک آسمان پر نظریں
جمائے رہا جیسے کسی سے مدد مانگ رہا ہو۔

اسے اپنا باپ اور اس کے بعد اپنے باپ کا باپ
یاد آیا۔ اپنے پرکھوں کو یاد کرکے بوڑھا شکاری
اس فکر میں تھا کہ اس میں قوت عود کر آئے۔
آسمان سے ستارے اسے یوں تک رہے تھے جیسے
وہ منجمد برف کی ڈلیاں ہوں۔

کورلان اکیلا اس عیار درندے کے شکار کو
کیسے جا سکتا تھا جس کا خیال آتے ہی اس کی
ہمت جواب دے جاتی تھی۔ لیکن برسوں پہلے
اس نے جو خود سے عہد کیا تھا وہ اسے چین نہیں
لینے دے رہا تھا۔ اور پھر ساری بستی منتظر
تھی کہ وہ اس خطرناک اور موذی لٹیرے کو
ختم کرنے کا فیصلہ کرے۔ سب اسی سے آس لگائے
تھے۔

کاش کوئی ایک ہی مددگار ہوتا۔ لیکن اس
بھیانک درندے سے ٹکر اینے کون جائے گا؟

ہے جس نے آٹھ سال پہلے مجھے اپاہج بنا دیا تھا۔،،

''تو اب آپ کیا کیجئےگا؟،،

''مجھ سے تو کیوں پوچھ رہا ہے؟ جیسے بستی میں اور تو کوئی ریچھ کا شکار کرتا ھی نہیں۔ لوزگان جا سکتا ہے، وہ اچھا شکاری ہے۔ نہیں تو دوسرے بوڑھے جائیں۔،،

''وہ اس ریچھ کے لئے نہ جائیں گے۔ آپ نے خود ھی اس کے پنجوں کے نشان کی تفصیلات بیان کی تھیں۔ سارے گاؤں کو معلوم ہے کہ یہ وھی ریچھ ہے۔ آپ آخری شخص ھیں جس نے اس کی تصدیق کرلی۔ اور آپ جانتے ھیں کہ باقی مرد هیرنگ پکڑنے کے لئے دور جا چکے ھیں۔،،

''تو ٹھیک ہے پھر انتظار کرو کہ وہ تمھاری ساری گائیں اور اجتماعی فارم کے گھوڑے کھا جائے۔،،

''خاکون آپ کے ساتھ جائےگا۔،،

''اونہہ،، بوڑھے نے اس طرح کہا جیسے کسی ناک میں دم کر دینےوالی مکھی کو اڑا رہا ھو۔

بستی کی طرف لوٹتے وقت دونوں چپ رہے۔

گھر واپس پہنچ کر کورلان بڑی بےنیازی کے ساتھ اپنے جال میں لگ گیا۔

دو دن بعد ایک چیرا پھاڑا ھوا بچھڑا سلا۔ صاف ظاھر تھا کہ تائیگا کے بوڑھے راجہ میں اب اتنی صلاحیت نہ رھی تھی کہ تیز رفتار جنگلی جانوروں کا شکار کر سکے۔ لیکن گھاس اور گوندنیاں

"ریچھ بطخ نہیں ہوتا، پانچ بطخیں بھی نہیں ہوتا۔ خاکون شکاری نہیں ہے اور ریچھ کا شکاری تو ہرگز نہیں ہے۔ ریچھ کا شکاری تو اتنی آسانی سے نہیں بن سکتا۔ پہلے دل کڑا کرنے کی اور ہاتھوں کو سادھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کانپیں نہیں۔"

بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے خاکون بول اٹھا، "میں آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ پچھلی باتوں کو بھول جائیے۔"

اگلی صبح کو بہت سے لوگوں نے دیکھا کہ کورلان اور خاکون اپنی اپنی بندوقیں کندھوں سے لٹکائے جنگل کی طرف گئے۔

دوپہر تک دونوں شکاری چلتے رہے لیکن ریچھ کے پنجوں کا کوئی نشان انہیں نہ ملا۔ دوبار نہیں نشان ملے بھی تو وہ دو دن پہلے کے تھے...

آخرکار بالکل شام کے قریب "گرم" نشانات ملے جو بڑے بڑے پنجوں سے بنائے گئے تھے۔ نشانات بستی کی طرف جاتے تھے اور ریچھ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے پہلے گیا ہوگا۔

خاکون نے کہا، "شاید وہ اسی بچھڑے کے پاس واپس گیا ہوگا۔"

"نہیں۔ یہ عیار اب گھات میں بیٹھے شکاری سے ڈرتا ہے۔ آج وہ غالباً کوئی اور گائے پکڑے گا۔"

"اس کو راستے ہی میں جا لینا چاہئے۔ چلئے سیدھے بستی چلتے ہیں۔"

اگر سارے مرد گھر پر ہوتے تو ضرور کوئی نہ کوئی تیار ہی ہوجاتا۔

بوڑھا گھر سے باہر نکلا تو اس نے سردر سے بچنے کےلئے اپنا سر جھکا لیا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

وہ لیٹنے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور چوکھٹ پر بغیر کسی آواز کے خاکون نمودار ہوا۔

"اب آگیا ہے تو اندر آ جا اور بیٹھ۔ چائے تو ہے نہیں۔ خاطر تواضع نہیں کرسکتا۔ آجا، اندر تو آجا۔"

"دادا، آپ چائےوائے کی فکر نہ کیجئے۔"

"اتنی رات گئے کیسے مجھ سے ملنے آئے؟ کیا ہوا جو ناک میں دم کئے رہنےوالے بڈھے کا خیال آگیا؟"

"اس طرح کی باتیں کیوں کہتے ہیں آپ؟ ایک بار پوری بستی کے سامنے آپ نے مجھے شرمندہ کردیا، اب بس کیجئے۔"

"تو اور تو میں نے کچھ کہا نہیں۔"

"کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اچھا، دادا آپ میری بات سنئے! میں جانتا ہوں کہ آپ خفا ہو جائیںگے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اکیلے شکار کرنے نہیں جا سکتے۔ اپنے ساتھ مجھے لے چلئے۔ میرا نشانہ برا نہیں ہے اور میں نے بزدلی کبھی نہیں دکھائی۔"

بیٹھے رہنے سے پاؤں سن ہوگئے اور پیٹھ دکھنے لگی۔

آدھی رات کا چاند نکل آیا اور اس کی سیمگوں روشنی سے اردگرد کی چیزیں دمک اٹھیں۔

شکاری نے جسم میں سے سردی کو بھگانے کے لئے اپنے آپ کو کئی مرتبہ جھکجھورا۔ جب کورلان نے اچانک ایک سیاہ دھبے کو قریب سے دیکھا تو اس کے سارے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ بوڑھے کا دل قابو سے باھر ہوگیا۔ وہ بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ایک آدھ دھڑکن غائب بھی ہوجاتی تھی۔ اس نے اپنی بندوق کو بڑی سختی سے پکڑلیا لیکن اس سے بھی کوئی مدد نہ ملی۔

سیاہ دھبا قریب‌تر ہوتا جارھا تھا، بڑا ہوتا جارہا تھا اور بوڑھے شکاری کے لئے اس کی شکل زیادہ جانی پہچانی ہوئی ہوتی جا رہی تھی۔ کورلان نے کئی بار آھستہ آھستہ گہری سانسیں لیں۔ ایسا وہ ہمیشہ اس وقت کیا کرتا جب گھبراھٹ کو کم کرنا چاھتا۔ لیکن اس بار اس آزمودہ طریقے نے بھی مدد نہ کی۔ ہوا کی کمی لگ رہی تھی۔ بوڑھا ابھرابھرکر سانس لے رہا تھا۔

ریچھ لنگڑاتا ہوا لمبے لمبے قدم لے رہا تھا۔ بڑے سے سر پر اس کے چھوٹے چھوٹے کان دکھائی دینے لگے تھے۔ کئی بار چاند کی روشنی سے جگمگا کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''هم اب اس کو نہیں پکڑ سکتے ۔ اور اگر هم اس کے نشانات پر بھی چلیں تو بھی همارا سامنا هوتے هی وه تائیگا میں گھس جائےگا اور ٹیلوں کے بیچ میں چھپ جائےگا۔ همیں خاکنائے پر اس کا انتظار کرنا چاهئے۔ جب وه اپنا پیٹ بھرکر لوٹےگا تو اسے وهیں دهر لیں گے ۔''

ایک گھنٹے تک تیز تیز چلنے کے بعد دونوں شکاری خاکنائے پر پہنچ گئے۔ یہ جگه نیچی نیچی جھاڑیوں سے ڈھکی هوئی تھی جن میں سے دور تک نظر رکھنا ممکن تھا۔ ان کے سامنے کوئی آدھے کلومیٹر تک ٹیلے هی ٹیلے تھے۔ پیچھے کو کوئی سو قدم پر لارچ کے پیڑوں کا ایک گھنا کنج تھا۔ کورلان ریچھ کے پنجوں کے نشان کے پاس هی بیٹھ گیا اور اس کے نوجوان ساتھی نے کھاڑی کے کنارے پر ایک جگه چنی جو بوڑھے سے کوئی ۵۰ قدم پر تھی۔

اس وقت تک سورج گھنے جنگل کے اس پار اٹھی هوئی نیلی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ آسمان پر خون کے سے رنگ کے گھنے بادل کے لکے تھے۔ کھاڑی کی طرف سے مرطوب هوا آ رهی تھی۔

بھیگی ریت کی ٹھنڈ جسم میں سرایت کئے جا رهی تھی اور لگتا تھا که ریڑھ کی هڈی سے اوپر چڑھتی جا رهی هے۔ ایک هی حالت میں دیر تک

خاکون نے بتایا، ''ریچھ مارا گیا۔ ''
کورلان پھر بیہوش ہو گیا۔
اگلی بار جب اسے ہوش آیا تو وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا، پٹیوں میں پوری طرح لپٹا ہوا۔ کمرے میں بہت سے لوگ تھے لیکن ان کی طرف اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سرخ سرخ دھبے تیر رہے تھے اور ان سرخ تیرتے ہوئے دھبوں کے پس منظر میں بوڑھے کو اپنی زندگی نظر آئی۔ کورلان نے اپنی عمر میں بہت کچھ دیکھا۔ بچپن میں وہ خانہ‌بدوشوں کے پڑاؤ میں ایک اندھیرے ڈیرے میں رہا جس میں صرف چھت میں ایک سوراخ تھا دھواں نکلنے کےلئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پورے پورے پڑاؤ مختلف وباؤں میں تباہ ہو گئے۔ کورلان جب بڑا ہوا تو ایک روسی سوداگر کےلئے شکاری بن گیا۔ پھر کچھ لوگ آگئے، سرخ ستارے لگی ہوئی عجیب طرح کی ٹوپیاں پہنے اور ان کے آتے ہی دولت‌مند لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ نیوخی سب اجتماعی فارموں میں شامل ہو گئے اور ان کے ساتھ ایوینک اور اوروچ قومیت‌والے بھی۔ اور سب ایک دوست‌دار خاندان کی طرح رہنے لگے۔
...سر چکرا رہا تھا۔ متلی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے دھبے تیرتے رہے۔ ایک دھبے میں اس کو اپنا بیٹا نظر آیا بالکل ویسے ہی جیسے فوٹو

کورلان نے بندوق سنبھال لی۔ تجربہ کار اور چوکنے درندے کےلئے اتنا کافی تھا۔ اس نے یہ حرکت محسوس کر لی اور اپنی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔

زور سے گولی دغنے کی آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔ گولی چلنے سے نکلا ہوا دھواں شکاری کے سامنے منڈلا رہا تھا۔ اچانک اس بادل کے ادھر سے غضبناک ریچھ کا بڑا سا سر جھپٹ پڑا۔ وہ اتنا قریب تھا کہ کورلان کو ریچھ کی گردن پر سفید بال صاف نظر آئے۔ شکاری نے بندوق بالکل اس پر تان لی۔

اور ایسا لگتا ھے کہ یہ قصور بڑھاپے کا تھا کہ شکاری گولی نہ چلا سکا۔ سینے پر ایک زبردست دھکے نے اسے زمین پر گرا دیا۔

* * *

...گاڑی کے ھچکولوں سے کورلان کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑیبان کی جگہ پر زرکون بیٹھا ھوا تھا اور خاکون گاڑی سے لگا ھوا پیدل چل رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بوڑھے کو ھوش آگیا ھے تو اس نے گھوڑے کو تھام کر گاڑی کھڑی کر دی۔

شکاری کے پھٹے ھوئے ھونٹوں نے حرکت کی لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

کے پورے مشرقی ساحل کا چکر لگایا تھا اور مغرب کے ساحل پر بھی گیا تھا اور میف تینگر پر بھی گیا تھا جو زمین کا سر ہے*۔ لیکن وہ ان نیلی پہاڑیوں پر کبھی نہیں گیا تھا جو سخالین کے وسطی حصے میں کھڑی ہیں۔ پرانے زمانے کے نیوخی کہتے تھے کہ سب سے بلند پہاڑ پر پہاڑوں کا راجہ پالیزنگ رہتا ہے اور ریچھ اسی کے کتے ہیں۔ انھیں پالیزنگ اپنے پاس لے جاتا ہے اور وہ پالنونگون بن جاتے ہیں — پہاڑوں کی مخلوق، جو سب سے خوش لوگ ہوتے ہیں اور اپنے زندہ رشتہ‌داروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں وہاں کس قسم کی خوشی ہوگی؟

اس کا گلا سوکھ رہا تھا، سانس نہیں سما رہی تھی۔ بوڑھے کے نیلے پڑے ہوئے زرد ہونٹوں نے بہ‌مشکل سنائی دینےوالی آواز میں کہا، ''مجھے کھلی ہوا میں لےچلو!''

''اف! کتنی زیادہ روشنی ہے! آسمان کبھی نیلا ہو جاتا ہے کبھی لال۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اور پہاڑیاں! پہاڑیاں نیلی ہیں، اتنی نیلی ہیں کہ پہلے کبھی اتنی نیلی نہ ہوئی تھیں۔ وہ بہت دوری پر ہیں، بہت بلند ہیں اور نیلی ہیں، نیلی بہت نیلی۔

---

* جزیرہ نمائے شمت کا نیوخی نام ہے ''میف تینگر''، جس کے معنی ہوتے ہیں زمین کا سر۔ ایڈیٹر

میں نظر آتا تھا — فوجی وردی میں اسنائپر کی
رائفل لئے ہوئے اور ''تمغۂ بہادری،، لگائے ہوئے۔
وہ روسی دریا والگا کے کنارے دفن ہے۔ کیسی
عجیب بات ہے۔ والگا کیا ہمارے دریا تیم سے
بڑا ہے؟ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میرا
بیٹا نئی نیوخی بستیوں کو نہ دیکھ پایا، بہت سے
گھروں‌والی عمارتوں میں رہنے کا اسے موقع ہی
نہ ملا۔ ایسے گھر تو ریاست نے ہر نیوخی خاندان
کو دئے ہیں۔

میری کنپٹیاں تپک رہی ہیں۔ نہیں، شاید یہ
فارم کا نیا موٹر لانچ ہوگا جو انہیں گرمیوں میں
تو خریدا گیا ہے۔ بہت شور مچاتا ہے۔ ماہی گیروں
کو کہیں لے جا رہا ہوگا۔ اس کے شور سے تو
سر پھٹا جا رہا ہے۔

سر چکرا رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی
ہے اور ہر چیز تیر رہی ہے۔ پھر سے وہ دھبے
تیرنے لگے۔ پھر متلی۔ خاکون جوان ہے۔ وہ
طاقتور اور ہمت‌والا ہے۔ اس کے پاس نئی قرابین
ہونا ضروری ہے۔

کہیں گولیاں چل رہی ہیں۔ نہیں، یہ تو اجتماعی
فارم کا بجلی گھر چل رہا ہے۔ روشنیاں اور دھبے،
دھبے اور روشنیاں۔ ابھی تو دن کا وقت ہے۔
تو یہ بجلی گھر کیوں چل رہا ہے۔ شور سے سر
میں درد ہو رہا ہے۔

کورلان بہت گھوما پھرا تھا۔ اس نے سخالین
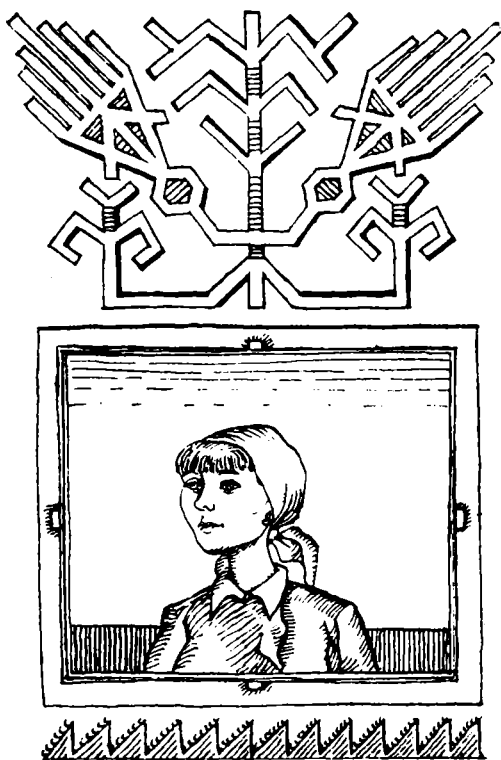
الکسیئی تالویر

کام کا پہلا دن

کورلان نے انھیں پاس سے نہیں دیکھا تھا۔ وهاں کبھی گیا هی نه تھا۔

یه کس نے اسے بانهوں میں اٹھا لیا؟

بوڑھے نے ابھر کر سانس لی۔ اس کے چوڑے سینے میں سے سانس آنی بند هو گئی۔

خاکون نے بہت سنبھال کر اسے پھر بستر پر لٹا دیا۔

ہے ہی خیال ہوا تھا کہ کارخانے میں ہر شخص
ے ۔ن پسند نکمی سمجھےگا اور اس سے ایسا
کام کروانے کی کوشش کرےگا جس میں کم
ے کم ذمہداری ہو ۔

فورسین نے اپنی میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو
دیکھنے کےلئے عینک لگائی، ''تو تمھارا نام کیا ہے؟،،

''باکولینا ۔،،

''باکولینا؟ ذرا ٹھہرنا تو ۔ تم انجینیر نکیتا
برسولائیوچ باکولین کی رشتہدار تو نہیں ہو
جو اسٹامپنگ سیکشن میں کام کرتے ہیں ۔ خاندانی
نام تو تمھارا بھی وہی ہے ۔ ،،

''وہ میرے والد ہیں ۔ ،،

''اچ... چھا،، فورسین نے ذرا کھینچ کر کہا اور
اپنی مایوسی کا اظہار کیا ۔ اس نے اپنی عینک اتار
لی اور ان سے گردن کھجاتے ہوئے لڑکی کو اور زیادہ
ناپسندیدگی کے ساتھ دیکھا ۔ ظاہر ہے کہ ٹکنیکل کالج
میں لڑکی کا داخلہ ذہانت کی وجہ سے تھوڑا ہی ہوا
ہوگا ۔ اور اب بھگتو اس کو...

''بھئی، تم میری بات سنو تو یہ پینل کنٹرولر کا
کام تمھارے لئے نہیں ہے! ایسا بھی تو ہوسکتا ہے
کہ تمھیں کہیں آسان کام پر لگا دیا جائے؟ ورکشاپ
کے مینجر کی سکرٹری بننا چاہتی ہو؟ پینل کنٹرولر
ہی کہلاؤگی، وہی تنخواہ تمھیں ملےگی اور رسپشن روم
میں بیٹھا کروگی ۔ قاعدے کے حساب سے وہاں کےلئے
سکرٹری منظور نہیں ہے تو ہم وہاں ٹائم کیپروں اور

فورمین نے الیوتینا کے دبتے قد کے دبلے پتلے جسم کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بغیر کسی جوش یا خوشی کے کہا، ''ہماری مشہور ہستی، فولادساز ویکتر سیخائیلووچ ایلکوژاروف کے بارے میں تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ تو اب تم انھیں کے ساتھ کام کروگی، چھٹی بھٹی پر۔ یہ سچ ہے کہ آدمی وہ بہت تند اور سخت گیر ہیں لیکن انصاف پسند ہیں۔ تو بس تم یہ سمجھو کہ خوش قسمت ہو بشرطیکہ کام، جیسا کہ چاہئے، جی جان سے کرو۔''

الیوتینا بوکھلا گئی۔ اس نے تو آج تک کسی ایلکوژاروف کا نام بھی نہ سنا تھا، اپنے خصوصی ٹکنیکی کالج میں بھی نہیں۔ حالانکہ وہ سارے اخبار پڑھتی تھی اور ٹیلی‌ویژن کا اطلاعاتی پروگرام ''وریمیا،، (وقت) ضرور دیکھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہر بڑے آدمی کے بارے میں جانتی ہے، خلانورد، دل کا پیوند لگانےوالے سرجن، ہوائی جہازوں کے ڈزائن‌ساز اور فلمی ستارے... اس پر اسے فخر بھی تھا۔ لیکن پتہ یہ چلا کہ دنیا میں اور بھی لوگ ہیں جو کم شہرت‌یافتہ نہیں ہیں۔ خود اس کے اپنے شہر میں اور وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی...

''کیا بات ہے؟ تمھیں پینل کنٹرولر کی ذمہ‌داری پسند نہیں ہے؟،، فورمین نے لڑکی کو بوکھلائے ہوئے دیکھ‌کر پرامید انداز میں پوچھا۔

''نہیں، نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے!،، اس کو

تھی۔ اس کے بائیں طرف ایک بند جگہ میں جس کا دروازہ لوہے کا تھا، ٹرانسفارسر لگا تھا۔ ٹرانسفارسر اور بھٹی کے بیچ میں ایک چھوٹا سا حجرہ تھا جس میں کنٹرول پینل تھا۔

فورمین نے الیوتینا کو ڈیوٹی‌والی پینل کنٹرولر سے ملایا، قواعد و ضوابط کی کتاب اور پالی کے اوقات مختصراً سمجھائے اور بس حجرے سے باھر نکل آیا۔ حیوتینا بھی اس کے ساتھ ھی باھر آگئی۔

بھٹی کے پاس دو آدمی مصروف تھے۔ ایک لمبا، سیدھا اور چوڑے کندھوں‌والا تھا اور دوسرا چھوٹا اور گول‌مٹول۔ دونوں کرمچ کے جیکٹ، ڈھیلے ڈھالے پتلون اور موٹے موٹے تلوں‌والے بھاری جوتے پہنے تھے۔ اور پیشانی پر چوڑے چھجے‌والی ٹوپی کے نیچے حفاظتی عینک ربڑ کے تسموں سے بندھی ھوئی تھی۔

اس میں تو کوئی شک نہ تھا کہ انھیں میں سے ایک مشہور فولادساز ھے اور دوسرا اس کا اسسٹنٹ۔ لیکن ان میں سے کون ایلکوژاروف تھا؟

فورمین نے لمبے قدوالے سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے فورمین کی طرف توجہ ھی نہیں کی اور بھٹی کے پاس جاکر اس کا دروازہ کھول دیا۔ لگتا تھا یہ تعارف کےلئے صحیح وقت نہیں تھا۔ الیوتینا ایک سکتے کے عالم میں فولادسازوں کو کام کرتے دیکھتی رھی۔ دھکتی ھوئی آگ کی روشنی میں وہ خاص طور سے شاندار لگ رھے تھے۔ پھر لمبے قدوالے نے دو میٹر لمبے دستے‌والی کرچھی پکڑی اور

کوٹا مقرر کرنےوالیوں کو لگا دیتے ھیں۔ اپنے ناخنوں پر پالش کر سکتی ہو، ھیر اسٹائل جیسا چاھے بنا سکتی ہو، اسکرٹ بس اتنا... سال بھر میں شادی کر لوگی، ھوسکتا ھے پہلے ھی۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت ھے۔ پتہ ھے تمھیں ھم تم جیسی کتنی لڑکیوں کو وھاں بٹھا چکے ھیں اور سب کی سب جھپٹ لی گئیں۔ آخری‌والی تو ابھی چند دن ہوئے ایک لفٹننٹ سے شادی کرکے جزائر کریل چلی گئی۔،،

الیوتینا نے برا مان کر کہا، ’’مجھے کہیں بھی لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ھے۔ جو کام میں نے سیکھا ھے وھی کام میں کروں‌گی۔،،

’’اچھا، اچھا،، فورسین نے بالکل‌ھی بیدلی سے کہا لیکن اب وہ لڑکی کو کچھ اور ھی طرح سے دیکھ رھا تھا۔ ’’تو چلو چھٹی بھٹی پر چلتے ھیں۔ میں ایلکوژاروف سے تمھیں ملا دیتا ہوں۔،،

وہ الیکٹریشینوں کے چھوٹے سے دفتر سے نکلے۔ ورکشاپ کی دیوار سے لگے ہوئے اور بالکل راستے میں پیپوں کی شکل کے ڈول، تاروں کی ریلیں، پرانی بیٹریاں، ٹوٹے بکسے، بڑھیئوں کا ٹھیا اور اس پر دو شکنجے پڑے ہوئے تھے... سیڑھی کے نیچے ویلڈنگ کے سامان کا چکر کاٹ کر وہ فاؤنڈری میں داخل ہوگئے۔ اس کے سرکس جیسے اونچے گنبد کے نیچے دو کرینیں سیال فولاد لئے ہوئے آگے جاتیں اور پیچھے آتیں۔

چھٹی بھٹی ورکشاپ کے صدر دروازے کے مقابل واقع

''مطلب یہ کہ تینا، گھر میں یہی کہتے ہیں نہ؟ اچھا نام ہے۔''

''نہیں'' لڑکی بڑے فطری انداز میں ہنس پڑی، ''گھر میں تو آلیا کہتے ہیں۔''

یلکوژاروف کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تجزیے کی رپورٹ آ گئی۔ اس نے چلا کر اپنے ساتھی سے کہا، ''مینگنیز صرف ۸ فیصدی ہے'' اور فوراً ہی، فورسین اور الیوتینا دونوں کو بھول کر دھکتی ہوئی بھٹی میں منگنیز کی کچ دھات جھونکنے لگا۔ اور بھٹی کی دوسری طرف سے اس کا اسسٹنٹ بھی اتنا ہی بڑا بیلچہ لے کر کھڑا ہو گیا۔

''اب ہم چلیں'' الیوتینا کو فورسین نے آواز دی اور اسے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں وہ ایک تجربہ‌کار پینل آپریٹر کے ساتھ کام کرلے پھر اکیلے اپنے آپ کام شروع کرے۔ الیوتینا نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ تیزی سے کنٹرول پینل والے حجرے میں گھس گئی۔ اس جگہ پر آننا چیرکاشینا جنگ کے بعد ھی سے کام کر رھی تھیں لیکن وہ کسی اور فولادساز کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ ایلکوژاروف کے ھاں ان کا تبادلہ عارضی طور پر کیا گیا تھا۔

انھوں نے الیوتینا کو امید بندھاتے ہوئے کہا، ''کوئی بات نہیں، تم اس کی عادی ہو جاؤگی۔''

الیوتینا سمجھ گئی، ''مطلب یہ کہ وہ سخت‌گیر ہیں''۔

اسے آتشیں ''کڑاھی،، میں سے نکال لیا۔ ایسفالٹ پر سیال فولاد کی جو بوند گری اس کا رنگ دودھیا تھا اور جلد ھی اس پر ایک جھلی سی چھا گئی۔ الیوتینا جانتی تھی کہ اسی جھلی کی رنگت سے فولاد کے تیار ھونے کا اندازہ لگایا جاتا ھے۔

لمبے قدوالے فولادساز نے نمونے کو تجزیے کےلئے بھیجا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اس سیدھی سادی لڑکی کو بڑی بڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی طرف تکتے ھوئے دیکھا۔

فورمین نے فوراً بتایا، ''نئی پینل کنٹرولر ... انھیں اپنی ٹولی میں لے لیجئے... سندیافتہ الیکٹریشین ھیں۔،،

فولادساز نے آھستہ سے اپنی حفاظتی ٹوپی اور عینک اتاری۔ بال ایسے بھیگے ھوئے جیسے نہا کے نکلا ھو اور چہرے پر بھی مٹر کے دانے جیسی پسینے کی بوندیں بہ رھی تھیں۔ جیکٹ کی جیب سے اس نے رومال نکال کر چہرے اور گردن پر سے پسینہ پونچھا اور پھر لڑکی کو اچھی طرح سے دیکھا جو اس کے تقریباً آدھے قد کی تھی۔

''بڑی خوشی ھوئی مل کر ... ایلکوژاروف،، اور بڑے ادب کے ساتھ طنز کے کسی شائبے کے بغیر اس نے جھک کر تعظیم کی۔

الیوتینا نے جھینپتے ھوئے اپنا ھاتھ اس کے ھاتھ میں دیا اور نام بتایا، ''باکولینا۔،،

''اور تمھارا اپنا نام؟،،

''الیوتینا۔ ،،

''کیسا رہا؟ تمھیں کام پر کہاں لگایا گیا؟
تمہاری ذمہ‌داری کیا ہوگی؟''
یہ سن کر کہ بیٹی تو ایلکوژاروف کے ساتھ کام
کرے گی. نکیتا یرسولائیوچ اپنی ناراضگی کو چھپا نہ
سکے. ''میں نے کہا تھا کہ میں بھی ساتھ چلتا ہوں
اور مینجمنٹ سے سب طے کرا دیتا ہوں۔ آخر میں نے
اس کارخانے میں اپنی زندگی کے ۲۰ سال لگائے ہیں۔''
ماں بولیں. ''آپ اس کی فکر نہ کیجئے، جہاں بھی
کرن چاہتی ہو کرے کام۔ یہ کوئی پہلی بار تو
ہے نہیں جب اس نے میرا مشورہ سنا ہے نہ تمھارا۔''
باپ نے گلاسوں میں ''ریسلنگ'' انڈیلتے ہوئے کہا،
''بات یہ نہیں ہے۔ اگر چاہتی ہے تو پینل کنٹرولر
ضرور بنے بس یہ کہ اس کے ساتھ فولادساز کوئی دوسرا
ہو۔ ایلکوژاروف کام کے معاملے میں پکا حریص
ہے۔ اسے ہمیشہ سب پر سبقت لے جانے کی عادت
ہوگئی ہے۔ اور آلیا کے پاس ابھی تجربہ ہے نہ
ہنرمندی۔ خدا نہ کرے اگر اس نے کہیں سلان
خراب کر دیا تو بس وہ تو...''
''حد ہوگئی۔ سارے دن لوگ مجھے ان ایلکوژاروف
سے ڈراتے رہے۔ لیکن مجھے تو وہ ذرا بھی ڈراؤنے
نہیں لگے بلکہ دلچسپ معلوم ہوئے۔ اور پھر آپ سب
لوگ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ میں بھی دوسروں کی
طرح کام نہیں کرسکتی؟ کیا اس لئے کہ میرا قد
چھوٹا ہے، میں چھوٹی سی پدی ہوں، جیسے کہ آپ
مجھے کہتے ہیں؟''

”خود نہیں جانتا کہ چین کیا ہوتا ہے اور دوسرے کو بھی چین نہیں لینے دیتا۔“

یہاں سے اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا کہ بھٹی پر کیا کیا جا رہا ہے۔ ایلکوژاروف نے فوری تجزیے کےلئے ایک اور نمونہ لیباریٹری بھیجا۔ تجزیے کی رپورٹ جلد ہی آگئی اور فولادساز کا چہرہ کھل اٹھا جو ہر وقت یوں لگتا تھا کہ تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ ویکتر میخائیلووچ نے پینل کنٹرولر کو برقی توانائی بند کردینے کا سگنل دیا۔ خودکار مشین فوراً ہی کام کرنے لگی۔ الیکٹروڈ ہٹایا گیا اور پھر بھٹی کا ڈھکنا اٹھایا گیا۔ دوسری گھان تیار تھی۔

الیوتینا نے رشک کے ساتھ کہا، ”آپ ہر چیز کتنی روانی سے کرلیتی ہیں۔“

آننا نے جواب دیا، ”نگاہ محتاط اور ہاتھوں میں دم ہے۔ جب بھٹی دوبارہ بھر جائے تو خاص احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہوجائے تو الیکٹروڈ ٹوٹ سکتا ہے! ایلکوژاروف اس طرح کی غلطی کو کبھی نہیں بخشتا۔“

گھر پر الیوتینا کےلئے ایک خاص دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ماں باپ یہ چاہتے تھے کہ لڑکی آج کے دن مزدوروں کے، کارخانے کے اجتماعیہ میں شامل ہو گئی ہے تو اسے جشن کی طرح منایا جائے۔ ابھی وہ چوکھٹ ہی پر تھی کہ ماں باپ نے سوالات کی بوچھار کردی:

سی بات سے دل ھی دل میں الیوتینا بھی ڈر رھی
تھی۔ یہ ٹھیک ھے کہ شام کو اس نے ایک جھپکی
لے لی تھی لیکن کون جانے آدھی رات کے بعد اس کا
کیا حال ھوگا۔

بھٹی شروع ھونے سے پہلے ھی ایلکوژاروف آئے۔ اب
الیوتینا جانتی تھی کہ انھوں نے پنج‌ساله منصوبه ساڑھے
تین ھی سال میں پورا کرلیا تھا۔ شہر کے پارک میں
ان کی تصویر لگی ھے، کارخانے کے خبرنامے میں اور
علاقائی اخبار میں ان کے بارے میں کئی بار مضامین
لکھے جا چکے ھیں اور اب تو ایک دستاویزی فلم بھی
بنائی جا رھی ھے۔

بھٹی کا چارج کارکردگی کی حالت میں لیا گیا۔
الیوتینا یہ توقع کرتی تھی کہ اب فولادساز اسے هدایتیں
دے گا لیکن ایلکوژاروف نے تو بس حجرے کے اندر
جھانکا، اس سے صاحب سلامت کی، پہلے، دوسرے اور
تیسرے فیز میں برقی رو کی شدت کو دیکھا اور
بس، کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔

جلد ھی فولاد تیار ھوکر آگیا۔ تجزیے اطمینان‌بخش
ھی رھے ھوں‌گے اس لئے کہ ایلکوژاروف نے ھاتھ کے
اشارے سے پینل کنٹرولر کو برقی توانائی بند کرنے کا
حکم دیا۔ بھٹی کی گھنگھناھٹ بند ھوگئی اور صرف
فولاد اس طرح کھدبد کھدبد کرتا رھا جیسے بہار میں
چڑھتا ھوا طوفانی دریا مچلتا رھتا ھے۔ الیوتینا نے
جلدی سے الیکٹروڈ کو ھٹایا، ڈھکنا اٹھایا اور فولادسازوں

باپ نے سمجھایا، ''ایلکوژاروف کے ساتھ دوسروں سے اچھا کام کرنے کی ضرورت ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، پھر میں بہتر ہی کام کروں گی'' بیٹی نے زور دے کر کہا۔

ماں ٹوسٹ کے طور پر فوراً بول پڑیں، ''تو ہم اسی کے نام پر پیتے ہیں کہ سب کچھ بالکل ایسا ہی ہو''، اور انہوں نے آنکھ سے اپنے شوہر کو اشارہ کیا کہ بات زیادہ نہ بڑھائیں۔

پہلی بار اکیلے ڈیوٹی کرنے کےلئے الیوتینا تیسری یعنی رات کی پالی میں آئی۔ وہ پالی شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ورکشاپ میں پہنچ گئی۔ جس پینل کنٹرولر سے اسے چارج لینا تھا اس نے شکایت کی کہ ''آدھی پالی بھر بجلی ہی نہیں تھی۔ بس دو سلان تیار کئے گئے ہیں''۔

الیوتینا کو اس سے پریشانی ہوئی۔ اگر اس کی پالی میں بھی اچانک بجلی غائب ہوگئی تو کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس میں پینل کنٹرولر کا تو کوئی قصور نہیں پھر بھی جی تو یہی چاہتا تھا کہ سب کچھ معمول کے مطابق ہو جائے۔

جلد ہی ایلکوژاروف کے اسسٹنٹ کراکوف آگئے۔

انہوں نے صاحب سلامت کرنے کی بجائے الیوتینا سے سوال کیا، ''چیف ابھی نہیں آئے؟ تو مطلب یہ کہ آج ہم استانی کے بغیر کام کریں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ خودکار مشینیں سنبھال لیتی ہیں۔ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ آنکھ نہ لگنے پائے۔''

گئیں۔ چٹختی اور سنسناتی ہوئی چنگاریاں رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں اور بس ایک ہموار گنگناھٹ رہ گئی۔ سیاہ رنگ کے گرافائٹ کا الیکٹروڈ گہرے سرخ رنگ کا ہوگیا۔ الیوتینا نے اطمینان کی سانس لی۔ مشکل کی گھڑی گذر چکی تھی اور ایلکوژاروف یا ان کے اسسٹنٹ کو اس ناخوشگوار صورت‌حال کا پتہ بھی نہ چلا تب جب اس نے سنبھال لی تھی۔ الیکٹروڈ جب بھٹی میں دھات کی موٹی پرت میں دھنس رہا تھا تو فولادساز اور ان کے اسسٹنٹ ڈھلائی سیکشن میں پانی پینے چلے گئے۔ واپس آکر وہ ریت کے ڈھیر کے سامنے بیٹھ کر پتہ نہیں کس چیز کے بارے میں بحث کرنے لگے۔ اب تو انہیں اس کے حجرے میں آکر دیکھنا چاہئے لیکن انھوں نے تو ایک بار بھی ادھر نظر تک نہ اٹھائی۔ الیوتینا کو پہلے تو یہ بات بری لگی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا مطلب یہ ھے کہ وہ لوگ اس پر بھروسا کرتے ھیں۔ وہ خوش ہوگئی اور خود بھی زیادہ اعتماد و اطمینان محسوس کرنے لگی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اب جاکر اسے خیال آیا کہ یہ تیسری بار تھی۔ وہ اپنے حجرے سے باھر نکلی، چارجنگ فلور تک گئی اور اس نے شیشے کے گنبد کو نظر اٹھاکر دیکھا۔ سیاہ مخملیں آسمان پر بڑے بڑے روشن ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ وہ فولادسازوں کی طرف گئی جو نمونے کی بوند پر کچھ چھومنتر کر رہے تھے۔ جلدی

نے بھٹی کو گڑھے کے اوپر جھکا دیا۔ دھکتا ہوا آتشیں سیال ایک زبردست ڈول میں انڈیل آیا۔

آلات کی سوئیاں صفر پر آگئیں۔ پینل کنٹرولر اپنے حجرے سے نکل آئی۔ لیکن جیسے ہی کرین آپریٹر نے چھ ٹن سیال فولاد سے بھرے ہوئے ڈول کو اٹھایا اور اسے ڈھالنےوالے پٹے پر منتقل کیا ویسے ہی پینل کنٹرولر پھر اپنے کام پر واپس آگئی۔ اس نے ایک پیڈل دبایا اور بھٹی پھر گرم کئے جانے کےلئے چارجنگ فلور پر واپس آگئی۔ تیزی سے اور بڑے اعتماد کے ساتھ اس نے اگلی کارروائیاں کیں۔ ڈھکنے کو پھر سے بند کیا اور الیکٹروڈ جوڑ دیا۔ پھر بھی وہ بڑا اعصابی تناؤ محسوس کر رہی تھی اس لئے کہ آج پہلی بار وہ اکیلی تھی اور اس قدر چاہتی تھی کہ تند، سخت گیر اور مشہور فولادساز اس کے کام سے خوش ہو۔

اچانک اس پردے کی، جس پر لکھا ہوا تھا ''ارتھ،، ، لال بتی جلنے لگی۔ الیکٹروڈ بہت زیادہ ٹنشن کی وجہ سے برقی توانائی کو آگ میں منتقل کرکے چارج کو فیوز کر رہا تھا۔ اگر الیکٹروڈ بھٹی کے اندر ارتھ سے ڈھکی ہوئی دھات سے لگ گیا تو اس کی قوت جاتی رہےگی اور وہ گرم کرنےوالے میکانزم کے دباؤ سے ٹوٹ سکتا ھے۔ الیکٹروڈ کا ٹوٹنا ایسا حادثہ سمجھا جاتا تھا جس کی ذمہداری پینل کنٹرولر پر آتی تھی۔

الیوتینا فوراً لپکی۔ اس نے الیکٹروڈ کو ذرا سا اونچا

ور وہ لڑکی کو کچھ کہنے کا وقت دئیے بغیر ھی وھاں سے چل دئیے۔

الیوتینا نے اندازہ لگایا کہ صبح ھونےوالی ھے اس لئے کہ وہ پروجیکٹر مدھم کر دئیے گئے تھے جن سے فونڈری میں روشنی رھتی تھی اور شیشے کے گنبد کا مشرقی حصہ سبزی مائل نظر آنے لگا تھا۔ جلد ھی سورج کی اولیں کرنیں افق سے بلند ھوئیں اور جگمگاتی ھوئی سیدھے حجرے میں آدھمکیں۔ پانچ بج گئے۔ مشہور فولادساز کی پیشین گوئی کے باوجود الیوتینا پہلے ھی کی طرح تازہ دم محسوس کر رھی تھی۔

تیسری اور چوتھی ملانیں بھی کامیاب رھیں۔ جب الیوتینا بھٹی کو چارجنگ فلور پر واپس پہنچا رھی تھی تو ایلکوژاروف بھاگ کر وھاں اپنے اسسٹنٹ کے پیچھے پہنچ گئے۔ وہ ھر شخص سے جلدی کروا رھے تھے اس لئے کہ وہ ایک اور ملان تیار کر دینا چاھتے تھے۔

جب کراکوف یہ انتظار کر رھے تھے کہ چارج کا بار لےکر کرین واپس آئے تو الیوتینا کئی بار بےصبری کے ساتھ اپنے حجرے سے باھر نکل نکل آئی۔ وہ محسوس کر رھی تھی کہ کرین اپنے مقناطیسی واشر سمیت اس بار بڑی سست‌رفتاری سے کام کر رھی ھے۔ اسے کرین آپریٹر پر غصہ آرھا تھا۔ کیا وہ ذرا تیز نہیں چلا سکتی! آخرکار مقناطیسی واشر چالو کیا گیا اور چارج زیادہ آسانی سے حرکت کرنے لگا۔ الیوتینا بھاگ کر کنٹرول پینل پر آگئی اور بھٹی ھمواری کے

سے وہ اپنے حجرے میں واپس آگئی ۔ ایلکوژاروف نے بجلی بند کرنے کا حکم دیا ۔ ملان کی دوسری گھان تیار ہو چکی تھی ۔

الیوتینا بڑی خوش تھی کہ فولاد اتنی جلدی تیار ہوگیا تھا ۔ چھوٹی سی دبلی پتلی لڑکی کو اچانک یہ احساس ہوا کہ اس اتنی بڑی اور روشن فاؤنڈری میں وہ ایک اہم شخص ہے جس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا !

اور اس کی ماں چاہتی تھیں کہ وہ گھریلو بجلی مستری بن جائے ! اگر وہ اس پر راضی ہو جاتی تو کیا اسے کبھی اس عظیم اور ہمہ گیر جذبے کا تجربہ ہو پاتا جو اب اس کی زندگی کو معنی اور کام کی عظیم خوشی سے بھر رہا ہے !

تیسری ملان کے دوران میں آخرکار ایلکوژاروف نے اس کے حجرے میں جھانک کر دیکھا ۔

انھوں نے پوچھا، ''نیند تو نہیں آ رہی ہے ؟ رات کی پالی کی اگر عادت نہ ہو تو بڑی مشکل ہوتی ہے ۔''

''مجھے تو خیال بھی نہیں آیا کہ میں رات کو کام کر رہی ہوں'' الیوتینا نے جواب دیا اور اس بات پر وہ بےانتہا فخر محسوس کر رہی تھی کہ خود ویکتر ایلکوژاروف اس سے بالکل برابروالوں کی طرح بات کر رہے تھے ۔

اس پر فولادساز نے کہا، ''پانچ بجے تک تمھیں خیال نہیں آئے گا لیکن اس کے بعد نیند آنے لگے گی ۔''

گئی — الیکٹروڈ ٹوٹ گیا! سورج کی کرنیں گنبد سے
غائب ہوگئیں اور اسے دل شکنی اور خالی پن کا شدید
احساس ہوا... اس کے ہاتھ ایسے بھاری ہوگئے کہ
وہ برقی رو بند کرنے کے لئے انہیں بہ مشکل اٹھا پائی۔
لیکن وہ اس قدر غافل آخر کیسے ہوگئی! جب
تک فولادساز اور اس کے اسسٹنٹ ایک نیا الیکٹروڈ
لگاتے رہے تب تک وہ لڑکی کنٹرول پینل کے پاس
بے جان سی کھڑی رہی۔ پھر ایلکوژاروف نے برقی توانائی
چالو کرنے کا سگنل دیا۔ ایمپیئر میٹر کی سوئیاں پھدک
پڑیں۔ الیکٹروڈ کام کرنے لگا لیکن الیوتینا پھر بھی
کنٹرول پینل کے پاس بے سدھ اور بے دم کھڑی رہی۔
اگلی پالی کے مزدور آنے لگے۔ ایلکوژاروف اور
کراکوف غسل خانے میں چلے گئے۔ الیوتینا نے بھی
چارج دیا، رجسٹر پر دستخط کئے لیکن جانے میں کوئی
جلدی نہیں کی اور ایسا کچھ کرتی رہی جس سے یہ
لگے کہ وہ اس چھوٹے سے حجرے کو ٹھیک ٹھاک
کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

نئی پالی والی عورت نے پوچھا، ''کہو ڈیوٹی کیسی
رہی؟''

''پانچ ملان پورے کئے...''

''خوب، مبارکباد دیتی ہوں!''

''کس بات کی! چھٹی ملان میں غافل ہوگئی اور
الیکٹروڈ توڑ دیا۔''

''ارے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ چھٹی میں!
وہ کہتے ہیں نہ کہ بڑی کامیابی کے ساتھ چھوٹی

ساتھ اپنی جگہ پر پہنچ گئی۔ اس نے بڑی بےچینی کے ساتھ سوچا، ''بس پانچویں ملان بھی تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں!،،

فولادساز بھٹی کے پاس سے گئے نہیں حالانکہ ابھی تک وھاں ان کی موجودگی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر وہ دونوں پینل کنٹرولر کے حجرے کی طرف آئے۔ چند منٹ تک وہ خاموشی سے ایمپیئر میٹر کی سوئیوں کو دیکھتے رھے اور بغیر کچھ کہے سنے چلے گئے۔ یہ ایساھی وقت تھا جب الفاظ دل کے اندر کھلبلی مچانے والے جذبات کا ساتھ نہیں دے پاتے۔

کمال ھو گیا! پانچویں ملان بھی تیار ھو گئی! اور بھلا کون یقین کر سکتا تھا کہ ابھی ۴۰ منٹ اور باقی ھیں!

ایلکوژاروف نے ھاتھ سے سگنل دیا اور بھٹی پھر ایک بار گرم کئے جانے کےلئے اپنی جگہ پر واپس پہنچ گئی۔ الیوتینا مارے خوشی کے آپے سے باھر تھی! ظاھر ھے کہ چھٹی ملان تیار کرنے کا تو سوال نہیں تھا لیکن بھٹی کو پھر سے کارکردگی کی حالت میں پہنچا دینا بھی کوئی معمولی کارنامہ نہ ھوگا۔

ڈھکنا بند کر دیا گیا اور الیکٹروڈ جوڑ دیا گیا۔ صبح کی پالی کا وقت قریب آرھا تھا۔ الیوتینا بہت خوش اور بڑے جوش میں تھی۔ اس نے میز پر سے کاغذات صاف کئے اور دیوار پر لگے ھوئے سیاحت کی مسرتیں بیان کرنےوالے پوسٹر کو سیدھا کیا۔ پھر وہ فرش کو صاف کرنے کےلئے جھکی ھی تھی کہ ایک چیخ ھوئی۔ مارے دہشت کے الیوتینا سکتے میں

کٹے ہوئے سوٹ پہنے اور گرمیوں کی ٹوپیاں لگائے تھے. جلدی سے پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ دونوں لپک کر اس کے پاس آئے۔

ویکتر میخائیلووچ نے پوچھا، ''تم کیوں ایسے ہم لوگوں کے پاس سے بھاگ کھڑی ہوئیں؟'' اور پھر بڑے خوش لہجے میں کہنے لگے، ''اور ہم نے تمہیں پوری ورکشاپ میں ڈھونڈا۔ ہم تمھیں مبارکباد دینا چاہتے تھے۔ آج تمھارا اپنے آپ کام کرنے کا پہلا دن تھا۔ اور دن بھی کیسا دن! لاؤ، ادھر اپنا ہاتھ دو...''

''ارے نہیں، آپ بھی کیا بات کرتے ہیں...'' لڑکی کا چہرہ گلابی ہوگیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر دیکھے، ''مبارکباد کس بات کی... مجھے خود پتہ نہیں کہ یہ کیسے ہوگیا... میں نے سوچا کہ ذرا فرش صاف کردوں اور اتنے میں...''

''کمال ہے، تم تو اوپر سے خاکساری بھی برت رہی ہو! اور میں آج تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں تو بڑا فکرمند تھا۔ میں نے سوچا، باپ رے، یہ بات تو چوپٹ ہوگئی! تمھیں دیکھ کر کوئی اور کیا سمجھے گا... ایسے سے بھلا کیا توقع کی جا سکتی ہے! لیکن پتہ یہ چلا کہ...'' اور اس نے الیوتینا پر پدرانہ شفقت سے بلکہ ایک طرح کی شکرگذاری کے ساتھ نظر ڈالی۔

نوجوان پینل کنٹرولر کو یقین نہیں آیا، ''تو ویکتر میخائیلووچ، کیا آپ واقعی، نہیں بالکل سچ سچ بتائیے، مجھ سے خوش ہیں؟!''

چھوٹی گڑبڑیں بھی ہوتی ہی ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ ایلکوژاروف کا ردعمل کیا تھا؟،،

''ابھی تک تو کچھ نہیں بولے۔،،

''بعد کو تمھاری خبر لیں گے۔،،

غسل‌خانے سے نکل کر اور کپڑے بدل کر الیوتینا خاص کمرے میں آگئی جہاں کانفرنسیں ہوتی تھیں۔ اب ایلکوژاروف اسے ڈانٹ بتائے گا۔ اسے اپنے باپ کی نصیحتیں اور ماں کی منت سماجت یاد آئی۔ ہوسکتا ہے انھیں کی بات ٹھیک ہو... زندگی اس کے لئے کتنی آسان ہوتی ہے جو اپنے اوپر غیرضروری ذمہ‌داریوں کا بوجھ نہیں لیتا۔

الیوتینا کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ خاص کمرے میں تو کوئی بھی نہ تھا۔ بس صرف صفائی کرنے‌والی عورت تھی۔ اور اپنے فولادسازوں سے اس کی ملاقات کارخانے کے صحن میں ہوئی نہ صدر دروازے پر۔ وہ انتظامی دفتر کے سامنے سرسبز چوک میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ گھر جانے کا بھی جی نہ چاہتا تھا۔ یہی اچھا ہوتا کہ ایلکوژاروف اس پر چیخ چلا لیتا یا یہ بھی کہ اسے اپنی ٹولی سے نکال دیتا۔ یہ غیریقینی حالت تو اور بھی بری ہے۔

''تینا!،، پہلے تو پینل کنٹرولر کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ کوئی اسی کو پکار رہا ہے۔ اس نام سے پہلے کبھی کسی نے اسے پکارا ہی نہ تھا۔ سوائے... اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہاں وہی تو تھے، ایلکوژاروف اور کراکوف! دونوں اچھی طرح استری

حلیمه بیراموکووا
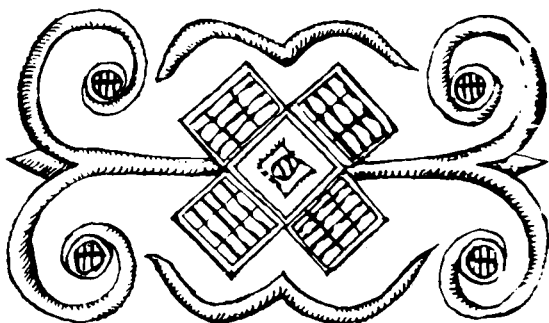
آئیران

بیچ میں کراکوف بول پڑے، ''اور تم خود اپنے آپ سے خوش ہو کہ نہیں؟،،

لڑکی نے بڑے فیصلہ کن انداز سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''دیکھ رہے ہیں آپ، کیا ہو رہا ہے!،، اسسٹنٹ سچ مچ حیران تھا۔ ''ویکٹر میخائیلووچ، تیار ہو جائیے! یہ پینل کنٹرولر ہم سے پنج‌ساله پلان دو سال میں پورا کروائے گی۔،،

الیوتینا بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی، اپنے پنجوں پر ناچ گئی، ذرا سا جھجکی، جیسے پانی میں کودنے سے پہلے خود کو سادھ رہی ہو اور پھر اچانک فیصلہ کن انداز میں اس نے جھپاک جھپاک گال چوم لئے، پہلے ایلکوژاروف کا اور پھر کراکوف کا۔

''شکریہ، آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ!،، اس نے چلا کر کہا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

دونوں فولادساز بڑی دیر تک شفقت بھری نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر دونوں میں سے پتہ نہیں کس نے بہت ہی مدھم آواز میں کہا، ''بچہ ہے، بالکل بچہ!،،

کہا ہوا تھا، ''تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے محبت
کرتا ہوں اس لئے میں آئیران کی یہ ہانڈی تمھارے لئے
قفقاز سے راجدھانی تک لایا ہوں! ایسا ہرگز نہیں
ہے! فوٹو میں اس لئے رکھ رہا ہوں کہ تم کو کچھ
پتہ آجائے چونکہ آئیران سے تمھیں اس قدر محبت
ہے... محبت کرنے کے لئے اپنی محبوب شے کو اچھی
طرح جاننا ضروری ہوتا ہے...''
عجیب بات ہے۔ کون ہے یہ؟ اور کیا الفاظ
ہیں یہ؟ تو کیا میں اپنی محبوب شے کو نہیں جانتی؟
لیکن، ٹھہرو تو... وہ کس شے کی بات کر رہا ہے؟
ہاں ٹھیک ہے... آئیران کے بارے میں۔ تو میں
سے جانتی کیسے نہیں۔ اور کچھ اور بھی میں
جانتی ہوں... اور کتنی اچھی طرح جانتی ہوں! لیکن
اس سے فائدہ کیا کہ میں جانتی ہوں، صرف میں، یوں
کہنا چاہئے کہ صرف ایک رخ... میں سچ سچ اس بات
کا شکوہ کر سکتی ہوں کہ میں خوبصورت نہیں
ہوں۔ اس بات کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیس
سال میری عمر ہو گئی اور اتنی بڑی دنیا میں کبھی
کسی نے مجھے خوبصورت نہیں کہا۔ سب کہتے
ہیں، ''صوفیہ — بڑی خاموش اور اچھی لڑکی ہے''۔
اور بس۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ لوگ جانتے نہ
ہوں کہ جب کسی کو خوبصورت کہا جاتا ہے
تو اسے یہ بات بہت اچھی لگتی ہے۔ اور لوگ ہیں
کہ بس ''خاموش ہے'' اور ''خاموش ہے'' کہتے رہتے
ہیں۔ لگتا ہے آئیران نے بھی میری مدد نہ کی۔ ہو

چھ مہینے ہو گئے کہ میں ماسکو میں ہوں۔ مجھے یہاں کے تھیٹر، عمارتیں، سڑکیں سبھی پسند ھیں۔ یہاں سبھی کچھ ھے، جو چاھے لےلو، سوائے آئیران* کے — ویسی جیسی ھمارے ھاں، کوہ البرز کے دامن میں، بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ ھمارے اپنے گاؤں خورزوک میں تیار کی جاتی ھے۔ ہو سکتا ھے وہ اس لئے اچھی ہوتی ہو کہ دودھ کا خمیر سب سے اچھا ھمارے ھاں قراچائی میں اٹھتا ھے۔ اس کے بارے میں تو میں نے خود کتابوں میں پڑھا ھے۔

کہتے ھیں کہ ھم قراچائی کے لوگ بڑے خوبصورت ہوتے ھیں۔ اور ظاھر ھے اس کی وجہ یہ ھے کہ ھم لوگ روز آئیران پیتے ھیں۔ قراچائی کے لوگ بڑی لمبی عمر تک جیتے ھیں، اور یہ بھی آئیران کی بدولت ھے۔

اور میں یہاں اکثر آئیران کو یاد کرتی رھتی ہوں۔ میرے والدین ھمیشہ خطوں میں پوچھتے ھیں کہ مجھے گھر سے کیا چاھئے اور ایک بار میں نے مذاق میں لکھ دیا، ھاں چاھئے — آئیران۔ اور پتہ ھے آپ کو، آج جو میں لیکچر کے بعد ھوسٹل لوٹ کر آئی تو ڈیوٹی‌والی عورت نے مجھے ایک ھانڈی دی اور ایک لفافہ جس پر میرا خاندانی نام لکھا ہوا تھا۔ تو لگتا ھے کہ یہ ماں باپ کے پاس سے تو نہیں آیا۔ میں نے لفافہ کھولا تو اس میں ایک انجان شخص کا فوٹو تھا جس کی پشت پر بڑے بڑے حروف میں

---

* دودھ کو کھٹا کرکے بنایا جانے والا ایک مقامی مشروب۔ ایڈیٹر

اور اسے میز پر رکھ دیا اور کوٹ اتارے بغیر ھی بیٹھ گئی۔
لڑکیاں هانڈی پر ٹوٹ پڑیں — میں نے ان سے اتنی دور آئیران کا ذکر کیا تھا۔ میں نے سر کے اشارے سے کہا، پیو جتنا جی چاھے۔ انھوں نے گلاسوں میں انڈیلا اپنے لئے اور میرے لئے بھی۔ دونوں لڑکیاں ھونٹوں تک اپنے گلاس لے گئیں لیکن انھوں نے دیکھا کہ میں اپنی جگہ سے ھلی تک نہیں۔ انھوں نے پوچھا، ''صوفیه، تجھے کیا ھوا؟،، اور کاتیا نے میری گردن میں ایک ھاتھ ڈال دیا۔
''ھوا کیا، صوفیه؟،، بی بی گل نے مجھے غور سے دیکھتے ھوئے پوچھا۔
میں نے اپنے سفید پھولوں‌والے نیلے دستانے اتارے، جیب سے اس انجان شخص کا فوٹو نکالا اور اسے هانڈی کے پاس میز پر پھینک دیا۔ اسے لینے کے لئے دونوں لڑکیوں کے ھاتھ ایک ساتھ بڑھے۔ بی بی گل نے بلند آواز سے اس پر کی عبارت پڑھی اور فوٹو کو میز پر پھینک دیا۔ دونوں لڑکیاں اس شخص کو دیکھنے لگیں جو ھمارے لئے ھزاروں کلومیٹر سے آئیران لایا تھا۔ اور وہ لگ رھا تھا کہ صرف مجھے دیکھ رھا ھے، سنجیدگی سے، بلکه کسی قدر غصے سے دیکھ رھا ھے۔ ھاں خیر مجھے تو سنجیدگی ھی سے دیکھا جا سکتا ھے، ویسے تو نہیں جیسے کسی حسینه کو دیکھا جاتا ھے، محبت بھری نظروں سے۔ اف، کس قدر برا ھوتا ھے یه جاننا بھی که تم خوبصورت نہیں ھو... دیکھ رھا ھے اور دیکھے جا رھا ھے۔

سکتا ہے میں نے کم پی ہو؟ سیکڑوں بار میں نے خود کو آئینے میں دیکھا ہے اور سچ یہی ہے کہ میں خوبصورت کہے جانے کے لائق نہیں ہوں — لمبی اور موٹی چوٹیاں جو ایڑیوں تک پہنچیں، جیسی کہ ساری پہاڑی لڑکیوں کی ہوتی ہیں، میری نہیں ہیں، بس دو چھوٹی چھوٹی بلیوں کی سی دمچیاں جھول رہی ہیں، چہرہ جھائیوں بھرا اور پیشانی ہے تو دو انگل چوڑی۔ ناک، سچ یہ ہے کہ، ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ لیکن جب سے میں نے فلم ''لڑکیاں،، دیکھی ہے تب سے میں ٹھیک ٹھیک جانتی ہوں کہ میں کیسی ہوں۔ اس میں ایک لڑکی ہے، وہ نہیں جس کی آخر میں ایکٹر ریبنیکوف کے ساتھ شادی ہو جاتی ہے، دوسری والی جس سے کلب میں ڈانس کے دوران میں کوئی بھی ساتھ ناچنے کی درخواست نہیں کرتا۔ اور بعد کو وہ اسی لڑکی کے ساتھ ناچتی ہے جس کی شادی بعد کو ریبنیکوف کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے فلم دیکھنےوالوں میں سے اس لڑکی کو کسی نے نہ دیکھا ہو، وہ تو پوری فلم میں ایک لفظ بھی نہیں بولتی، لیکن میں نے فوراً اس کو دیکھا اور یاد رکھا اس لئے کہ میری شکل اس سے کافی ملتی ہے بس یہ کہ میرے بال سیاہ ہیں اور اس کے ہلکے بھورے ہیں۔

میں نے آئیران کی ہانڈی اٹھائی اور اوپر چلی گئی۔ میں چلتی چلی گئی اور آگیا ہمارا کمرہ — نمبر ۹۲۔ میرے ساتھ کی لڑکیاں کمرے ہی میں ہیں۔

بیپ نے داخل ہوتے ہی چپکے سے کہا، ''آئیران،،

مجھے بتا رہی تھی کہ وہاں ہمارے ہاں قراچائی
میں کیا حال چال ہیں، کس نے یہ آئیران بنائی ہے،
کیسے بنائی ہے۔ یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ آسان
کام نہیں ہے۔ میں سنتی رہی۔ پیتی رہی اور سنتی
رہی۔ اور آنکھوں کے سامنے گلاس میں بلبلے تھے،
جیسے چڑیوں کی آنکھیں جو کبھی کھل جاتی تھیں اور
کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ ہو سکتا ہے یہ ہمارے پہاڑوں
کی چڑیاں ہوں جو مجھے اور میری سہیلیوں کو سلام
بھیج رہی ہیں۔ پیتی رہی۔ ہونٹ گلاس کو الگ نہیں
کر پاتے۔ میری سہیلیاں بھی پیتی رہیں۔ کاتیا اور
پی پی گل اور لینا چاہتی ہیں لیکن میں انہیں روک دیتی
ہوں۔ ''تھوڑی ٹھہر جاؤ۔ ہانڈی میں تین لیٹر سے زیادہ نہ
رہی ہوگی اور لیٹر بھر تو غالباً ہم نے پی ڈالی...،،
''تو پھر کیا ہوا؟ صوفیہ، تو کہنا کیا چاہتی
ہے کس ڈھیٹ شخص کے لئے تو نہیں رکھنا چاہتی؟،،
میں نے جواب دیا، ''نہیں، اگر میں جانتی کہ وہ
کہاں ہے تو میں اسے ساری لوٹا دیتی۔ اور اس سے
کہتی کہ 'لو اور خود اپنی محبوب شے کو اچھی
طرح سے جانو'۔ لیکن اب جب ہم نے پی لی تو میں
جانتی ہوں کہ ہمارے ہوسٹل کی ساری لڑکیاں پیئیں،
اور سب نہیں تو جتنوں کے لئے کافی ہو وہی پی لیں...،،
لڑکیاں بولیں، ''کچھ نہیں سمجھ میں آ رہا ہے کہ
تیرے دل میں کیا ہے؟،،
''اس میں نہ سمجھنے کی کون سی بات ہے؟ آئیران
سے لوگوں کو لمبی عمر ملتی ہے تو کاش اس کے قطرے

اور دیکھو ذرا اس کی فیشن ایبل ٹائی، سوٹ لگتا ہے سیاہ ہے، اکہرے سینے کا، بال ایسے جیسے ٹوپی لگا رکھی ہو، بہت سارے اور گھنگریالے۔ کاتیا چڑکر بولی:

"اپنے شروع دنوں سے فوٹو پیاری عبارت کے ساتھ دئے جاتے ہیں۔ لیکن ڈھٹائی تو دیکھو، 'یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں'۔ تمہاری محبت کےلئے سرا کون جا رہا ہے؟ ذرا یہ بھی تو بتائیے! صوفیہ کو تجھ سے اچھا آدمی مل جائےگا! میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں تو تیری آنکھیں نکال لیتی۔"

میں نے اٹھ کر گرم کوٹ اتارا۔ لڑکیاں قیاس کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے، کہاں غائب ہو گیا اور اس نے اپنا پتہ کیوں نہیں لکھا۔ یہ آئیران یہ اپنی طرف سے لایا ہے یا صوفیہ کے والدین نے بھیجی ہے؟ افوہ، آئیران کو تو بالکل ہی بھول گئے۔ اور وہ تو ہانڈی سے ابلی پڑ رہی ہے، اس میں اسے بڑی تنگی ہے اور وہ جھاگ دے رہی ہے، سنسنا رہی ہے۔ اور اس میں سے بڑی تیز مہک اٹھ رہی ہے۔ مجھے فوراً اپنے پہاڑ یاد آگئے، بیئچیسین — جو چراگاہ ہے، پہاڑی اور بہت مشہور۔

میں نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا، "لڑکیو، چلو آئیران پیتے ہیں نہیں تو وہ جلد ہی ہانڈی سے اچھل پڑےگی۔" پیتے ہی یہ لگا جیسے اس نے سرگوشیوں میں کچھ کہا، میری ناک میں چڑھ گئی اور مجھے گدگدا کر چھیڑ رہی ہے۔ اور اس نے اپنے مخصوص طریقے سے مجھے تازہ دم کر دیا۔ شاید

علاقے میں لوگ تمام سے زیادہ جیتے ہیں اور یہ
آئیرن کی وجہ سے ہے۔ تیبردہ سینی‌ٹوریم میں یہ
مریضوں کو بلاوجہ ہی نہیں دی جاتی۔،،
هم اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ کاتیا بولی،
"اب باقی آئیران کل کےلئے رہنے دو!،،
بی‌بی‌گل راضی هو گئی، ''ضرور، لیکن آؤ تھوڑی
تھوڑی سی اور پی لیں۔،،
بس تو تھوڑی هی تھوڑی پی۔ هم نے ایک
گلاس انڈیلی اور تینوں نے ایک ایک گھونٹ پی۔
آئیران اتنی خوشگوار هوتی ہے اور بھوک کو بڑھاتی
ہے۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے، مثلاً همارے لئے۔
اس کے بغیر بھی غضب کی بھوک هوتی ہے۔
پھر هم میں سے هر ایک اپنے اپنے کام میں لگ
گئی۔ مجھے فرانسیسی رٹنی تھی۔ همارے هاں
ٹکنالوجی میں بھی کوئی نه کوئی بیرونی زبان ضرور
جاننی چاهئے... مجھے کافی لفظ یاد تھے۔ بی‌بی‌گل کل
یعنی سنیچر کو تھیٹر جانے کےلئے همارے لباسوں پر
استری کرنے لگی۔ هم بیستریتسکایا کو دیکھنے
جانےوالے تھے۔ دوبارہ۔ اور تساریف کو۔ لیرمنتوف
کے ڈرامے ''نقابوں کا جشن،، میں۔ کاتیا نے اپنا بلو
پرنٹ میز پر پھیلا لیا اور اس پر بورڈپن لگا لئے۔ وہ
نقشه سازی میں لگ گئی۔ اور وهیں میز پر وہ پڑا
تھا جو آئیران لایا تھا۔ لیکن پھر میں نے دیکھا که
اس پر کچھ لکھا هوا ہے، سینے کے بائیں حصے کے
اوپر۔ میں نے کاتیا کی تحریر پہچان لی، ''ڈھیٹ،
تیرے لئے کوئی بھی لڑکی پریشان نه هوگی!،،

هماری ساتھی لڑکیوں کی عمر میں ایک بوند بھر ھی
سہی اضافه کر دیں، کاش ایک دن ھی انسان کی عمر
بڑھ جائے،، میں نے پرانے عقیدوں پر یقین کرتے ہوئے کہا۔
کاتیا نے زور دے کر کہا، ''تم کتنی اچھی ھو...
اور کتنی خوبصورت،،۔ وہ تو جانتی ھے که میں یه
آخری لفظ جتنی بار بھی سنوں میرے لئے کم ھے۔ لیکن
اچھا تو تب لگتا ھے جب لڑکے کہیں یا لڑکوں کے
سامنے کہا جائے۔ اور یہاں آپس میں کہنے سے کیا! یه
دونوں تو مجھے پیار کرتی ھیں، یه میں جانتی ھی ہوں۔
اور میں نے ھانڈی میں دیکھا۔ آئیران ایسی تھی
جیسے ھوا سے بنی ھو اور وہ امنڈ امنڈ کر اوپر آ رھی
تھی، آزادی کےلئے تڑپ رھی تھی۔ اگر میں ماسکو
کی کسی بڑی چہل پہل والی سڑک کے موڑ پر بیٹھ
جاؤں اور ھر راہ گیر کو کافی کی ایک پیالی ھی
بھر سہی آئیران پیش کروں که لیجئے، براہ کرم
پیجئے اور زیادہ دن زندہ رھئے، اپنی مقررہ عمر سے زیادہ۔
تو غالباً بہت سے ماسکو والوں کو خیال ھوگا که
پیسے دینے چاھئیں۔ خبطی لوگ! انھیں پته ھی نہیں
ھے که قراچائی میں کوئی بھی آدمی اگر پانی مانگے
تو اسے پیاله بھر آئیران پیش کی جاتی ھے۔ اور
آئیران بنانا کوئی آسان کام نہیں ھے...
ھم تینوں ھر کمرے میں آئیران لے گئے اپنی کافی
کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں۔ سبھوں نے خوشی سے
پی اور شکریه ادا کیا۔
میں نے ھر ایک سے کہا، ''لمبی عمر پاؤ! ھمارے

ـ سخت بارش والی رات کے بعد کی آئیران یاد آگئی۔
تب میں پہلی بار بیئچیسین پہاڑوں پر آئی تھی اور
ان کے حسن کو دیکھ کر بالکل وارفتہ ہو گئی تھی۔
میں نے تھوڑے ہی دن پہلے دسویں جماعت کی تعلیم
ختم کی تھی۔ اچھی طرح گائے دوھنا مجھے نہیں آتا
تھا۔ گھر میں دوھی تو تھی اپنی گائے لیکن ڈیری
اور گھر میں تو بڑا فرق ھوتا ھے۔ وھاں بہت سی
گائیں ھوتی ھیں۔ میرے پاس شاید ۱۶ تھیں۔ تب
تک ھمارے پاس دودھ دوھنے کی مشینیں نہیں تھیں،
وہ بعد کو آئیں۔ میری تین گائیں، الاکیز، سریکولک
اور کیکباش بڑی بدمزاج تھیں اور مجھے پاس ھی
نہ پھٹکنے دیتی تھیں۔ میرے ساتھ کافی دنوں تک
جھگڑتی رھیں۔ مجھے بہت برا لگتا تھا کہ میں تو
ان سے اتنا پیار کرتی ھوں اور یہ مجھے نہیں پیار
کرتیں۔ خیر لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ھوتا ھے کہ
آپ تو پیار کرتے ھیں لیکن دوسرا آپ کو پیار نہیں
کرتا... لیکن بعد کو وہ مجھ سے اتنی مانوس ھوگئیں
کہ مجھے دور سے پہچان لیتیں اور دوڑ کر آتیں کہ
میں انھیں سہلاؤں، تھپتھپاؤں۔ ایک بار مویشیوں کے
ڈاکٹر نے ھم کو بتایا کہ جانوروں سے اگر سچا پیار
کیا جائے تو وہ اسے فوراً محسوس کر لیتے ھیں۔ تو یہ
گائیں بھی مجھے اس لئے پیار کرنے لگیں کہ میں
انہیں دراصل پیار کرتی تھی۔ لیکن مویشیوں کے
ڈاکٹر نے خود پتہ نہیں کیوں سچے پیار کو محسوس
نہ کیا... اس کے بارے میں میں نے ایک اخبار کے

شاباش، کاتیا - بالکل ٹھیک - اس کو ایسا ھی چاھئے... دیلی کاتیسے — نفاست سے، دیکامبرے — دسمبر، بیل — حسینه... لو اور سنو، میں اپنی محبوب شے کو اچھی طرح نہیں جانتی! تو تم سمجھتے ھو کہ میں صرف آئیران کی محبت میں گرفتار ھوں؟ اور ھوں تو پھر؟ اور رھی آئیران کی بات تو میں تو خوب جانتی ھوں اسے... اپنی اس محبوب سے کو - آئیران بنانے کےلئے دودھ چاھئے - اور دودھ کیسے حاصل ھوتا ھے، یہ بھی ھم جانتے ھیں... معاف کیجئے گا - ماں شیر — میری پیاری، کامار اد — کامریڈ، کنسرواتوآغ — کنسرویٹری (درس‌گاہ موسیقی) - میں تو جانتی ھوں... اب اسی رات کو لےلو، دوردراز بیئچیسین پہاڑوں میں، وہ سخت بارش والی رات... ماں شیر - مون آمی - بون‌ژو ... ارے، بی‌بی‌گل، ذرا ریڈیو تیز کر دو! سن نہیں رھی ھو، رابرتینو لوریتی گا رھا ھے...

شام ھو گئی - کھڑکی سے ماسکو کی رنگ برنگی روشنیاں نظر آنے لگیں - کس قدر خوبصورت منظر کہ آدمی دیکھے اور فدا ھو جائے! لیکن اتنا کہنا کافی نہیں کہ ''فدا ھو جائے،، — آدمی اس پر ناز کرے! یہ روشنیاں خیالات کو جنم دیتی ھیں، ایسے جنھیں ''اعلی،، کہا جاتا ھے - جی چاھتا ھے کہ آدمی کوئی بلند اور اھم کارنامہ انجام دے، ناموری کےلئے نہیں، بس یوں ھی، اپنے سکون کے لئے، اپنی خوشی کےلئے - مون آمی، ماں شیر، بیل... لیکن آئیران اور وہ ڈھیٹ کسی طرح دماغ سے نہ نکلے - اور مجھے

یہ شخص کیوں سوچتا ھے کہ میں اپنی محبوب شے کو
چھی طرح جانتی نہیں - چلئے اس کی رائے میں یہ شے
حیران ھی ھے - مجھے ساری زندگی وہ سخت بارش والی
رات یاد رھےگی حالانکہ اس سے بھی سخت بارش کے
دن بھی ھوئے اور راتیں بھی - لیکن اس رات کیا
کہوں کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا، کسی قدر لگ
رہا تھا - دوپہر تک تو دھوپ رہی، بس تیز ھوا
تھی اور بیئچیسین پہاڑ لگ رھے تھے کہ خدا نے
نہیں اتنا بلند اسی لئے بنایا ھے کہ آسمان پر بیٹھے
بیٹھے ان کی خوشبو میں آسانی سے سانس لے سکے -
ھمارا چرواھا اس دن گاؤں چلا گیا تھا تاکہ زراعتی
نسٹی ٹیوٹ میں اپنے داخلے کے کاغذات بھیج دے -
اور اس کا کام لنگڑے اور بالکل بہرے بوڑھے
چوکیدار نے سنبھال لیا تھا - شام کے دوھنے کےلئے وہ
گایوں کو ھنکا کر لایا لیکن ان میں میری الاکیز نہ
دکھائی دی - مجھے پریشانی ھوئی - میں نے جلدی
سے گایوں کو دوھا اور لڑکیوں سے کہا کہ میں
جاکر دیکھتی ھوں، لالچی الاکیز یہیں کہیں چر
رہی ھوگی - بوڑھے کو ظاھر ھے کہ افسوس ھے
لیکن اس کےلئے ادھر ادھر بھاگنا مناسب نہیں ھے -
چنانچہ میں اکیلی ھی چلی گئی - چل کیا رہی تھی
سمجھئے دوڑ رہی تھی - اندھیرا ھو چلا تھا - میں
نے چلا کر آواز دی، ”ا — لا — کیز !“، کوئی جواب
نہیں - میری الاکیز کہیں بھی نہ ڈکرائی - نہ
دوڑتے بنتی تھی نہ آنسو روکے رکتے تھے، مجھے

نامہ‌نگار کو بتایا تھا جو مجھ سے انٹرویو لینے کے لئے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ ”آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ھے کہ آپ کی گائیں اتنا زیادہ دودھ دیتی ھیں؟،، میں نے بتایا کہ جانوروں سے ویسا ھی برتاؤ کرنا چاھئے جیسے انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ھے، اور بس...

یااللہ، ساتھ بج گئے اور مجھے ۱۰۰ لفظ یاد کرنے ھیں... لے کامارادِ، سون آسی...

دوسری طرف سے کاتیا بولی، ”اس شخص کو ملیشیا کے ذریعے ڈھنڈوانا چاھئے اور اس کو یہاں اپنی بیٹھک میں بلوانا چاھئے اور اس سے پوچھنا چاھئے کہ شہری، تمھارا ان لفظوں سے آخر مطلب کیا تھا؟ ذرا مہربانی کرکے ھمیں سمجھاؤ تو،،۔ اب تک میں وہ ھیمنگوے پڑھنے لگی تھی اور ھیمنگوے پڑھتے پڑھتے اگر وہ بول پڑی تو اس کا مطلب یہ ھوا کہ وہ سچ‌مچ کھول ھی رھی ھوگی۔

بی‌بی‌گل نے تائید کی، ”بالکل ٹھیک ھے، ھمیں ایک دوسرے کےلئے ڈٹ کر کھڑے ھونا چاھئے تاکہ کوئی بھی شخص ھماری ایسی توھین کرنے کی ھمت نہ کرے،،۔

میں تو اس سب کو بھول ھی جانا چاھتی تھی۔ خدا بھلا کرے اس کا، انجان ھے، مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ غائب ھوگیا تو ھو جائے۔ لیکن میرے کمرے کی لڑکیاں بڑی ھی پیاری ھیں۔ اف، میں تم دونوں کو کتنا چاھتی ھوں، کاش تمھیں پتہ ھوتا! خیر جانتی تو وہ ھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ

بڑی ۔ غنیمت یہ ہوا کہ گھاس نرم تھی ۔ میری تو
سانس بندھ گئی لیکن میں نے بچھیا کو اٹھایا اور
آگے بڑھی ۔ الاکیز پیچھے رہ گئی تھی ۔ میں نے اسے
بھیڑیے سے لڑ رہی تھی ۔ وہ
لپک کر ہمارے ساتھ آجاتی، پھر پیچھے رہ جاتی اور
پھر لپک کر ساتھ آجاتی ۔ میں دل ہی دل میں باربار
کہتی رہی، ''الاکیز میری پیاری، ہمیں چھوڑنا مت کہ
بھیڑیے چیر پھاڑ ڈالیں،، ۔ مجھے اپنے ہاتھوں کا
کچھ احساس ہی نہ رہا، وہ سن ہوکر لکڑی کے سے
ہو گئے تھے لیکن پتہ نہیں کہاں سے طاقت آگئی
تھی جو میں چلتی جا رہی تھی اور مجھے ایسا لگ
رہا تھا کہ میں بھاگ رہی ہوں ۔ اچانک بچھیا نے
اذیت آمیز آواز نکالی، یہ شاید اس لئے کہ میں نے
اپنے ناخن اس کے جسم میں گڑو دئے تھے ۔ اسی وقت
الاکیز پھر سے ہمارے پاس آگئی لیکن بھیڑیا بھی
رکا نہیں ۔ میں نے جیسے خواب میں اس کے زور سے
سانس لینے کی آواز سنی ۔ یکبارگی میں نے دیکھا کہ
بالکل میرے پاس ہی دو شعلے سے چمک رہے ہیں
اور دانت پیسنے کی بھیانک آواز آرہی ہے ۔ مجھے
فوراً خیال ہوا کہ ''ایک اور آگیا!،، میں بغیر سوچے
سمجھے پوری قوت سے چلائی ۔ الاکیز پھر سے بھیڑیے
کے ساتھ جوجھنے لگی ۔ بچھیا کو تو میں سنبھالے
ہوئے تھی لیکن الاکیز کےلئے میں بہت ڈر رہی تھی
اور سوچ رہی تھی کہ اب ہم سب یہیں ختم ہو
جائیں گے ۔ اتنے میں میں نے لوگوں کو چلاتے اور

گائے کی فکر ہو رہی تھی کہ کہیں اس پر بھیڑیوں
نے حملہ کر دیا تو... پکارتی رہی اور دوڑتی رہی
اور اس کا خیال ہی نہ آیا کہ میں فارم سے دور ہوتی
جارہی ہوں۔ اچانک میری پکار کے جواب میں ڈکرانے
کی ایک آواز آئی۔ ہاں ہاں، یہ وہی ہے! میں
ہزاروں گایوں میں اس کی آواز پہچان لوں۔ میں اور
تیز بھاگی۔ پہاڑی کے پاس مجھے کچھ سفید سفید
نظر آیا۔ میں نے پھر آواز دی۔ پھر ڈکرانے کی
آواز آئی۔ میں ادھر دوڑی اور اس نے خود کو کسی
چیز سے چھڑایا اور میری طرف بڑھی، پھر پیچھے لوٹ
گئی جیسے مجھے ادھر بلا رہی ہو۔ دیکھا کیا میں
نے کہ گھاس پر ایک بچھیا پڑی ہوئی ہے۔ باپ رے،
یہ کیا ہوا؟ ہم نے تو یہ حساب لگایا تھا کہ ابھی
الاکیز کے بیانے میں دن ہیں۔ ایسی غلطی اکثر ہو
جاتی ہے۔ اس کےلئے ہمارے مویشیوں کے ڈاکٹر
قصوروار ہیں، اور ہاں میں بھی۔ اب کیا کروں؟
میں بولی، چل اٹھ نکمی، گھر چلنا چاہئے۔ اور
بچھیا سچ سچ ایسی نکمی تھی کہ اس نے اٹھنے کا
نام ہی نہ لیا۔ اور ہم دو کے بیچ میں الاکیز بڑی
پریشانی میں تھی، اسے میرے اوپر بھی ترس آرہا
تھا اور اپنی بچھیا پر بھی۔

... جب میں نے بچھیا کو بانہوں میں اٹھایا تب
اچانک دیکھا کہ ہماری طرف کوئی چھپتے چھپاتے
آرہا ہے۔ الاکیز نے بھی فوراً خطرے کو محسوس
کر لیا۔ ڈر کے مارے بچھیا میرے ھاتھوں سے گر

نے سے ایک بار آئیران پلائی تھی اور تب بھی اس نے مجھ سے ایسی ھی بدتمیزی کی تھی...،،
دھر سے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ھم تینوں نے ایک ساتھ ھی جواب دیا، ”آ جائیے۔،،
میز پر رکھی ھوئی ھانڈی میں آئیران سنسنا رھی تھی اور اٹھ رھی تھی۔
”نمستے۔ سلام۔ میرا نام ھے آئتک۔ میں ارضیات کے انسٹی ٹیوٹ میں طالب علم ھوں۔ میں ھی تم لوگوں کے لئے صوفیہ کے والدین کے ھاں سے آئیران لایا ھوں...
میں چاھتی تھی کہ کوئی دیکھ نہ پائے اور میں میز پر سے اس کا فوٹو اٹھا لوں تاکہ وہ اس پر لکھی ھوئی عبارت کو نہ دیکھے لیکن کاتیا نے میرے بازو میں چٹکی لی اور میں نے فوٹو کو وھیں ڈال دیا جہاں وہ پہلے تھا۔
”تشریف رکھئے، ھم آپ سے درخواست کرتے ھیں،، بی بی گل نے دانت بھینچ کر کہا اور کرسی کھسکا کر میز کے قریب کر دی۔ ھماری سمجھ میں نہیں آرھا تھا کہ کیا باتیں کریں، کیا کریں۔ اس نے جو کچھ فوٹو کی پشت پر لکھا تھا اس پر ناراضگی کا اظہار کرنا چاھئے تھا۔ ھم نے آپس میں آنکھوں ھی آنکھوں میں اشارے کئے اور برس پڑنے کے لئے تیار ھی تھے کہ ھماری نگاھیں آئتک کی آنکھوں پر جم کر رہ گئیں۔ ان کی طرف توجہ نہ دینا ممکن ھی نہ تھا۔ وہ خاص طرح کی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں کیا تھیں، وہ

مجھے آواز دیتے سنا۔ لوگ مشعلیں لئے ہوئے آ رہے تھے۔ سبھوں نے آ کر ہمیں گھیر لیا۔ میں ویسے ہی کھڑی رہی، بچھیا کو نہ زمین پر رکھ پا رہی تھی نہ کسی اور کو دے پا رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے لوگوں نے میرے ہاتھوں سے بچھیا کو چھڑایا۔ الاکیز بیدم اور بےحال ہمارے پاس آئی۔ اس کی سینگوں میں بھیڑیے کے بالوں کے گچھے الجھے ہوئے تھے اور پاؤں پر ایک بہت بڑا زخم تھا، لعنتیوں نے اس بری طرح اسے دبوچا تھا...

اب وہ بچھیا بڑی ہوکر ایسی خوبصورت گائے ہو گئی ہے...

تو یوں آئیران حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ شخص جو آئیران لایا تھا سمجھ بھی نہیں سکتا کہ وہ کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اس رات کو ظاہر ہے کہ ہم نے دودھ کا خمیر اٹھانے کےلئے دیر سے رکھا اور صبح تک آئیران تیار نہیں ہو پائی تھی۔ لیکن صبح ہی کو ہماری ڈیری کے پاس سے کچھ لوگ گزرے، غالباً ارضیات کے ماہرین تھے اور انھوں نے پانی مانگا۔ میں ان کےلئے آئیران لے آئی۔ ان میں سے ایک بولا، ”لڑکی، کتنی شرم کی بات ہے کہ تم آئیران نہیں بنا سکتیں!،، اور یہ اس نے شکریے کی بجائے کہا تھا!

”اے میرے اللہ! یہ تو وہی شخص ہے!،، اس بات کو یاد کرکے میرے منہ سے اونچی آواز میں نکل گیا اور لڑکیاں حیران ہوکر مجھے تکنے لگیں۔

”میں نے اسے پہچان لیا، ارے اسی ڈھیٹ کو! میں
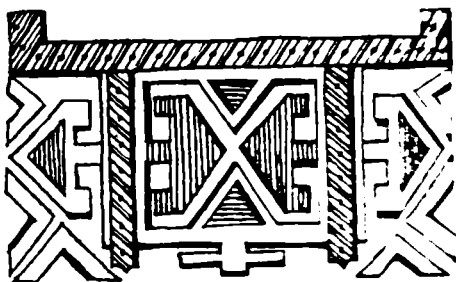
گینادی کراسیلنیکوف

انتظار

دو سورج تھے۔ دمکتی ھیں اور بس! اور ھم سب نے ان میں ایک ھی بات پڑھی۔ مجھے اس کے بارے میں لڑکیوں نے بعد کو بتایا۔ لڑکیوں نے بتایا کہ آئتک کی آنکھوں میں، جو صرف مجھے دیکھ رھی تھیں، انھوں نے بھی پڑھا تھا، ''صوفیہ، میری حسینہ! میں تمھیں بہت دنوں سے جانتا اور پیار کرتا ھوں! مجھے نرمی اور محبت سے بات کرنا نہیں آتا اسی لئے روکھے‌پن اور ڈھٹائی سے کام لیتا ھوں۔ تم سمجھتیں کیوں نہیں، میری جان، کہ میں صرف تم سے محبت کرتا ھوں۔ محبت کرتا ھوں۔''

اور میں بھی بدحواس ھوگئی، چپکے سے میں نے آئینے پر نظر ڈالی جو دیوار پر ٹنگا ھوا تھا۔ میں نے دیکھا اور مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ کیا سچ‌مچ، یہ میں ھی ھوں، صوفیہ، اتنی خوبصورت؟ گال شعلوں کی طرح دہک رہے تھے، آنکھیں جگمگا رھی تھیں جیسے بی‌بی‌گل کے کانوں میں آویزے، اور دانت ھموار اور سفید۔ کیا وہ ھمیشہ ایسے ھی تھے؟

ھانڈی میں آئیران سنسنا رھی تھی نہ اٹھ رھی تھی، بس چڑیوں کی آنکھیں اب تک مجھے دیکھ دیکھ کر جھپک رھی تھیں اور جھپکے جا رھی تھیں۔

سکو میں پڑھتا ہے۔ فیودور مشہور تو بہت دنوں سے تھا اس لئے کہ وہ بڑا اچھا سائیس تھا لیکن اب اس کی شہرت میں ایک اضافہ اور ہوگیا — مذاق نہیں ہے کوئی، اس کا بیٹا راجدھانی میں رہتا ہے، پڑھتا ہے وہاں! بہت سے لوگوں کے بیٹے بیٹیاں بڑے شہروں میں پڑھتے تھے لیکن سانکا سے پہلے ماسکو کوئی نہیں گیا تھا۔ اس کا ذکر خود فیودور ہی نہیں بلکہ سارے اکگرت والے بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ بازار میں کسی واقف کار سے ملاقات ہو جاتی ہے تو ویسے ہی باتوں باتوں میں جتا ضرور دیتے ہیں کہ "ہمارا تو ایک اپنا ماسکو میں پڑھتا ہے، فیودور کا بیٹا سانکا"۔

اسی لئے ٹیم لیڈر بھی فیودور کی بات نہ ٹال سکا۔

"چنیا ٹھیک ہے، جاؤ فیودور ایوانوویچ۔ وہاں رختی گودام سے دو سو کلوگرام رسی لے لینا اور ساتھ ہی بیٹے کو بھی لے آنا۔ رات کو وہیں ٹھہر جانا اور دوسرے دن لوٹ آنا"

فیودور نے خود بھی یہی سوچا تھا کہ اسٹیشن تک جہاں کموسیٹر کا راستہ ہے۔ ایک دن جانے کے لئے اور دوسرا دن آنے کے لئے بہت ہے۔ یہی حساب لگا کر وہ گھر سے روانہ ہوا۔ ناستیا کو ہدایت کی کہ پیلمنی* بنا کر نعمت خانے میں برف میں لگا دے تاکہ

---

* قیمہ بھرے ہوئے سموسے جو یخنی میں ابال کر تیار کئے جاتے ہیں۔ ایڈیٹر

اسٹیشن پر فیودور تین دن ایک واقف کار کے ہاں رہا۔ اس نے طے تو یہ کیا تھا کہ اگلے ہی دن گھر واپس چلا جائے گا لیکن ہوا ایسا کہ وہ دوسرے دن ٹھہر گیا اور پھر تیسرے دن بھی۔ اب تو گھوڑے کو کھلانے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا اور خود اس کے لئے بھی مشکل ہو رہی تھی، زیادہ دن ٹھہرنا پڑا اور پیسے سب خرچ ہوگئے۔ جب پیسہ تھا تو اس نے بازار سے دو من سوکھی گھاس خرید لی تھی لیکن اب وہ سب ختم ہو چکی تھی، آخری تنکا تک اس نے برلاک کو کھلا دیا تھا۔ اور گھر پر بھی سب انتظار کر کرکے تھک گئے ہوں گے۔ آخر کس لئے یہ راستہ کھوٹا ہو گیا!

... فیودور گھر میں چین سے بیٹھ سکتا تھا لیکن اس نے سنا کہ گاڑی اسٹیشن جا رہی ہے تو اس نے ٹیم لیڈر سے خود ہی کہا:

''واسیلی، لاؤ میں ہی چلا جاتا ہوں۔ بہت دنوں سے اکاگرت سے نکلا نہیں اور اب ایک وجہ بھی ہے۔''

''اور تمھارے پیچھے گھوڑوں کو کون دیکھے گا؟''

''ارے دو دن کی تو بات ہے، میری ناستیا گھوڑوں کو چارا دے دے گی'' اور پھر ٹیم لیڈر کی آستین کھینچ کر بولا، ''بات یہ ہے کہ بیٹے کو لینے کے لئے جانا چاہئے، سانکا ماسکو سے آ رہا ہے، اس نے خط بھیجا تھا۔''

اکاگرت میں سب جانتے تھے کہ فیودور کا بیٹا

جازت ملی۔ جب اس نے گودام سے رسی لی تو اندھیرا
ہو چکا تھا۔ فیودور کو بےچینی ہو رہی تھی۔
س نے گودام کے نگراں سے کہا، ''ساتھ ھی مجھے
بیٹے کو بھی ٹرین سے لینا ھے۔ وہ ماسکو سے
رہا ھے، پڑھتا ھے وھاں۔ ٹرین کےلئے مجھے دیر تو
نہیں ہو جائےگی نہ؟''
گودام کا نگراں کچھ نہیں بولا۔ اس نے جوتے
کی نوک سے رسی کی بھاری ریل کی طرف اشارہ کیا
اور غرایا، ''اس میں سے اپنے لئے لپیٹ لو...''
کسی وہ ملنسار نہیں لگ رہا تھا۔ فیودور کو اس
پر بڑا ترس آیا، ''لگتا ھے بچے پالنا بڑے کرنا اس نے
جانا ھی نہیں۔''
گودام سے فیودور اپنے ھم وطن واقف کار کے ھاں
گیا۔ سٹیشن فیودور بہت دنوں سے نہیں آیا تھا اور
اس عرصے میں پوری بستی بہت بڑھ گئی تھی۔ اپنے
گاؤں والے کے گھر تک پہنچتے پہنچتے کوئی پانچ
مرتبہ سے بڑلاک کو روک کر راستہ پوچھنا پڑا۔
گھر کے مالک نے خود ھی اس کےلئے پھاٹک
کھولا، ''اخواہ، فیودور ایوانووچ، تم کدھر سے بھول
پڑے؟ میں تو کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا کہ شاید
تمہیں ہو اور یہ بھی لگتا تھا کہ نہیں، تم نہیں
کوئی اور ھے۔ اتنے دنوں سے ھمارے ھاں آئے ھی
نہیں۔ راستہ تو نہیں بھول گئے تھے۔ آؤ آؤ، گھوڑے
کو صحن میں لے چلو، ابھی ابھی سماوار گرم ہوا
ھے۔ چائے پیتے ھیں۔''

سانکا کے آتے ھی انھیں ابالا جا سکے ۔ پڑوسیوں کو معلوم ھوا کہ فیودور اپنے بیٹے کو لانے جا رھا ھے تو انھوں نے بھی تیاریاں شروع کر دیں — آخر ماسکو سے روز روز تو مہمان اکا گرت آتے نہیں ۔

فیودور نے سانکا کا خط اپنے ساتھ لےلیا اور اسے راستے میں پھر ایک بار پڑھا ۔ سب کچھ ویسے ھی تھا جیسے ھونا چاھئے تھا ۔ سانکا نے لکھا تھا کہ اس کے امتحانات ۲۳ ویں کو ختم ھو رھے ھیں اور اگلے دن وہ ٹرین پر بیٹھ جائےگا ۔ تو جس دن اسے چلنا تھا اس حساب سے اب وہ راستے میں ھوگا اور فیودور وقت سے ٹرین پر پہنچ جائےگا ۔

فیودور گھر سے صبح سویرے بس پو پھٹتے ھی روانہ ھو گیا تھا ۔ اس نے گاڑی میں برلاک کو جوتا، جو دیکھنے میں تو چھوٹا سا اور جھبری ٹانگوں‌والا آختہ تھا اور بڑا ھی سست لگتا تھا، لیکن اپنے گھوڑوں کو فیودور سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا تھا ۔ برلاک ھو تو راستے بھر کوئی فکر نہیں، یہ آختہ تیز نہیں چلتا تھا مگر چلے جاتا تھا ۔ ۵۰ کلومیٹر چلا لو اور مجال ھے جو زین کے نیچے پسینہ تک آ جائے !

شام کے قریب وہ اسٹیشن پہنچا ۔ دفتر ابھی کھلے ھوئے تھے چنانچہ فیودور سیدھے زراعتی گودام کے دفتر میں گیا، اپنے کاغذات دکھائے تو اسے کچھ اور کاغذات دئے گئے، پھر ان پر کوئی دس لوگوں نے دستخط کئے تب فیودور کو گودام میں جانے کی

۔ ئے کہ سانکا کو تو یہ معلوم بھی نہیں ھے کہ
۔ب ۔ے لینے کےلئے اسٹیشن آ رہا ھے۔
یہ۔ں کا ریلوے اسٹیشن چھوٹا سا اور یکسنزلہ
ھے وز اس پر ھرا پینٹ کیا ھوا ھے۔ مسافرخانے
میں دو صوفے پڑے ھیں اور لکڑی کی دیوار کے
۔کی ادھر ھی اسٹیشن ماسٹر کا کیبن ھے۔ وھیں
ٹکٹ روم بھی ھے۔ مسافرخانے میں مسافروں کو
سب کچھ سنائی دیتا ھے کہ اسٹیشن ماسٹر کتنی
مرتبہ ٹیلیفون کرتا ھے۔ ٹرینیں یہاں زیادہ دیر نہیں
رکتی ھیں، ایکسپرس تین منٹ رکتی ھے اور ڈاک
گاڑی سات منٹ — سامان رکھنے کا کوئی کمرہ ھے
ھی نہیں۔ کبھی کبھار یہاں فوجی خدمت سے
سبکدوش ھونےوالا سپاھی آجاتا ھے جس کے پاس
عرب۔ل اور سوٹ‌کیس ھوتا ھے یا پھر سرکاری کام
سے کوئی آجاتا ھے تیوری چڑھائے ھوئے۔ بات یہ ھے
کہ دورافتادہ زراعتی علاقہ ھے...
بتہ گرمیوں کی شاموں کو اسٹیشن پر رونق
ھو جاتی ھے۔ بستی‌والے صاف ستھرے کپڑے
پہن کر، جیبوں میں سورج مکھی کے بیج بھر کر
پلیٹ‌فارم پر ٹہلنے آجاتے ھیں۔ بستی میں ابھی تک
بس ایک جگہ ھے جہاں ایسفالٹ کا فرش ھے اور اس
پر لڑکیوں کی گرگابیاں ویسے ھی شور کرتی ھیں
جیسے شہروں میں۔ اسٹیشن پر ھمیشہ دلچسپ ماحول
رہتا ھے، یہاں اسی تین منٹ میں بہت کچھ دیکھا
جا سکتا ھے جب ٹرین کھڑی رہتی ھے۔ ڈبوں کی

فیودور نے برلاک کو اولتی کے نیچے باندھ دیا اور اس کے ساج اتارنے لگا۔

''مجھے اسٹیشن جانا ہے۔ بیٹا گھر آ رہا ہے، ماسکو میں پڑھتا ہے۔''

''ماسکو میں؟''

''ہاں۔ جب اس نے دسواں درجہ پاس کیا تو گرمیوں بھر تو اس نے ہمارے ٹریکٹروں کے مرمت خانے میں کام کیا پھر چلا گیا۔ مجھ سے بولا کہ میں نے سوچا ہے ماسکو میں پڑھوں گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے جا، بس یہ کہ داخلے کے امتحان میں فیل نہ ہونا۔''

''تو مطلب یہ کہ فیل تو نہیں ہوا؟''

''کیسے فیل ہوتا! پچھلی گرمیوں سے وہیں رہتا ہے۔ میکینکس کا کورس کر رہا ہے۔''

بعد کو گھر کے مالک نے فیودور کو اطلاع دی کہ دن رات میں ماسکو سے آنے والی تین ٹرینیں اسٹیشن سے گزرتی ہیں۔ پہلی تو صبح سویرے آتی ہے اور کل تین منٹ رکتی ہے، دوسری شام کے قریب آتی ہے اور تیسری بالکل آدھی رات کے قریب۔ دوسری والی ابھی کوئی گھنٹے بھر میں آتی ہوگی۔

ریلوے اسٹیشن زیادہ دور تو نہیں تھا لیکن فیودور نے فوراً ہی جلدی مچانی شروع کی اور چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔ اسے یہ لگ رہا تھا کہ ٹرین جلدی آ جائے گی اور وہ سانکا سے نہیں مل پائے گا

ڈبے کے سامنے کھڑا ہوا خوش ہوکر اس جانی
پہچانی جگہ کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن فوراً ہی اسے
یہ گھبرا دینےوالا خیال آیا کہ ''کہیں وہ اپنا
سوٹ کیس نہ گم کر دے! بچہ تو ہے ابھی، کچھ
بھی ہو سکتا ہے... اب یہ دیکھو کہ کیسے سوٹ کیس
لیا اور چل دیا ماسکو۔ وہاں واقف کار، رشتہ دار
کوئی نہیں۔ اور ماسکو کی کون کہے، یہاں اس
سٹیشن پر بھی تو کوئی اپنا قریبی نہیں ہے۔ یہ
تو اچھا ہے کہ ابھی یہاں اکاگرت کا ایک آدمی
رہتا ہے نہیں تو کوئی ملنےوالا بھی نہ رہ جائےگا...
سبھی غیر ہیں... سانکا وہاں پتہ نہیں کیسا ہے؟''
پلیٹ فارم پر ایک شخص آیا، لال ٹوپی لگائے ہوئے —
سٹیشن ماسٹر اور وہی ڈیوٹی کا کام بھی کرتا تھا۔
اس نے پیتل کی گھنٹی بجائی۔ اور اس کے فوراً ہی
بعد دور کہیں جنگل کے پیچھے سے سیٹی کی آواز
آئی۔ ٹرین خود ابھی دکھائی نہیں دے رہی تھی
لیکن اس کی آواز مدھم سنائی دے رہی تھی۔ فیودور
چونک کر پلیٹ فارم کے ایسفالٹ کے فیتے پر دوڑ
پڑا تاکہ ٹرین کی اگوائی کر سکے۔
ٹرین بالکل نئی تھی۔ پالش کئے ہوئے ہتھے
جماچم کر رہے تھے اور کھڑکیوں پر سفید پردے
پڑے تھے۔ ڈبے آہستہ آہستہ چلنے لگے اور پھر
بغیر کسی شور کے رک گئے۔ مسافر سو رہے تھے۔
یہیں ماسکو کے وقت کی عادت تھی۔ کسی ڈبے
سے کوئی بھی باہر نہ نکلا۔

بڑی بڑی کھڑکیوں میں سے نظر آتا ہے کہ لوگ کیسے کھاتے ہیں، سوتے ہیں، دوسرے لوگ پڑھتے ہوتے ہیں اور پاس ہی کے کوپے میں ماں بچے کو دودھ پلا رہی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ضرور نظر آتا ہے کہ ابھی ابھی اپنے اسکول سے فارغ ہونےوالا نوجوان لفٹننٹ کیسے پیسیج میں ایک ہنستی ہوئی کنڈکٹر کے پاس کھڑا اس کے کانوں میں کچھ کہہ رہا ہے۔

... فیودور جب ریلوے اسٹیشن پہنچا تو مسافر خانے میں لکڑی کی بنچوں پر دو تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرین آنے میں آدھ گھنٹہ تھا لیکن فیودور کو بےچینی تھی۔ وہ سیاہ کوٹ‌والے آدمی کی طرف مڑا، ''گاڑی تو اب شاید جلد ہی آتی ہوگی؟،،

اس شخص نے ان‌سنےپن سے اپنا سر گھمایا، فیودور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور روکھےپن سے جواب دیا، ''۲۳ منٹ بعد۔،،

اور اس نے پھر اپنا سر کوٹ کے کالر میں چھپا لیا۔ وہ یہ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا کہ فیودور کسی سے بات کرنے کےلئے کس قدر بےقرار تھا۔

''ماسکو سے بیٹے کو آنا ہے۔ پڑھتا ہے وہاں۔،،

اوورکوٹ‌والے شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب فیودور مسافرخانے سے نکل کر دیر تک ٹائم ٹیبل کے سامنے کھڑا رہا۔ وہاں وہ اس گاڑی کو تلاش کر رہا تھا جس میں اس کے بیٹے کو آنا چاھئے۔ فیودور صاف صاف تصور کر رہا تھا کہ کیسے سانکا ٹرین کے

فیودور اسٹیشن ماسٹر کے پاس آیا اور دروازے میں
کھڑا ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر دیر تک ٹیلیفون پر
باتیں کرتا رہا، کنکھیوں سے فیودور کو دیکھتا رہا
اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ اس نے دیکھا نہیں۔ باتیں
ختم کرنے کے بعد اس نے اپنی لال ٹوپی کو کھسکا کر
ماتھے پر کیا اور کرخت آواز میں پوچھا، "کیا چاہئے،
کامریڈ؟ ٹکٹ والی کھڑکی پر جاؤ! وہاں سب
کے لئے کافی ٹکٹ ہیں۔"
فیودور نے ہاتھ میں لئے ہوئے خط اور لفافے کو
مسلتے ہوئے کہنا شروع کیا، "بات یہ ہے کہ...
میرا بیٹا سانک نہیں آیا۔ اسی گاڑی پر اسے آنا چاہئے
تھا لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں... وہ ماسکو میں
پڑھتا ہے۔"
"کیا، کیا؟" اسٹیشن ماسٹر کی کچھ سمجھ میں
نہ آیا۔
"میں نے کہا کہ سانک نہیں آیا۔ ماسکو سے اسے
آنا چاہئے تھا..."
ایک منٹ بھر تو اسٹیشن ماسٹر فیودور کو اس طرح
دیکھتا رہا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو پھر اس
نے لال ٹوپی کھسکا کر دوبارہ ماتھے پر کر لی۔
"ہوں ہوں۔ کچھ نہیں سمجھ میں آتا کہ تمھارا
سانک کیوں نہیں آیا۔ سخت تعجب کی بات ہے! ابھی
تک تو ہمارے اسٹیشن پر لوگ خیریت سے پہنچ
جاتے تھے۔ ہوں، اب اس کی جانچ کرنی پڑے گی۔"
ظاہر ہے کہ نہ پہنچنے والے مسافروں کی تلاش

فیودور بوکھلا بوکھلا کر دیکھتا رہا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سانکا اسے نظر نہ آئے۔ اب تک نکلا کیوں نہیں، کیا اور دور آگے جانے کی سوچ رہا ہے؟

لیکن کوئی بھی نہ اترا۔ فیودور نے بھاگتے ہوئے پوری ٹرین کے دو چکر لگائے لیکن بیٹا کہیں نظر نہ آیا۔ ڈبوں کے اندر سکون تھا۔ صرف پیسیج میں ایک نوجوان لفٹننٹ کنڈکٹر کے پاس کھڑا تھا اور دونوں پتہ نہیں کیوں ہنس رہے تھے۔ فیودور کو دیکھ کر لفٹننٹ نے زور سے کہا:

''بابا، کیا ٹکٹ کے بغیر سفر کرنا چاہتے ہو؟ آؤ ادھر، ڈھونڈتے ہیں ابھی جگہ تمھارے لئے۔'' اور پھر اس نے کنڈکٹر سے مخاطب ہوکر پوچھا، ''کیوں، بابا کو لے چلیں گے؟''

لڑکی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی، ''ضرور لے چلیں گے، اگر تم یہاں اتر جاؤ تو۔''

پھر سے دو مرتبہ گھنٹی بجی اور انجن کی سیٹی نے اس کا جواب دیا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈبوں کو سوتے سے جگا دیا گیا ہے اور وہ بادل ناخواستہ دھیرے دھیرے چلے جا رہے ہیں۔ فیودور بوکھلاہٹ میں ڈبوں کے برابر برابر دوڑتا چلا جا رہا تھا لیکن جلد ہی وہ رک گیا اور وہیں کھڑا رہا۔ معلوم نہیں کیوں وہ اپنی ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ آخری ڈبے کی سرخ آنکھ جھپکنے لگی اور پھر وہ بھی موڑ تک جاکر غائب ہوگئی۔ ٹرین جا چکی تھی۔

کرنا اسٹیشن ماسٹر کے فرائض میں نہیں تھا لیکن وہ یا تو فیودور کے چہرے کی مایوسی اور پریشانی دیکھ کر متاثر ہوگیا تھا یا پھر کوئی اور وجہ رہی ہوگی، بہرحال بڑے تحمل کے ساتھ سانکا کے بارے میں پوری الجھی ہوئی کہانی آخر تک سنی۔

''مطلب یہ ہے کہ تار اس نے نہیں دیا؟ تم خط کے مطابق اسے لےجانے کے لئے آگئے؟ تو بات تو صاف ہے۔ مطلب یہ کہ آجائےگا!،، اس نے بڑے یقین کے ساتھ اعلان کیا اور ٹوپی پھر کھسکا کر پیچھے کرلی۔ ''اگلی گاڑی تک انتظار کرتے ہیں۔ کوئی بات نہیں، بابا، پریشان مت ہو، ہم تمھارے سانکا کو ڈھونڈ لیںگے!،،

اگلی ٹرین کے انتظار میں فیودور اکیلا مسافر خانے میں رہ گیا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے دیوار کے اس طرف سے کئی بار جھانک کر دیکھا اور فیودور کو دوستانہ انداز میں آنکھ ماری:

''انتظار ہو رہا ہے؟ ٹرین اب آنے ہیوالی ہے۔ پچھلے اسٹیشن سے روانہ ہو چکی ہے۔ وقت پر آ رہی ہے۔،،

فیودور نے سوچا، ''خوش مزاج آدمی ہے، دوسرا ہوتا تو سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ صاف لگتا ہے کہ دردمند اور خوددار آدمی ہے۔،،

آدھی رات کے قریب ماسکووالی ڈاک گاڑی آئی۔ نیند میں ڈوبی ہوئی اور جماہیاں لیتی ہوئی کنڈکٹروں نے اسٹیشن ماسٹر کو اور اس کے پیچھے پیچھے لپکتے

دوسرے دن شام تک میں اسٹیشن پر ہر ایک کو
پتہ ہو گیا کہ فیودور بیٹے کا انتظار کر رہا ہے اور
وہ ابھی تک نہیں آیا۔ سانکا کا خط اتنے ہاتھوں میں
پہنچ چکا تھا کہ بالکل خستہ ہوگیا تھا۔ سب نے
بڑی حیرت کا اظہار کیا اور فیودور سے ہمدردی
کی۔ "تعجب کی بات ہے کہ وہ ابھی تک نہیں آیا...
شاید سانکا... اس کو رکنا پڑ گیا ہوگا، اور کچھ
کہہ ہی نہیں سکتا، کچھ بھی کہو، ماسکو پھر
ماسکو ہی ہے، لوگ تو تمہیں معلوم ہی ہے وہاں
کتنے ہیں؟ اکیلا آدمی تو وہاں ایسے ہوتا ہے
جیسے گھاس کے ڈھیر میں سوئی"۔ فیودور کو یہ
بات بڑی بری لگی۔ یہ کیا بات ہوئی کہ سانکا نہ ہوا
گھاس کے ڈھیر میں سوئی ہو گئی!.. اکگرت کے
اسٹیشن پر تو سب اسے جانتے ہیں لیکن وہاں — وہ سوئی
ہے اور بس۔

کسی انجن ڈرائیور نے، جو سر سے پاؤں تک تیل
میں — لت پت تھا، تجویز کیا کہ اسے تلاش کرنے
کے لئے آدمی بھیجے جائیں۔ لیکن خود فیودور نے کہا
کہ یہ بیکار ہوگا، اس لئے کہ سانک لازمی طور پر چل
پڑا ہوگا اور راستے میں ہوگا۔ اور تار دے کر لوگوں
کو خواہ مخواہ پریشان کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور
عینک لگائے ہوئے اور اچھا اوورکوٹ پہنے ہوئے ایک
صاحب نے کہا کہ وہ سانک کے انسٹی ٹیوٹ میں ٹیلی فون
کر سکتے ہیں کہ اس کا باپ اس قدر پریشان ہے۔
جس سے فیودور کو شرمندگی ہونے لگی اور مضحکہ خیز

ہے کہ انتظار کرنا چاھئے۔ ایسے جیتے جاگتے آدمی غائب کہاں ھو جائے گا؟،،

دوسرا دن ھوا — سخت پالا تھا اور آسمان صاف تھا۔ ھوا ایسی ٹھنڈی تھی کہ حلق میں پھندا سا لگتا اور کھانسی آ جاتی۔ فیودور سویرے ھی اسٹیشن پر آ گیا۔ کل والے مرد کی جگہ آج لال ٹوپی پہنے ھوئے ایک نوجوان سی لڑکی آئی۔ اس کے گول چہرے پر لال ٹوپی خوب سج رھی تھی۔ کیبن میں وہ سارے وقت گاتی رھتی، گانے کی دھن تو ھر بار مختلف ھوتی لیکن الفاظ ھمیشہ وھی رھتے: ’’ترام۔ پا۔ پا۔ پاپا...،،

اس نے مسافر خانے میں جھانک کر دیکھا جہاں فیودور بیٹھا تھا اور کسی پرانے واقف کار کی طرح بولی، ’’تو ماسکو سے بیٹے کے آنے کا آپ انتظار کر رھے ھیں؟ ھاں مجھے بتایا گیا۔ ماسکو والی گاڑی تھوڑی ھی دیر میں آ جائے گی اور بیٹے سے ملاقات ھو جائے گی۔،،

سارے دن فیودور اسٹیشن ھی پر انتظار کرتا رھا، گاڑیوں کو دیکھتا اور انھیں رخصت کرتا رھا۔ سانکا کسی میں سے نہ اترا۔ فیودور اپنے آپ سے الجھتا، ’’آخر اس کو ایسا کیا ھو گیا۔ وہ تو خوددار آدمی ھے اور برا بھلا کہنے کا موقع کسی کو دیتا نہیں۔ لیکن اب کون جانے، چلا گیا اتنی دور، اکا گرت میں اس کے لئے کافی جگہ نہیں تھی۔ اف سانکا، سانکا!..،،

- ... بوڑھے کو بیٹا نہیں آیا اس لئے اس نے کچھ
... نہیں ۔
... نے خود ہی ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ''گھر
... ہیں۔ وہاں لوگ میرا انتظار کر کر کے تھک
گئے ہونگے ... پھر گھاس بھی ختم ہوگئی ہے ۔
... کو کھلانے کے لئے کچھ نہیں رہا...''
... گیں۔ گھر پر لوگ آپ کےلئے پریشان
... گے ۔ یہاں تو پانچ منٹ اگر ٹرین لیٹ ہو جاتی
... ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ پھر ٹائم ٹیبل
... ہیں؟ لیجئے، وہ ماسکو سے ڈاک گاڑی
... ۔ ٹھیک وقت سے آ رہی ہے! ترام ۔ پا ۔ پا ۔
..

... رک گئی ۔ پلیٹ‌فارم خالی تھا، صرف ایک
... ایک نوجوان جس کا سوٹ‌کیس پرانا سا
... ۔ یہ ... نہیں تھا ۔ سات منٹ بعد ٹرین
... ہوگئی ۔ سوٹ کیس لئے ہوئے نوجوان
... ادھر دیکھ رہا تھا، پھر
... فیودور کے پاس آیا ۔ اس نے
... کو مخاطب کرکے پوچھا، ''سنئے، اس وقت
... موٹرگاڑی سسنوفکا جاتی ہے؟''
... ادھر کہاں جائےگی ۔ یوں سمجھو کہ
... تو مہینےبھر سے نہیں جاتی ۔ برف بہت ہے ۔ ''
... نے دوبارہ کہا، ''موٹریں تو اب بہت دنوں سے
... ہیں ۔ ''
نوجوان کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار

بات لگی کہ بالکل انجان اور غیر لوگ سانکا کے بارے میں اس طرح سوچتے ھیں جیسے وہ ان کا کوئی ھو۔ ظاھر ھے کہ اگر وہ لوگ اکاگرت کے ھوتے تو دوسری بات تھی لیکن ان لوگوں کو تو فیودور نے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ اس سے فیودور کو بڑی خوشی اور تقویت ھوئی، ''تم سمجھتے کیا ھو، لوگ ھیں جو سینے میں دل رکھتے ھیں، کمی نہیں ھے ایسے لوگوں کی جو انسان کے درد کو محسوس کر سکتے ھیں۔''

فیودور مسافر خانے میں بیٹھا تھا، لال ٹوپی والی خوش‌مزاج لڑکی دوڑ دوڑ کر ادھر ادھر کئی بار گئی اور آتے جاتے ھر بار پوچھتی، ''ابھی تک نہیں آیا؟ لیکن آپ پریشان مت ھوئیے۔ اس کا جی چاھا ھوگا کہ امتحانوں کے بعد ذرا ماسکو کی سیر کرلے، یا ھو سکتا ھے کوئی جان پہچان‌والی لڑکی ھو اور وہ نہ آنے دیتی ھو۔ کہیں آپ کے بغیر وھاں اس نے شادی بھی نہ کرلی ھو...''

تیسرے دن فیودور نے گھر جانے کی تیاری کی۔ اب اور زیادہ انتظار کرنا ممکن نہ تھا، سوکھی گھاس ختم ھو چکی تھی، اور پھر ناستیا کی بھی فکر تھی کہ وھاں وہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کیسے کر رھی ھوگی؟ جانے سے پہلے وہ گھوڑا گاڑی لےکر اسٹیشن پر گیا۔ اس نے سوچا ماسکو سے آنےوالی گاڑی کو آخری بار دیکھ لے۔ ''کون جانے، شاید آ ھی جائے۔'' ڈیوٹی پر وھی خوش مزاج لڑکی تھی۔ اس نے فوراً ھی بھانپ

ہوگئے۔ اس نے چڑ کر کہا، ''شیطان ہی جانے اب میں یہ ۷۰ کلومیٹر کا سفر کیسے کروں گا! ماسکو سے ہزاروں کلومیٹر کا سفر کرنا آسان تھا،،۔

فیودور چونک کر اس کی طرف مڑ گیا، ''تو تم ماسکو سے آئے ہو؟ اچھا تو یہ بات ہے! میرے بیٹے کو بھی آنا چاہئے تھا، کہیں رک گیا لگتا ہے۔ وہ ماسکو میں پڑھتا ہے۔ اس کا نام ہے سانکا۔ ہو سکتا ہے تم اسے جانتے ہو؟ کیوں؟،،

فیودور نے امید بھری نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھا اور سوچا کہ وہ سانکا کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا، آخر وہ بھی تو ماسکو ہی میں رہتا ہے!

نوجوان اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ اس نے سر ہلا کر انکار کیا، ''نہیں، میں تو اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا... وہاں تو ہماری طرح کے ہزاروں طالب‌علم ہیں۔،،

یہ بات فیودور کی سمجھ میں نہ آئی اور اسے بری بھی لگی، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکا سانکا کو نہیں جانتا؟ ماسکو میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ اور وہ خود فیودور تو اپنے علاقے کے تقریباً ہر شخص کو جانتا ہے اور علاقہ کوئی چھوٹا نہیں ہے، اس میں بھی بہت لوگ رہتے ہیں۔

نوجوان طالب علم نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور جانے کا ارادہ کرنے لگا۔ فیودور نے اس کا ہاتھ پکڑا، ''لڑکے، ذرا بات تو سننا... اب تم جاؤگے کیسے۔

بالکل هی نیم جان هوگیا۔ ترام۔ پا۔

نوجوان طالب علم کو رسی کی ریلوں کے
اس طرح هوا سے بھی ذرا بچاؤ
ماسکو کے بارے میں بہت سے
کیسے رهتے سہتے هیں، اور طالب
کر بیچ بیچ میں حیرت کا بھی
هے بھئی، حد هو گئی یه تو!،،
تو نہیں تھی پھر بھی طالب علم نے
کے انھا لئے تھے اور فیودور
بغیر هی اس کے سوالوں کا جواب

جیسی طرح رهتا هے۔ انسٹی‌ٹیوٹ بڑا
علم بھی اچھے هیں۔ هوسٹل
هے اور وهاں ان لوگوں
هے۔۔۔

جیسی طرح تصور کر سکتا تھا که
کیسے رهتا هے۔ وه خود هی خود
سے محبت بھری آواز میں بولا،
چلا چل، گھر تو اب قریب آگیا
هے۔

چپ هو گیا تھا۔ اس کو دیکھ
نے سوچا، ''شاید اپنا پوستین مجھے اس کو
کہیں سردی نه کھا جائے''۔ شام کو
جائیں گے۔ رات کو یه همارے هی

آ گیا ہو۔ بولا کہ ''سانکا... ہوں... شاید میں اس سے کہیں ملا تو ہوں۔ وہ ایسا ہے... ذرا دبتے قد کا؟''

''ہاں ہاں، میں نے کہا نہ کہ چھوٹے ہی قد کا ہے!''

''اس کا منہ... دبلا پتلا ہے، اور آنکھیں نیلی؟ ارے ہاں، وہی ہے!''

نوجوان طالب علم نے پھر فیودور کو غور سے دیکھا تاکہ سانکا کا حلیہ زیادہ اچھی طرح بیان کر سکے۔

''مطلب یہ کہ تم سانکا کو جانتے ہو؟'' فیودور نے مطمئن ہوکر پوچھا۔ ''تو یاد آگیا نہ تمھیں؟''

''ہاں، کیوں نہیں؟ وہاں جلدی ایک دوسرے سے جان پہچان ہو جاتی ہے۔ طالب علم ہوتے ہی ایسے ہیں۔''

فیودور کا جی خوش ہوا کہ ایک ایسے شخص سے ملاقات ہو گئی جو سانکا کو جانتا ہے۔ ذرا دیر کےلئے اسے ایسا لگا کہ جیسے سانکا خود ہی آگیا ہو۔

جب وہ اسٹیشن کے پاس سے گزرے تو لال ٹوپی والی لڑکی پیچھے سے چلائی، ''آگیا نہ؟ دیکھا آپ نے، میں نے پہلے ہی کہا تھا!''

فیودور مڑا اور اس نے چلاکر بتایا تو کہ یہ سانکا نہیں ہے لیکن ٹھیک اسی وقت ایک چھوٹے سے شنٹنگ انجن نے زور سے سیٹی بجائی اور لڑکی کو کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ اس نے سوچا، ''سانکا تو
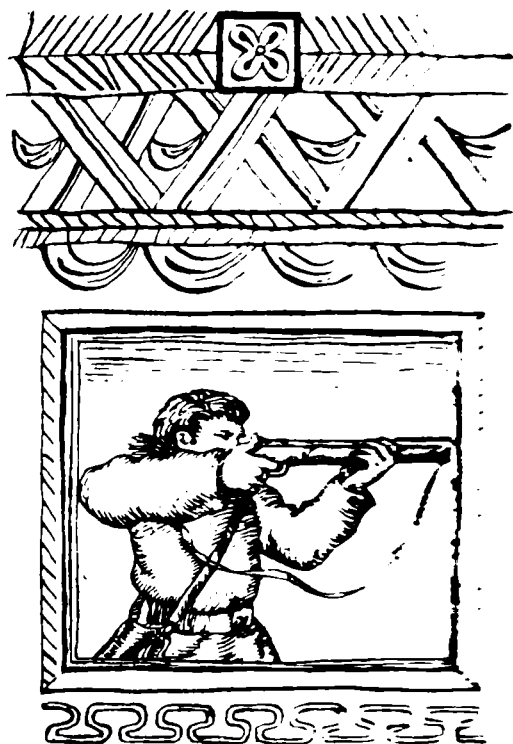
سالچک توکا

بھیڑیوں کا شکار

ھاں رہ جائے گا۔ ناستیا اسے پلمنی کھلائے گی اور سانکا کو جب بعد کو معلوم ھوگا کہ ھم نے اس کے دوست کی خاطر کی تو وہ خوش ھوگا۔ اور سانکا کے بارے میں تو اس نے سب اچھی ھی باتیں کہی ھیں، مطلب یہ کہ اس کا اچھا دوست ھے...،،

فیودور بس ایک بات نہ سمجھ پایا کہ اس نوجوان نے یہ کیسے کہا کہ سانکا کی آنکھیں نیلی ھیں۔ لیکن اس نے اس بات پر زیادہ حیرت نہیں کی۔ کون جانے شاید سانکا بدل ھی گیا ھو۔ شاید اسے گھر آنے کی بھی جلدی نہیں ھے۔ اسے ماسکو ھی میں اچھا لگتا ھے۔ اب اس کےلئے ھر جگہ آبائی گھر کی طرح ھے... سانکا اب دوسرا ھی آدمی ھو گیا۔ ھو سکتا ھے آنکھیں بھی نیلی ھو گئی ھوں۔ آخر خود فیودور کی آنکھیں بھی تو بچپن میں کالی تھیں مگر بڑھاپے میں مٹیالی نیلی ھو گئیں جیسے خزاں کا آسمان...

تووا میں سفر کرتے ہوئے ایک بار میری ملاقات مویشی پالن کے مشہور ماہر چمیان سے ہوئی۔ اس وقت ممتاز شکاری اور بھیڑیوں کو ختم کرنے کے صلے میں اول انعام یافتہ کی حیثیت سے ان کی شہرت ان کے اجتماعی فارم سے باہر دور دور تک پہنچ چکی تھی۔

چمیان ایک پہاڑی پر ٹیلوں کے ایک طویل سلسلے کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے بھیڑوں کے گلے پر نظر رکھے تھے۔ سورج برف‌پوش چوٹیوں کے پیچھے آدھا چھپ چکا تھا اور استیپ کی گھاس اور پھول پوری طرح ایک سنہرے نور میں ڈوبے ہوئے تھے۔

مویشی‌پالن کے مشہور ماہر نے مجھے سلام کرکے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے مجھ سے اپنے پاس ہی گھاس پر بیٹھنے کو کہا۔

ہم دیر تک خاموش بیٹھے بجھتے ہوئے دن کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے رنگوں سے محظوظ ہوتے رہے۔

پھر وہ بولے، ”دیکھو، یہ پہاڑ کتنے خوبصورت ھیں جو ھمیں گھیرے ہوئے ھیں اور یہ ندی کیسے چاندی کی طرح دمکتی ھے اور چوٹیوں کے بیچ سے بل کھاتی ہوئی اپنا راستہ بناتی ھے۔ تووا کے قدرتی مناظر کس قدر حسین ھیں۔“

میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھی چمیان کی نگاھیں دور پر ترمراتے ہوئے ندی کے فیتے پر جمی رھیں جس کے پاس ان کی بھیڑوں کے گلے میں کچھ گھبرائی ہوئی سی حرکت ہوئی جیسے لہریں لیتی ہوئی

اور پھر جہاں جی چاہے لگا لو... ویسے میرے پاس اجتماعی فارم میں مکان بھی ہے، وہاں بھی ضرور آنا... اب میں خانہ‌بدوش نہیں ہوں،، چمیان نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔ ہم نے سبز چائے پی اور باتیں کیں۔

میں نے پوچھا، ''چمیان یہ بتاؤ کہ تم اتنے بڑے شکاری کیسے بن گئے؟،،

اس نے جواب دیا، ''میں بڑا شکاری ہرگز نہیں ہوں۔ میں تو بس اولور خیریل کا شاگرد ہوں جو تووا میں بھیڑیے کے سب سے اچھے شکاری ہیں۔ چاہو تو میں تمھیں خیریل کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔،،

اور چمیان نے مجھے بڑے اطمینان اور بڑی تفصیل سے اپنی اور اولور خیریل کی یادگار ملاقات کا واقعہ سنایا۔

* * *

یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ نومبر کا مہینہ ختم ہونے‌والا تھا۔ اور شدید پالا روز بروز اور زیادہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ جاڑوں کی چراگاہوں میں اپنے اجتماعی فارم کے مویشیوں کی حفاظت کرنا ہمارے لئے بڑا مشکل ہوگیا تھا۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت بھیڑیے تھے جو مویشیوں کے لئے لعنت بنے ہوئے تھے۔ ہمارے اجتماعی فارم کے مویشیوں کے شعبے کا بڑا نقصان ہو رہا تھا۔ میں بہادری کے لئے ممتاز تھا نہ شکار کی صلاحیت کے لئے۔ تو میں بھیڑیوں کے شکار کو کیا جاتا۔

تھی۔ یہ میں جانتا ہوں کہ جاڑے سے تو ہم انہیں بچا لیں گے۔ لیکن بھیڑیوں سے کیسے بچائیں گے، عقل کچھ کام نہیں کرتی۔،،

بیوی نے جواب دیا، ،،اچھے لوگوں سے، شکاریوں سے صلاح کرنی چاہئے۔ اچھے شکاری کوک کراکوں کو ختم کرنے میں ہمیشہ مدد کرتے ہیں۔،،

ہماری باتچیت آکال کے دیر تک زوروں سے بھونکنے کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

میری بیوی یورتے سے باہر بھاگی اور چلائی، ،،افوہ، پھر بھیڑیے آگئے!،،

میں نے جھپٹ کر اپنی بندوق لی اور باڑے کی طرف لپکا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں نے گولی داغ دی لیکن یہ میں اب بھی نہیں بتا سکتا کہ ایسا میں نے کیوں کیا۔ صرف یہ یاد ہے کہ گولی چلنے سے باڑے پر اجالا ہو گیا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔

اندھیری رات تھی اور ستارے خوب جگمگا رہے تھے پھر بھی مجھے کوئی بھی چیز دکھائی نہ دی۔ پالا تیز سوئیوں کی طرح گالوں میں چبھ رہا تھا۔ صرف آکال کی آواز سے سناٹا ٹوٹ جاتا تھا۔ اس کی بھونک پہلے دور سے سنائی دے رہی تھی پھر برابر قریب تر آتی گئی۔ لگتا تھا کہ آکال بھیڑیوں کا سامنا کرنے کےلئے لپکا تو لیکن اکیلے اس نے لڑائی نہیں کی اور باڑے کے پاس واپس لوٹ آیا۔

میں نے کہا، ،،بڑھیا تو کلھاڑی لے آ۔ میرے پاس

''دیکھو یار میرے، تمھارا کام ہے گھوڑوں پر زین کسنا اور راستہ دکھانا۔ باقی سب کچھ شکاری کا راز ہے۔''

''زین تو کس دوں گا لیکن آپ مذاق نہ کیجئے۔ رات کو بھیڑیوں کے شکار کی بھی خوب رہی!''

خیریل نے برا مان کر کہا، ''مذاق کی اس میں کیا بات ہے۔ تمھارے کتے نے بھونکنا شروع کیا اور تم نے چلا دی گولی۔ یہ ہو سکتا ہے مذاق رہا ہو لیکن میرے لئے تو مذاق کی کوئی بات نہیں۔''

جب میں گھوڑوں پر زین کسنے چلا تو غالباً آدھی رات ہو چکی تھی۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ باگ ڈور سے بندھے ہوئے گھوڑوں تک اندھیرے میں بڑی مشکل سے پہنچا۔ میری آہٹ سن کر وہ دوستانہ انداز میں آہستہ سے ہنہنائے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس طرح کی رات میں ہم کہاں جائیں گے؟ پتہ نہیں اس بیوقوف نے کیا ٹھانی ہے! لیکن فوراً ہی اس کی مذاق اڑانے والی ہنسی یاد آگئی اور میں نے جلدی جلدی گھوڑوں پر زین کسی۔

خیریل روانہ ہونے کےلئے تیار تھے۔ ان کے ہم‌سفر چین سے سو رہے تھے۔

میں نے اپنی بندوق نہیں لی۔ جب گولی نہیں ہے تو لے جانے سے فائدہ ہی کیا، لٹکی رہے وہیں باڑھ سے۔ خیریل کے پاس بہت اچھی قسم کی شکاری قرابین تھی۔

ہم سناٹے میں چپ چاپ چلتے رہے۔ صرف گھوڑوں

اس خیال سے گولی چلانے کا فیصلہ کیا کہ وہ پڑاؤ کے پاس نہ آئیں۔ ان حرامخوروں نے تو ناک میں دم کر دیا! آپ کچھ ہماری مدد نہیں کر سکتے؟''

اولور خیریل سمجھ گئے کہ میں نے ڈر کے مارے گولی چلا دی تھی اور انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا،

''تو تمھارے خیال میں یہ بھیڑیے کہاں ہیں؟''

''یورتوں کے جھنڈ کے چاروں طرف، ہر جگہ ہیں۔ ہر رات کو آ جاتے ہیں اور دن میں قراشات پر رہتے ہیں۔ ابھی کل ہی رات کو کراؤلوف کی تین بھیڑوں کے گلے پھاڑ کے رکھ دئے اور دو کی تو انتڑیاں نکال لیں۔ ایک بھیڑ کو مار ڈالا، یورتے سے کوئی سو گز گھسیٹ لے گئے اور کھاپی کر چلتے بنے۔''

''کدھر، کس راستے سے گئے وہ؟''

''قراشات کی طرف۔ وہاں ہمیشہ بہت سے بھیڑیے ہوتے ہیں۔''

''تو پھر یوں کرتے ہیں کہ چائے پی کر اچھی طرح گرم کپڑے پہنتے ہیں اور قراشات کی طرف چلتے ہیں۔''

''کیا ابھی؟ رات کو؟''

''ہاں، ہاں ابھی۔ تم تو رات ہی میں 'شکار' کر رہے تھے! تمھارے پاس گھوڑے تو ہیں نہ؟'' خیریل نے پہلی ہی والی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

''گھوڑے تو ہیں لیکن ہم اندھیرے میں شکار کیسے کریں گے؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اچانک خیریل نے
بھیڑیے کی بولی بلند کی۔ سر کو نیچے جھکا کر
انھوں نے ہتھیلیوں سے منہ کو ڈھک لیا تاکہ بولی کی
آواز ہلکی ہو جائے اور لگے کہ دور سے آ رہی ہے۔
آہستہ سے وہ ذرا سا اٹھے اور پھر فوراً ہی زمین پر
جھک کر انھوں نے ڈری ہوئی سی طویل بولی بلند کی،
"او۔ او۔ او... آ۔ آ۔ آ... او۔ او..."

ان کی بولی میں اور بھیڑیے کی بولی میں کسی طرح
بھی ذرا سا بھی فرق نہ کیا جا سکتا تھا۔

خیریل نے پہلے پچھم کی طرف منہ کرکے بولی لگائی
اور پھر خوش ہوکر چپکے سے کہا، "سنا، میرے
دوست جواب دے رہے ہیں!"

میں نے کان لگائے۔ کہیں دور ہم سے کئی
کلومیٹر کے فاصلے پر بھیڑیوں کا غول جواب میں بول
رہا تھا۔ ان کی بولی بھی اسی طرح دبی دبی اور طویل
تھی اور اتنی ہی شکایتی جیسی خیریل کی تھی۔ لیکن
وہ تھوڑی دیر بعد رک جاتے تھے۔ ظاہر تھا
کہ وہ بھی سن رہے تھے۔

خیریل نے یقین کے ساتھ کہا، "صرف پانچ بھیڑیے
ہمیں جواب دے رہے ہیں۔ وہ زیادہ دور نہیں ہیں لیکن
ہمیں ان کے تعاقب میں جانے کی ضرورت نہیں ہے..."

خیریل پورب کی طرف مڑے اور منہ پر ہاتھ رکھ
کر بالکل دوسری آواز میں بولی بلند کی۔

میں جلد ہی سمجھ گیا کہ ادھر بھیڑیے زیادہ ہیں۔
میرا ہاتھ فوراً ہی اپنے واحد ہتھیار یعنی خنجر پر

کے پھنکارنے کی اور ان کی ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔

جب ہم قراشات کی چوٹی پر پہنچے تو خیریل نے بہت ھی مدھم آواز میں پوچھا، ''خاص چوٹی یہی ھے؟''

میں نے جواب دیا، ''سب سے اونچا پہاڑ یہی ھے۔''

''اور پہاڑ کے دامن میں یورتے ھیں؟''

''ھاں، تین یورتے ھیں۔''

''مطلب یہ کہ ھمارا ڈیرا یہیں ھوگا''، خیریل نے کہا اور اترے، ''تو پھر اترو گھوڑے سے!''، میری ھچکچاھٹ کو دیکھتے ھوئے انھوں نے سختی سے کہا، ''شکار شروع کرنے کا وقت آگیا۔ یا گھوڑے کی پیٹھ ھی پر رات بتانے کا ارادہ ھے؟''

میں نے چڑ کر کہا، ''رات بتانی ھو کہ نہ بتانی ھو، لیکن آپ کا یہ شکار میری سمجھ سے باھر ھے۔ کبھی نہیں دیکھا میں نے کہ لوگ رات کو شکار کرتے ھوں۔''

''گھبراؤ مت، بات بہت سیدھی سادی ھے۔''

اپنے پائپ کو جوتے کی نوک سے پھٹپھٹا کر خیریل نے سلگایا اور پھر اپنے گھوڑے کی لگام مجھے تھما دی۔ بیٹھ کر انھوں نے ھاتھوں کو کنپٹیوں پر رکھا اور دیر تک افق کو گھورتے رھے۔ انھوں نے پورب کی طرف اور پچھم کی طرف والی پہاڑی ڈھلانوں کی طرف اشارہ کرتے ھوئے پھر سوال کیا کہ مجھے ٹھیک معلوم ھے نہ کہ وھاں یورتوں کے جھنڈ ھیں اور گلے چرتے ھیں۔

یہ چاہتا تھا کہ ان درندوں کے بیچ میں سونے
... سے جنھیں خیریل نے خود ھی اندھیرے
... ھے، خیریل کا دھیان ھٹا دوں اور میں
... کے مختلف طریقوں، اور خودکار سامانوں،
... زھروں اور بھیڑیوں کے گڑھوں کے بارے
... کرنی شروع کر دی۔ آخر میں میں نے
... سے اچھا طریقہ تو ھانکے کا شکار کرنا
ھے۔ ... بچ کر نہیں نکل سکتا۔،،
... اچھے ھیں بشرطیکہ ان کو برت
... مل جائے۔ اور وھی ھم اور تم
... گے۔۔۔
... طرح پوستین میں لپیٹا اور
... جیسے بھیڑیوں کے پاس نہیں بلکہ اپنے
... سے سو رھے ھیں۔
... کوشش کی کہ آنکھ لگ جائے لیکن
... کرتا ویسے ھی نیند اڑ جاتی۔
... چونک پڑا اس لئے کہ مجھے ایسا لگا
... وہ یہیں میرے سامنے ھی کھڑے
... میں یہ تصور کر رھا تھا کہ وہ چاروں طرف
... کر آگئے تھے اور اب پیٹ کے بل دبکے
... آھستہ ھماری طرف رینگ رھے ھیں۔
... ھم سفر بےخبر خراٹے لے رھا تھا۔
... رھا تھا کہ یہ رات کبھی ختم ھی نہ
... تڑکا ھو ھی گیا! اس دن وہ خاص

پڑا - خنجر بڑا اور تیز تھا، اس سے بھیڑیے کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا -

''ٹھہرو ذرا''، خیریل کی آواز نے مجھے اپنی بوکھلاہٹ سے چونکا دیا، ''سنا تم نے، یہ بھی ہم لوگوں کو نظر انداز نہیں کر رہے ہیں - جوابی بولی بلند کر رہے ہیں - یہ بھی زیادہ دور نہیں ہیں، کوئی دو کلومیٹر پر ہوں گے - وہاں تین ہیں - مطلب یہ کہ سب ملا کر آٹھ -''

میں نے حیرت سے پوچھا، ''لیکن آپ انھیں گن کیسے لیتے ہیں؟ دکھائی تو کچھ دیتا نہیں!''

''لیکن آواز! آواز تو ہر ایک کی اپنی ہوتی ہے - اب چند گھنٹوں کی جھپکی لی جا سکتی ہے -''

ہم وہاں سے کوئی دو سو گز ہٹ آئے - ایک نشیب میں لارچ کے نئے نئے پودے اگے ہوئے تھے - رات گزارنے کےلئے یہ مناسب جگہ تھی -

میں نے گھوڑوں کو باندھ کر پوچھا، ''اب ہم کیا کریں گے؟''

''کیا مطلب؟ ارے آرام کریں گے - بس یہ کہ سوتے نہ رہ جائیں - اگر تمھاری آنکھ مجھ سے پہلے کھل جائے تو پو پھٹتے ہی مجھے جگا دینا - پہاڑوں پر روشنی کی جب پہلی چھوٹ پڑتی ہے تو رات کو شکار کرنےوالے جانور اپنی اپنی چھپنے کی جگہ کی طرف بھاگتے ہیں - اور ہم تم آرام‌دہ جگہ چھانٹ لیں گے - جانوروں کو خود ہی بھاگ کر ہمارے پاس آنے دو -''

ـــ ـــ لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی خاص بات ہوئی
ـ ـــ۔ انہوں نے اطمینان سے اس سمت میں دیکھا
ـــ ــ بھیڑیوں کی بولی سنائی دی تھی۔
بھیڑیے دیکھ رہے ہو؟''
ـ تو میں نے سنی تھی لیکن دکھائی تو کچھ
ـــ ـہ ـے رہا تھا۔
یہ ہیں وہاں، تین بھیڑیے، ایک بڑا ہے، چٹان کے
ـــ ـــ میں بیٹھا ہے، دوسرا ٹیلے پر پڑا ہے اور
ـــ ـہ ـے، ٹیبے کی اوٹ میں، صرف اس کے کان
ـــ ـــ ـــ رہے ہیں۔''
ـــ ـے بھی ـــ گڑوئیں لیکن ہزار کوشش کے
ـــ کچھ بھی ـــ نہ دیا۔ میں نے کہا،
ـــ کو بھیڑیوں کا وہم ہو رہا ہے۔ وہ کہیں
ـــ ـــ ـــ بند کر رہے ہیں۔''
ـ بھی کیسے ناسمجھ ہو۔ وہ پاس ہیں،
ـــ
ـــ ـے بھی قرابین اٹھائی اور شست باندھی،
ـ ـــ ـــ سے دیکھو... اب دکھائی دے
ـ رہے ..
ـــ ـے جھک کر قرابین کی شست بین سے آنکھ
ـــ۔ چٹان کے پاس بہت بڑا بھیڑیا بیٹھا تھا۔ باقیوں
ـــ دیکھنے کی میں نے کوشش ہی نہیں کی۔
ـــ میں نے خیریل کو دے دی اور خود زمین سے
ـــ ـــ۔
خیریل نشانہ لگائیے، نہیں تو بھاگ جائیں گے...''

طور سے روشن اور رنگا رنگ تھا جیسے نیند سے جاگتی ہوئی زمین کو دیکھ کر مسکرا رہا ہو۔

میں نے آہستہ سے خیریل کو جگایا، ''اٹھئے، اجالا ہو رہا ہے!،، وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھے ''ہاں، وقت ہوگیا۔ تم گھوڑے سنبھالو!،، انھوں نے جلدی جلدی کہا اور آنکھیں مل مل کر دور تک نگاہ دوڑائی۔

ہم نے گھوڑے فوراً تیار کر لئے۔ رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خیریل نے ہاتھ ہلاکر ایک طرف کو اشارہ کیا، ''ہم اس پہاڑی کے اوپر چلیں گے۔ سوار ہو جاؤ۔ جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔،،

جس جگہ کے بارے میں خیریل نے طے کیا تھا اس سے کوئی بیس میٹر پر انھوں نے گھوڑا روک لیا اور چاروں ہاتھ پاؤں پر رینگتے ہوئے چوٹی کی طرف چلے۔ میں بھی جلدی سے ان کے پیچھے ہو لیا۔

انھوں نے مجھے روک دیا، ''لیٹ جاؤ اور اس پہاڑی پر نظر رکھنا۔،،

اور فوراً ہی خیریل نے رات ہی کی طرح پھر زمین کی طرف جھک کر منہ کو ہاتھوں سے چھپایا اور ایک لمبی فریادی بولی بلند کی۔ جب کوئی جواب نہ سنائی دیا تو انھوں نے سر اٹھا کر آواز اور اونچی کر دی لیکن اچانک ہی اسے توڑ دیا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا جب تھوڑی ہی دور پر سے نیلی آنکھوں والوں کی جوابی بولی سنائی دی۔ لیکن

ـبـ ۔ جھپٹنے کےلئے وہ تیار ھی ھوا تھا کہ... ٹھیک
ـ ـحے گولی دغی ۔
بھیڑیا سر کے بل قلابازی کھا گیا اور اپنے اگلے
ـحوں پر گھوم گھوم کر عجیب سی بولی نکالنے لگا
ـ کتے کے چچیانے اور غرانے سے ملتی جلتی تھی ۔
ـیں اپنا سارا ڈر بھول گیا اور اکڑوں بیٹھ گیا ۔
ـک زور کے دھکے سے میں پھر حقیقت کی دنیا میں
ـ گیا ۔ درد اور غیر متوقع پن کی وجہ سے میری
چیخ نکتے نکلتے رہ گئی ۔ خیریل کے مضبوط ھاتھ نے
ـجھے دبا کر زمین سے چمٹا دیا ۔
ـبڑا شکاری بنا ھے! ڈرا دےگا ان کو!،، خیریل نے
ـجھے دبائے دبائے سرگوشی میں کہا ۔
دو اور بھیڑیے ھماری طرف دوڑے چلے آ رھے تھے،
ـک آگے تھا اور دوسرا اس سے تھوڑا پیچھے ۔ کسی
چیز کی طرف، یہاں تک کہ ھماری طرف بھی توجہ
ـے بغیر اگےوالا بھیڑیا سیدھا زخمی بھیڑیے کی طرف
ـ ـ ـ ـ تھا ۔ وہ اس کے رونے چلانے کی آواز
ـ ـ ـ ـ ـے خون کی مہک پر جا رھا تھا ۔
ـ بھیڑیے سے اسی وقت دکھائی دیا جب وہ پہاڑی
ـ چوٹی پر پہنچ گیا ۔ بھیڑیا رک گیا ۔ صاف ظاھر
ـ کہ وہ یہ طے کر رھا ھے کہ اب آگے کیا کرنا
ـ ـ ۔ لیکن ٹھیک اسی وقت دوسری گولی چلی ۔
ـ ـ ـک طرف کو گھوم گیا، گر پڑا، سر اٹھا کر
ـ ـ ـک چیخ ماری اور موت سے پہلے کے تشنج
ـ ـ ـ جھٹکا اور ٹھنڈا ھوگیا ۔

''ایسی صورت میں جلدی کرنے سے بڑی بیوقوفی اور کوئی نہیں ہوتی۔ سارا شکار برباد ہو جائے گا۔ اچھا یہ ہوگا کہ انھیں اور پاس بلائیں۔ آواز پر وہ بالکل بھیڑوں کی طرح دوڑے آئیں گے۔''

زمین پر گرکر خیریل نے اور زیادہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی بلند کی، ''او۔ او۔ او... او۔ او۔ او...''

پھر انھوں نے قرابین اٹھائی، اس کا گھوڑا چڑھایا اور ساکت بیٹھ گئے۔ چند سکنڈ گزرے اور خیریل نے اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلے بغیر مجھے ٹہوکا دیا اور انگلی سے پہاڑی کے نیچے دیکھنے کے لئے اشارہ کیا۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکا کہ بھاگ نہ کھڑا ہوں۔ بڑاوالا خرانٹ بھیڑیا باقیوں سے الگ ہو کر ہماری طرف تیزی سے بڑھا آ رہا تھا اور بار بار ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔ آدھ کلومیٹر کے بعد بھیڑیا رک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔

تب خیریل نے سر کو اور نیچے کرکے، تقریباً زمین سے لگ کر پھر بولی بلند کی۔ اس بار بولی بالکل ہی ہلکی، اکھڑی اکھڑی اور فریادی انداز میں باریک تھی۔

بھیڑیا زوروں میں ہماری طرف لپکا۔ اب وہ مڑ کر پیچھے بھی نہ دیکھتا تھا۔ ہمارے درمیان کا فاصلہ ہر سکنڈ کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ بالکل ہی سامنے

مارے خوشی کے میں چلا پڑا، ''خیریل آپ اول درجے کےاور سب سے اچھے شکاری ھیں، پورے تووا میں ۔ ''

لیکن خیریل میری خوشی اور جوش کو سمجھے ھی نہیں ۔ ان کےلئے ایسا شکار تو معمولی بات تھی ۔ انھوں نے کہا، ''اور تمھیں اپنی بندوق لانی چاھئے تھی ۔ اس سے اس بھیڑیے کو ختم کرنا بہتر ھوتا جسے میں نے جان‌بوجھ کر زخمی کیا تھا ۔ اب دیکھو، قرابین استعمال کرنی پڑی اور کھال تھوڑی خراب ھو گئی...''

''جان‌بوجھ کر سے کیا مطلب؟''

خیریل بڑی چالاکی کے انداز میں مسکرائے ۔

''میں نے بوڑھے بھیڑیے کی پچھلی ٹانگوں پر جان کر گولی ماری تھی کہ وہ فوراً ھی مرے نہ لیکن بھاگ بھی نہ پائے ۔ اس نے چیخ بلند کی اور اپنے ساتھیوں کو مدد کےلئے پکارا ۔ اگر میں اس کو پہلی ھی گولی میں مار دیتا تو باقی بھیڑیے کبھی ادھر نہ آتے ۔ اور یہی رات کے شکار کا راز ھے میرے عزیز !''

اور خیریل نے بڑے خوش ھوکر دوستانہ انداز میں قہقہہ لگایا کہ ان کے برف جیسے سفید دانت دکھائی دینے لگے ۔

گھر لوٹتے ھوئے میں اس زبردست کامیابی پر خوش تھا کہ شکار کا نتیجہ بہت اچھا نکلا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سبق بھی مل گیا ۔ میں نے طے کیا،

خیریل قرابین کو تانے ہوئے آخری بھیڑیے پر سے نظر نہیں ہٹا رہے تھے۔

یہ بھیڑیا بھی پہلےوالے زخمی بھیڑیے کے قریب پہنچ گیا جو چیختا چلاتا ہوا اسی جگہ پر چکر کھائے جا رہا تھا۔

اچانک یہ تیسرا بھیڑیا ہماری طرف مڑ پڑا۔ اس نے غالباً مردہ پڑے ہوئے بھیڑیے کو دیکھ لیا تھا۔ حیران ہوکر میں نے بھیڑیے کو اور پھر شکاری کو دیکھا۔ کوئی گولی نہیں چلی حالانکہ قرابین کی نالی اس طرح جیسے گھڑی کی سوئی کھسکتی ہے بھیڑیے کو نشانے ہی پر رکھنے کےلئے آہستہ آہستہ حرکت کرتی رہی۔ دو تین ہو سکتا ہے پانچ سکنڈ گزرے۔ بھیڑیا اچک کر پہاڑی پر آگیا اور اس نے سر گھما کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ تیسری گولی چلی اور تیسرا بھیڑیا بھی ڈھیر ہو کر لڑھکتا ہوا ہماری طرف آگیا۔

خیریل کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے کپڑوں پر سے برف جھاڑی۔

"لو، ختم ہوا قصہ... اور تمھیں یقین ہی نہ تھا... تم اجتماعی فارم میں مویشیوں کے کیسے نگراں ہو اگر تم گولی چلا سکتے ہو نہ شکار کر سکتے ہو اور ان درندوں کو ختم نہیں کرتے؟ تووا میں ہم ہر سال ہزاروں راس مویشی بھیڑیوں کی نذر کر دیتے ہیں! ہم اور تم نذر کر دیتے ہیں۔ ذرا حساب تو لگاؤ کہ اجتماعی کسانوں کا کتنا نقصان ہوتا ہے!"
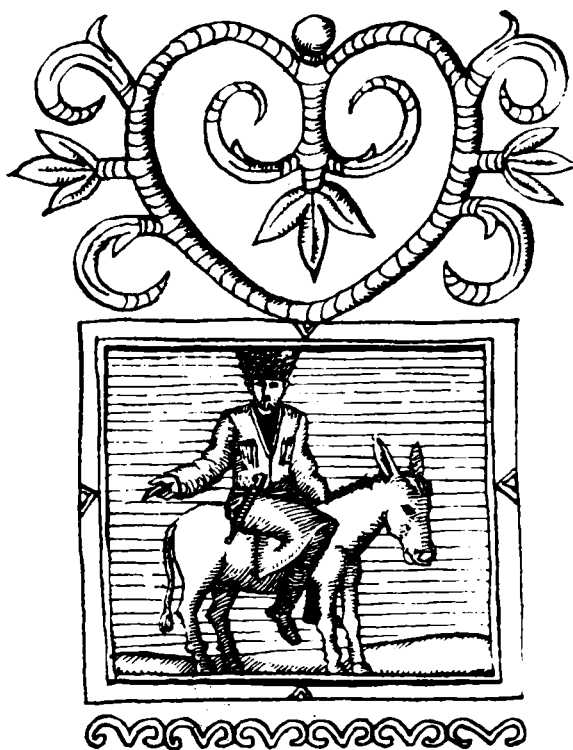
خیزگل اوشالیموف

شیمی دربندی عیار کے قصے

”میں بھی خیریل ہی کی طرح شکار کرنا سیکھوں گا اور بھیڑیوں سے گلے کی حفاظت کروں گا،،۔ میں سمجھ گیا کہ اولور خیریل جان کر شکار پر مجھے ساتھ لے گئے تھے تاکہ مجھے اجتماعی فارم کی دولت کی حفاظت کرنا سکھا دیں۔

۔ ۔ ۔ئیں گے اور وہاں جو لوگ رہتے ہیں انہیں
۔ ۔شدہ اور روشن فلیٹوں میں آباد کریں گے۔''
۔ہ نے کر شیمی دربندی خوش خوش اور
۔ے جوش کے ساتھ گھر آئے۔ اپنا مال و اسباب جمع
۔کے ور ساری چیزیں، بچوں کو گدھے پر لاد کر وہ
۔ی جلدی روانہ ہو گئے۔ لیکن گدھا، خدا اسے واصل
۔ کرے، ابھی سو قدم بھی نہ چلا ہوگا کہ جا کر
۔ ۔ے گندی اور بدبودار کیچڑ میں پھنس گیا۔
۔یمی پتہ نہیں کتنا چیخے چلائے، ڈنڈا ہلا ہلا کر اسے
۔ ۔ دھمکایا، اسے ٹھیلا ڈھکیلا اور اس قدر ڈانٹا ڈپٹا
۔ہ گلا بیٹھ گیا لیکن، وہ جو کہتے ہیں نہ، اس کے
۔ کان پر جوں تک نہ رینگی، ٹس سے مس تک نہ ہوا۔
۔ لگتا تھا کہ چٹان کو اپنی جگہ سے ہٹانا آسان
۔ اور اس گدھے کو ہلانا مشکل ہے۔
۔یمی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔
۔ے میں انہیں یہ خیال ہوا کہ اس گدھے کی چاپلوسی
۔کے دیکھیں۔ آخر چاپلوسی سے تو بڑے بڑے
۔ ۔ ۔ کا سر ایسے پھر جاتا ہے جیسے نشہ آور
جیزوں سے۔ تو گدھے کی کون کہے؟
۔نہوں نے تعظیم کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر
۔ گدھے کی بےحیا آنکھوں میں منت کے ساتھ
۔نکھیں ڈال کر زور زور سے کہنا شروع کیا، ''اے
۔ ۔ میرے نامور گدھے، اے قدرت کی عظیم‌ترین
۔خلیق! تجھے پتہ بھی ہے کہ تو کس نسل اور کس
۔بیلے سے ہے؟ سارے انبیائے کرام، موسی، عیسی اور

نئے گھر میں شیمی دربندی کا منتقل ہونا

شیمی دربندی کے پاس ایک گدھا تھا۔ دنیا کے سارے گدھوں کی طرح جنھیں خدا نے معلوم نہیں کیوں بہت بڑا سا سر اور بہت ھی چھوٹی سی عقل دی ھے، وہ بھی بیوقوف اور ھٹی تھا۔

جس زمانے کی یہ بات ھے اس زمانے تک شیمی دربندی کچے محلے میں رہتے تھے جہاں انقلاب سے پہلے دربند شہر کے غریب غربا رھا کرتے تھے۔ مٹی کے جھونپڑوں کی دیواروں میں کوئی کھڑکی نہ ھوتی تھی بس چھت میں ایک روشندان سا ھوتا تھا اور وہ انسان کے گھر سے زیادہ وحشی درندوں کی ماند معلوم پڑتے تھے۔ خزاں کے موسم میں اور جاڑوں میں کچے محلے کی ٹیڑھی میڑھی، تنگ اور کچی گلیوں میں، جہاں لوگ گھروں کا کوڑا کرکٹ بھی پھینک دیتے تھے، ایسی گندگی ھوتی تھی کہ ادھر سے گزرنا مشکل تھا۔

پھر ایک دن ایسا ھوا کہ شیمی دربندی کو شہر سوویت کی عاملہ کمیٹی کے دفتر میں بلایا گیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ انھیں کئی منزلوں والی عمارتوں میں سے ایک میں نئے فلیٹ کا پروانہ دیا گیا۔

کمیٹی والوں نے ان کو یہ پروانہ دیتے ھوئے کہا، ”بس چچا، آپ بہت دنوں اس بدبودار بھٹ میں رہ لئے۔ یہ کچا محلہ تو بیتے دنوں کا ایک ترکہ ھے۔ اس جگہ ھم محنت کشوں کے آرام اور تفریح کے لئے

بجنی شروع کی۔ جو لوگ جمع تھے انھوں نے گدھے
کو بڑھاوا دینے کےلئے تال کے ساتھ اس طرح تالیاں
بجنی شروع کیں جیسے شادیوں میں رقص کرنےوالوں
کےلئے بجاتے ھیں۔ گدھے نے سرنائی کی آواز
سن کر پہلے کاھلانہ انداز میں کان ھلائے، اپنی
دم ھلائی اور پھر موسیقی کی دھن پر اپنی ٹاپیں
جلدی جلدی اٹھانے رکھنے لگا۔ اس سے کیچڑ کے
چھینٹے اڑنے لگے۔ لیکن شیمی کو یہ دیکھ کر بڑا
ھی دکھ ھوا کہ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا۔
موسیقار کے ناکام ھو جانے کے بعد ایک سیانا آیا۔
اس نے وعدہ کیا کہ وہ گدھے کو کیچڑ میں سے نکال
دےگا بشرطیکہ شیمی اس کو بھی اتنا ھی دیں جتنا
انھوں نے موسیقار کو دیا ھے۔ شیمی دربندی کےلئے
راضی ھونے کے علاوہ کوئی چارہ ھی نہ تھا۔ سیانے نے
پہلے تو گدھے کو کوئی دوا سنگھائی جس سے جانور
کو تین بار چھینک آئی۔ سیانا بڑا خوش ھوا۔ اس
کے بعد اس نے جانور کی دم پکڑی، اس میں سے چند
بال کھینچے، انھیں جلا کر کچھ منتر پڑھے اور...
چلا گیا۔ وہ گدھا جیسے کھڑا تھا ویسے ھی کھڑا
رھا۔
پھر اپنی لمبی داڑھی کو سہلاتا ھوا بڑے پروقار
انداز میں ایک یہودی ربانی آگیا۔ اس نے بدنصیب
شیمی دربندی سے کم نہ زیادہ، پورے دس روبل کا
مطالبہ کیا کہ وہ اپنی پاک دعاؤں کی مدد سے گدھے
کو کیچڑ کے گڑھے سے نکال دے۔

پیغمبر اسلام زمین پر جب بھی چلے تو گدھے پر سوار ہوکر ۔ اور بالکل ہو سکتا ھے کہ تیری جدۂ ساجدہ ھی وہ مشہور و معروف گدھی رھی ھوں جس پر بیٹھ کر دور دراز یادگار زمانے میں ابوالانبیاء ابراھیم نے ھری سے کنعان تک کا سفر کیا تھا ۔ اور جب تمھارے آبا و اجداد ایسے نامی گرامی تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ھے کہ تم کو اس گندی بدبودار کیچڑ سے بہتر جگہ نہ ملی؟..،،

لیکن ایسا لگا کہ شیمی نے اپنے گدھے کی چاپلوسی بیکار ھی کی اور انھیں شرم آئی کہ ایک تو انھوں نے اس نرے بیوقوف جانور کو اس قدر عظیم و اعلی بنایا اور پھر خواہ مخواہ بیچ میں انبیائے کرام کا نام بھی لائے ۔

شیمی ناامید ھو چکے تھے کہ اتنے میں یہ تماشہ دیکھنے کےلئے جو بھیڑ جمع ھو گئی تھی اس کو چیر کر اس علاقے کا ایک مشہور موسیقار اپنی سرنائی لئے ھوئے نکلا ۔ اس نے کہا، ''چچا شیمی، اس کام کی خاطر آپ تین روبلوں کو عزیز نہ رکھئے ۔ میں ابھی سرنائی بجاتا ھوں اور میرا ساحرانہ سنگیت سن کر آپ کا گدھا فوراً چاق چوبند ھو جائےگا اور اس کے قدم آپ ھی آپ آگے بڑھنے لگیں گے ۔،،

شیمی نے ایک لفظ بھی کہے بغیر جیب میں ھاتھ ڈالا اور تین روبل نکال کر موسیقار کو دے دئے ۔ اور موسیقار نے سرنائی کو ھونٹوں میں دبایا اور مگن ھوکر آنکھیں بھینچ کر رقص کی جادو اثر دھن

ھوگی کہ گدھے کو اس نے سب سے زیادہ بیوقوفی ھی نہیں بلکہ سب سے زیادہ زوردار آواز بھی کیوں دی۔

ربانی نے کھڑکھڑاتے ہوئے نوٹ کو اپنی جیب میں ڈالا اور فوراً ھی اپنی صفائی پیش کر دی، "میرا کوئی قصور نہیں ھے۔ تمھارے اس بیوقوف گدھے نے بنی چیپوں چیپوں سے میری دعا کو دبا دیا اور اسے خدائے بزرگ و برتر کے کانوں تک پہنچنے ھی نہ دیا۔ آخر وہ یہاں تو بیٹھا نہیں۔ وہ تو ساتویں آسمان پر ھے۔"

مختصر یہ کہ ربانی بھی چلا گیا، شیمی کی آخری رقم بھی لے گیا اور اس کے ساتھ ھی کیچڑ سے گدھے کے نکالنے کی آخری امید بھی۔

شیمی کو اس تین بار کے لعنتی گدھے سے پتہ نہیں ابھی کتنا اور جوجھنا پڑتا جو لگتا ھے اس بات سے ناخوش تھا کہ اس کا مالک گندے کچے محلے کو چھوڑ کر نئے فلیٹ میں چلا جا رہا تھا۔ وہ تو خیریت یہ ھوئی کہ اجتماعی فارم کی ٹرک نے ان کی مدد کر دی۔ اس میں جو لوگ تھے انھوں نے گدھے پر لدے ہوئے مال و اسباب کو ٹرک پر لادنے اور بچوں کو بٹھانے میں مدد کی اور ٹرک نے ایک منٹ میں، بالکل جادوئی اڑن کھٹولے کی طرح شیمی کو ان کے نئے گھر کے دروازے پر پہنچا دیا۔

البتہ گھر بھراونی کا جشن شیمی نے بہت دنوں بعد منایا۔ اس کی وجہ غالباً آپ سمجھ ھی گئے ھوں گے۔

شیمی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، ''اور خدا کیا اس طرح کے ہٹی جانوروں کو چلا سکتا ہے؟،،

سچ بات یہ ہے کہ مشہور و معروف موسیقار اور تجربہ کار سیانے کی ناکام کوششوں کے بعد شیمی کو زیادہ یقین نہیں تھا کہ دعاؤں اور معجزے سے بھی گدھے کی ہٹ کو توڑا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شیمی کافی بال بچوں‌والے آدمی تھے اور وہ اپنا دس روبل کا آخری نوٹ جدا نہ کرنا چاہتے تھے جو انھوں نے آڑے وقتوں کےلئے بچاکر رکھا تھا اور جس کی ضرورت انھیں اب گھر بھراونی کا جشن منانے کےلئے تھی۔

ربانی کو شیمی کے شبہات پر بہت غصہ آیا، ''تمھیں اس طرح کی گناہ کی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی،، اس نے اپنی داڑھی ہلاتے ہوئے شیمی سے کہا، ''خدا جس نے کچھ نہ تھا اور کائنات بنا دی، مٹی سے انسان بنا دیا اور اس کی پسلی کی ہڈی سے عورت بنا دی وہ تمھارے اس حقیر گدھے کو راہ راست پر نہیں لا سکتا؟،،

شیمی نے شرمندہ ہوکر بادل ناخواستہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس کا نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ لیکن ربانی نے دعا کےلئے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائی ہی تھیں کہ اس لعنتی گدھے نے اپنا منہ اس طرح کھولا جیسے آس پاس کی ہر چیز کو نگل جانا چاہتا ہو اور اپنے گدھے‌والے حلق کی پوری قوت سے چیپوں چیپوں کرنے لگا۔ اس وقت خود خدا کو بھی افسوس ہوا

انھیں بڑے بڑے خیالات میں ڈوبے ہوئے، شیمی دربندی کو خود بھی یاد نہیں کہ کتنی دیر وہ ٹھنڈے چولھے کے پاس بیٹھے رہے اور کب وہ نکل کر سڑک پر آگئے اور کب انھیں پانچ کوپک کا پڑا ہوا سکه مل گیا۔ شیمی نے سکه اٹھا لیا اور سوچنے لگے که اس کو کس چیز پر خرچ کریں۔ اس سے پورے خاندان کے لئے روٹی تو خریدی نہیں جا سکتی اور اس کا تو سوال ھی نہیں که اس سے چھت کی مرمت کرائی جا سکے یا خشیل کے لئے آٹا اور شہد خرید کر بیوی کو دیا جا سکے۔

اسی وقت جب شیمی خیالوں میں ڈوبے ہوئے اپنے ھاتھ میں سکے کو الٹ پلٹ رہے تھے ان کی گندی قمیص کے نیچے ان کی مدتوں کی بے نہائی دھوئی پیٹھ پر بے چین کر دینے والی کھجلی اٹھی۔ انھوں نے سوچا، ''اور اگر میں زندگی میں ایک بار حمام چلا جاؤں تو؟''

لیکن وہ جو کہتے ھیں نه که بدبخت آدمی نے شکار پر جانے کی تیاری کی تو پہاڑ پر کہرا چھا گیا۔ شیمی دربندی جب شہر کے حمام کے پاس پہنچے تو انھوں نے دور ھی سے دیکھ لیا که اس کے سامنے ایک جڑاؤ شاھی بگھی کھڑی ھے اور دو تنومند، بڑی بڑی مونچھوں والے پہریدار ننگی تلواریں لئے ہوئے حمام کے دروازے پر پہرہ دے رہے ھیں۔

شیمی دربندی کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن انھوں نے حمام میں نہانے کا ارادہ ترک نہیں کیا۔ جب انھوں نے

گھڑی بھر کا سلطان

ایک بار ایسا ہوا کہ ھمارے عزیز ھم‌وطن شیمی دربندی سلطان ھوگئے۔ یہ سچ ھے کہ شیمی کی سلطانی صرف تھوڑی ھی دیر چلی، بس ایک گھنٹہ۔ اور آپ کیا سمجھتے ھیں کہ انھیں تخت سے کس نے معزول کیا؟ ان کی اپنی بیوی نے۔ اور یہی سب سے زیادہ کوفت کی بات تھی! اسی‌لئے تو ھمارے پرکھے اس بات کو دوھراتے نہیں تھکتے تھے کہ ''بیوی چاھے تو شوھر کو بلندی پر پہنچا سکتی ھے اور بیوی چاھے تو شوھر کو پستی میں گرا سکتی ھے۔''

اور یہ سب یوں ھوا۔ ایک بار شیمی دربندی، جو ان دنوں کھیت مزدور تھے اور بڑی محتاجی و محرومی کی زندگی بسر کرتے تھے، اپنے گھر میں ٹھنڈے چولھے کے پاس بیٹھے تھے اور اپنی پریشانیوں کے بارے میں سوچ رھے تھے۔ صحن میں خزاں کا بے‌کیف موسم تھا، پھوار پڑ رھی تھی، چھت ٹپک رھی تھی، بچے روٹی مانگ رھے تھے اور رو رھے تھے اور بیوی تھی کہ ایک اور بچہ جننے‌والی تھی اور شیمی کی جیب میں کھوٹا دھیلا بھی نہ تھا۔ شیمی کی جگہ کوئی اور بھی ھوتا تو ایسی حالت میں کیا سوچتا؟ ظاھر ھے یہی کہ کہاں سے تھوڑے پیسے حاصل کئے جائیں کہ بھوکے بچوں کو کچھ کھلایا جا سکے، ٹپکتی چھت کی مرمت کرائی جا سکے، خشیل کے لئے بیوی کو آٹا اور کچھ شہد خرید کر دیا جا سکے۔

داشتہ عورتوں نے بھنے ہوئے چوزوں، رسیلے برہ کبابوں اور سمندر پار کی بہترین شرابوں سے بھوکے سلطان کی خاطر مدارات کی۔

شیمی دربندی جب سیر ہوکر کھاپی چکے تو ان کے پاس ملکہ کی منظور نظر خادمہ، خوبصورت اور نازک اندام حسینہ آئی اور اس نے کہا، ''جہاں پناہ، ہمارے لاجواب مالک، میری ملکہ، آپ کی خانم اپنی خوابگاہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں...''

ملکہ کے پاس جانے سے پہلے (کہ وہ کہاں بھاگی جاتی ہے) شیمی دربندی نے شاہی خزانچی کو اپنے حضور میں طلب کیا جو اتنا موٹا تھا کہ تین تین تو اسکے ٹھوڑیاں بن گئی تھیں اور توند اس کی لگتا تھا کہ مشک ہے مشک۔

''سلطان'' نے اس سے پوچھا، ''خزانچی، یہ بتاؤ کہ ہمارے خزانے میں اس وقت کتنے بورے اشرفیوں کے ہیں؟''

خزانچی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا، ''تین بورے ہیں جہاں پناہ!''

شیمی دربندی نے تند لہجے میں کہا، ''تو دھیان سے میرا شاہی فرمان سنو! دو بورے اشرفیاں دربند کے غریبوں میں بانٹ دو۔ وہ بھی اسی طرح کھانا پینا چاہتے ہیں جیسے ہم اور تم کھاتے پیتے ہیں۔ اور یہ ان کا قصور نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو پلاؤ دیا ہے اور کسی کو بھوک۔ اس کی غلطی کو ہمیں درست کرنا چاہئے۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے کہ

دیکھا کہ پہریداروں کا دھیان ادھر ہے تو وہ جھپاک سے دروازے میں داخل ہو گئے جیسے لومڑی بھٹ میں گھستی ہے۔ ان کی خوش قسمتی سے اس وقت سلطان نہانے کے بعد آلکس محسوس کرکے، اپنے ننگے دھڑ پر ریشمی خلعت ڈال کر صحن میں نکل گیا تھا کہ ذرا تازہ ہوا میں سانس لے۔

سلطان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاکر شیمی نے جلدی سے اپنے چیتھڑے اتار کر ایک طرف پھینکے، اپنی دھول سے اٹی ہوئی جوتیاں اتاریں اور نیم گرم خوشبودار پانی سے بھرے ہوئے حوض میں گھس گئے۔ پانی سے نکلے تو زیادہ سوچے سمجھے بغیر انھوں نے شاھی لباس زیب تن کیا اور سر پر اپنی نچی کھچی پوستین کی پپاخ کی بجائے انھوں نے سونے کا شاھی تاج پہن لیا۔

شیمی جب حمام سے باھر نکلے تو پہریداروں نے انھیں سلطان سمجھا اور ان کے سامنے باادب باملاحظہ کھڑے ھوکر سلامی دی۔ اس کے بعد انھوں نے انھیں بگھی میں بٹھایا اور محل میں لے گئے۔ جیسے ھی شاھی بگھی کے پہیوں کی آواز پھاٹک کی پلیا پر سنائی دی ویسے ھی اس کے استقبال کےلئے ایک سو خوبصورت کنیزیں اور داشتہ عورتیں نکل آئیں اور وہ اپنے آقا کو ھاتھوں ھاتھ اٹھاکر اسے بڑی احتیاط سے محل کے سنگ مرمر کے زینوں پر لے چلیں، جن پر خوش رنگ قالین بچھے ہوئے تھے اور سنبھال کر انھیں تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد کنیزوں اور

سکه کے شیریں دھن کو مس بھی نہ کر پایا تھا کہ
چانک صاف آسمان میں گھن گرج کی طرح بالکل ان
کے کان میں ان کی مکروہ بیوی کی آواز گونجی:
''ارے سنتے ہو، اٹھو، بیلچہ لے کر فاخلے بازار چلے
جاؤ، شاید کل کےلئے تمھیں کوئی کام پر لگا لے،
نہیں تو مارے بھوک کے ہم سب سے اٹھا بھی نہ
جائے گا... اے!،،
شیمی دربندی نے آنکھیں کھولیں اور حیران و پریشان
ہو کر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اور جو کچھ انھوں نے
خواب میں دیکھا اور جانا تھا اس کے بعد حقیقت اور
بھی جہنم لگ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار شیمی
دربندی نے بیوی کو اس طرح دیکھا جیسے وہ ان کی
بدترین دشمن ہے۔ اپنی مایوسی اور غصے کو قابو
میں رکھنا ان کے بس میں نہ رہ گیا اور وہ چیخ کر
پنی حیرت زدہ بیوی پر برس پڑے، ''بدبخت عورت،
تیرے دل میں میرے لئے، مجھ بدنصیب کےلئے، رتی بھر
بھی رحم اور ہمدردی نہیں ہے! خدا کی قسم
بدترین دشمن بھی کسی کے ساتھ اس طرح کا سلوک
نہ کرتا جیسا تو نے ابھی میرے ساتھ کیا ہے... میں
نے کہیں کے پانچ کوپک میں شاھی حمام میں غسل
کیا، شاھی بگھی میں گیا، شاھی تخت پر بیٹھا، شاھی
پلنگ پر لیٹا، ملکہ کو اپنی بانہوں میں لیا اور تجھے
سی وقت مجھے جگانے کی پڑی تھی... وائے، وائے،
بدبخت غریب کو آخر خواب میں کیوں نہیں خوشی
نصیب ہوتی! تف ہے ایسی قسمت پر!،،

ایک تو برہ کباب کھائے اور دوسرا اس کے دھوئیں کی مہک پر جئے۔ اس بات کا دھیان رکھنا کہ ایک بھی غریب اور یتیم ھماری شاھی عنایت سے محروم نہ رھنے پائے۔ اس کے بعد میری... مطلب یہ کہ کھیت مزدور شیمی دربندی کی بیوی کو تلاش کرو اور ایک بورا اشرفی اسے دے دو تاکہ اب تو وہ اپنی زبان بند رکھے اور میرا... مطلب یہ کہ میرا نہیں بلکہ اپنے بدبخت شوھر کا ناک میں دم کرنا بند کر دے کہ گھر میں کھانے کو نہیں، بچے بھوکے ھیں، چھت ٹپک رھی ھے، اور دنیا بھر کی تین پانچ کرنا ختم کرے!،،

خزانچی کو تو دراصل یہ حکم کچھ اچھا نہیں لگا لیکن خود پر بادشاہ کا عتاب نازل ھونے سے ڈر کر اس نے سوچا میری بلا سے اور اپنے بھاری ڈیل ڈول کے باوجود اس فرمان کی تعمیل کرنے کےلئے دوڑا۔

اور شیمی دربندی اپنے آپ سے خوش اور مطمئن، اپنی مونچھوں اور داڑھی پر ھاتھ پھیرتے ھوئے انتہائی سکون اور مسرت کے ساتھ ملکہ کی خواب گاہ کی طرف چلے۔ وھاں پہنچ کر انھوں نے کپڑے اتارے اور طلائی پلنگ پر لیٹ کر وہ اونٹ کے اون کے بنے ھوئے نرم کمبل میں گھس کر حسین و جمیل ملکہ کے پہلو میں لیٹ گئے جس کا جسم غزال کا سا سبک اور سجل تھا اور خوبصورتی میں حوروں کو شرمندہ کرتا تھا۔ لیکن ابھی شیمی دربندی کا دھن

ـن کے باوجود وہ رات کو میرے گھر میں گھس
ـب ۔ ظاھر ھے کہ اس نے پیٹ کی آگ سے مجبور
ھوکر ایسا کیا ھوگا ۔ تو میں یہ چاھتا تھا کہ اسے
پکڑ کر کھلا دوں اور پھر اسے ایک تھپڑ مار کر
چلتا کردوں کہ جائے جہاں سینگ سمائیں ۔''
بیوی کو بھلا کہاں چین ملتا، وہ بولیں، ''چلو مان لیا
کہ ایسا ھی ھے لیکن پھر تم خنجر کیوں لے گئے تھے؟''
''تاکہ وہ خنجر کے خوف سے میری روکھی سوکھی
کھا لے ۔ اس سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں ھے کہ
اپنے گھر سے کسی شخص کو بھوکا جانے دیا جائے ۔
لیکن خدا گواہ ھے کہ اگر وہ میرے گھر سے بھوکا چلا
گیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ھے'' شیمی
دربندی نے بڑے رنج کے ساتھ ٹھنڈی سانس بھری ۔

شیمی دربندی کی چالبازی

ایک دن شیمی دربندی کو چھٹی تھی تو انھوں
نے سوچا کہ وہ تفریح کے لئے شکار کرنے چلے جائیں ۔
خوش قسمتی سے ان کے پڑوس میں ایک شکاری رہتے
تھے جن سے انھوں نے بندوق اور کارتوس مانگ لئے
اور گدھے پر سوار ھوکر شہر سے باھر جنگل کی
طرف روانہ ھوگئے ۔
جنگل کے سرے ھی پر انھوں نے گدھے کو ایک
پیڑ سے باندھ دیا اور خود جنگل میں اندر گھس گئے ۔
سارا دن وہ جنگل میں بھٹکتے پھرے لیکن کہیں بھی
انہیں کسی جانور کے پنجے کے نشان ملے ھی نہیں ۔

نان و خنجر

یہ بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ شیمی دربندی تب تک بڑے غریب تھے اور انتہائی محتاجی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک رات کو ان کے گھر میں چور گھس آیا۔ کوٹھری میں اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اس کا ہاتھ انجانے میں شیمی کے پاؤں پر پڑ گیا اور وہ فوراً ہی جاگ پڑے۔ چور کی تو ڈر کے مارے جان ہی نکل گئی اور وہ کوٹھری سے نکل کر تیر کی طرح بھاگا۔ شیمی دربندی فوراً طاق کے پاس گئے، وہاں سے انھوں نے بچی کھچی نان اٹھائی، دیوار پر سے ٹنگا ہوا زنگ آلود خنجر اتارا اور جیسے تھے اسی حال میں دوڑے چور کے پیچھے۔

دوڑتے دوڑتے شیمی دربندی چلائے ''ٹھہر جاؤ، رک جاؤ!،، لیکن بیسود۔ چور لگتا ہے کہ بہت تیز تھا اور شیمی اس تک پہنچ نہ پائے۔ وہ پریشان اور بڑے غصے میں گھر لوٹ آئے۔ اتنا دوڑنے سے وہ ہانپ گئے تھے۔ نان انھوں نے طاق پر رکھ دی، خنجر دیوار پر ٹانگ دیا اور خود آ کر بستر پر لیٹ گئے۔

بیوی بولیں، ''سنتے ہو، تم بھی کس قدر عجیب آدمی ہو، کوئی نان لے کر بھی چور کے پیچھے دوڑتا ہے؟،،

شیمی دربندی نے چڑ کر جواب دیا، ''تم بھی کتنی ناسمجھ ہو! سارا شہر جانتا ہے کہ میں سب سے غریب آدمی ہوں، کہ میرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور چور بھی یقیناً یہ بات جانتا رہا ہوگا۔ لیکن

کہا۔ ''تمھاری طرح نہیں جو شکاریوں کے نام کو
بٹہ لگاتے ہو، جانور پر گولیوں کی بوچھار کر دیتے
ہو اور وہ پھر بھی تمھارے ھاتھ سے نکل جاتا ھے
بےک خراش کے بھی بغیر، ھا، ھا...''
پڑوسی کو بالکل حیران و پریشان چھوڑ کر اپنے
جواب پر خوش خوش شیمی بڑے وقار کے ساتھ گلی
سے چلے۔ لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو
انہوں نے موڑ پر اپنی بیوی کو دیکھا جو ان کی
واپسی کا انتظار کر رھی تھیں۔ شیمی کی طبیعت
فوراً بدمزہ ھو گئی۔ انھوں نے بوکھلا کر سوچا،
''اس کو اگر معلوم ھو گیا کہ گدھا میری لاپروائی
کی وجہ سے مارا گیا تو گھر میں میرا جینا نا ممکن ھو
جائے گا''۔ وہ اپنی بیوی کے چڑچڑے مزاج کو خوب
جانتے تھے۔ اس لئے شیمی ایسے بن گئے جیسے بڑا
درد ھو رھا ھے۔ بائیں پاؤں سے بری طرح لنگڑاتے
ھوئے اور دائیں پہلو کو دونوں ھاتھوں سے پکڑے
ھوئے ناکام شکاری زور زور سے کراھتے اور ھانپتے
ھوئے آگے بڑھا۔
شوھر کو اتنی خراب و خستہ حالت میں دیکھ کر
بیوی پریشان ھوکر ان کی طرف بھاگتی ھوئی آئیں۔
''اے ھے، ساری بلائیں میرے سر پر'' ڈری سہمی
ھوئی بیوی رنج کے ساتھ چیخیں، ''صبح تو گھر
سے ھنسی خوشی اور اچھے خاصے گئے تھے۔ یہ تمھیں کیا
ھوگیا؟ اور پیدل کیوں آ رھے ھو؟ تمھارا گدھا
کہاں ھے؟''

مایوسی اور تھکن سے چور ہو کر وہ جنگل کے اسی سرے
پر واپس آ گئے جہاں انھوں نے اپنے گدھے کو باندھا
تھا ۔ لیکن جس جگہ پر گدھے کو ہونا چاہئے تھا وہاں
اب صرف چچوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں ۔ مالک
تو ادھر جنگل میں شکار تلاش کر رہے تھے اور ادھر
گدھے پر بھیڑیے ٹوٹ پڑے اور اس کی تکابوٹی کر ڈالی ۔
بندوق کو کندھے سے لٹکا کر شیمی سر جھکائے
ہوئے شہر واپس آ گئے بغیر شکار کے اور بغیر گدھے
کے ۔ وہ جو کہتے ہیں نہ کہ گئے تھے داڑھی
کے لئے ، سونچھوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ۔ گھر جانے
سے پہلے شیمی پڑوسی کے ہاں گئے اور اس کو بندوق
اور ایک ایک کارتوس واپس کیا اور بڑی گرمجوشی
سے ان کی عنایت کا دلی شکریہ ادا کیا ۔
یہ دیکھ کر کہ سارے کے سارے کارتوس بھرے
ہوئے ہیں پڑوسی نے مسکراتے ہوئے پوچھا، ''کہئے
چچا شیمی، مارا کوئی نہ کوئی جانور ؟،،
شیمی نے پڑوسی کی آواز میں مذاق اڑانےوالا لہجہ
محسوس کیا اور انھیں برا بھی لگا لیکن اس کو وہ
چھپا گئے اور بڑے فخر کے ساتھ بولے ۔''یقیناً مارا!
ھونہہ، تو کیا بیکار ھی سارے دن شکار کیا؟،،
پڑوسی نے ان کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے پوحھا،
''اور کیا مارا آپ نے چچا شیمی؟،،
''اپنا گدھا، اور کیا مارا ھے میں نے اسے، تمھارے
سر کی قسم، کہ ایک بھی گولی نہ چلائی بلکہ شست
تک نہیں باندھی،، شیمی دربندی نے زور کا قہقہہ
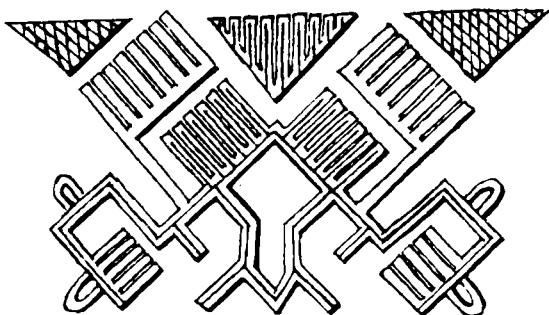
ونیامن چیستالیف

بیتے دنوں کی کہانی

شیمی دربندی عیار فریادی آواز میں بولے، ''ارے بیوی، تم کو تمہارے والدین کی یاد کی قسم دیتا ہوں، میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو، مجھے گدھے کی یاد نہ دلاؤ،، اور پھر اور بھی زیادہ زور زور سے کراھنے لگے، ''اس ہزار بار لعنتی جانور نے تو مجھے اس دنیا سے روانہ ھی کر دیا تھا اور تمھیں بس بیوہ ھی کر دیا تھا۔ اس نے میرے پہلو میں لات ماری، میری تین پسلیاں توڑ ڈالیں اور مجھے پاؤں سے لنگڑا کر دیا۔،،

یہ سب سن کر بیوی نے بدبخت گدھے کو جی بھر کر کوسنے دئے، ''ھم نے جتنا اسے کھلایا سب اس کے لئے زھر بن جائے! اس کی اوندھی کھوپڑی کو بیرحم بھیڑیے کھا جائیں! کمبخت کہیں کا...،،

شیمی دربندی کو تو سمجھئے منہ مانگی مراد مل گئی، ان میں جیسے جان آ گئی اور بولے، ''ھائے بیوی، بس کرو اب زیادہ پریشان ھو نہ کڑھو۔ خدا نے تمھاری دعا سن لی۔بیرحم بھیڑیے صرف اس کی اوندھی کھوپڑی ھی نہیں کھا گئے، انھوں نے تو اس کی دم تک نہیں چھوڑی۔،،

میں ایک ایک دانہ چننا پڑتا ہے۔ حساب لگاؤ تو ایک
۔۔ نغہ کرکے تجھے پالا سار جاتا ہے اور پکنے کی
نوبت ہی نہیں آتی۔ دوسری بہار میں ہمیں تیرے
لئے کھاد ڈالنی پڑتی ہے اور مٹی میں گلی سڑی پتیاں
اور گھاس ملانی پڑتی ہے۔ زمین ایسی ہو جاتی ہے
کہ آدمی چاہے تو دلیے میں مکھن کی طرح ڈال لے
لیکن تو... من‌موجی ہے، بس اور کچھ نہیں! اور
ادھر کالے گیہوں کو دیکھو — کبھی کچھ نہیں
مانگتا۔ اچھی فصل دیتا ہے... اگر اگلی بہار تک جی
گیا تو اپنی پوری زمین میں کالا گیہوں بوؤں‌گا، جو
بیٹ تو بھرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دغا نہ
کرےگا۔ کبھی نہیں...،، یہ تھے وہ خیالات جو
تریپان واس کے دماغ میں آرہے تھے جب وہ اپنی
انگلیوں میں مٹی کے ایک سوکھے ڈھیلے کو
بھربھرا رہے تھے۔

ابھی تک کسی نے بھی گھاس کاٹنے کےلئے ہنسیا
نہیں نکالی تھی لیکن تریپان واس یہ ارادہ کر رہے تھے
کہ ویچیگدا ندی کے چڑھاؤ پر جاکر سکھانے کےلئے
گھاس کاٹنا شروع کر دیں۔

انہوں نے اپنے گھروالوں سے کہا، ’’جاتا ہوں!
ابھی تو آس پاس کوئی گھاس کاٹ کر سکھا نہیں
رہا ہے، تب تک میں وہاں دو چار کھیپ کاٹ کر
سکھا لوں‌گا۔،،

لیکن دل میں انہوں نے کچھ اور ہی ٹھانی تھی۔
تریپان واس نے کئی مہینے سے اپنے پاس آٹھ کلو گرام

اس سال شمال میں بہار جلد ھی آگئی تھی۔ ایسا لگا جیسے اسے معلوم تھا کہ لوگ بھوکے ھیں اور هریالی کی آمد کا انتظار بڑی بےچینی سے کر رھے ھیں۔ جاڑے بڑے کٹھن تھے۔ اتنے کٹھن کہ لوگوں کو ترشہ تک مل جاتا تو خوش ھو جاتے۔ بھوکے مویشی، جو اب گاؤں میں کم ھی باقی بچے تھے اس لئے کہ جاڑوں میں لوگ کاٹ کر کھا گئے تھے، چراگاھوں میں نئی گھاس کے جھونٹے تلاش کرتے پھر رھے تھے۔

زیریانی لوگوں* نے ذرا چین کی سانس لی کہ اب شاید کسی نہ کسی طرح وہ گزر کر لیںگے اور گزر انھوں نے واقعی کرلی۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا اور بوائی کے دن آگئے۔

واسیلی تریفونووچ، یا جیسا انھیں ھماری کومی زبان میں کہا جاتا تھا، تریپان واس اپنے چھوٹے سے کھیت پر آئے اور بوئی جانےوالی زمین کا ایک ایک چپہ دیکھنے کے لئے انھوں نے کھیت کے چکر لگائے۔

''ارے تو جو، لمبی مونچھوں والا جو! کس قدر تو کسانوں کو دھوکا دیتا ھے... کبھی تو بس چار چار انگل کی بالیاں اور کبھی دیکھ تو آسمان سے باتیں کر رھا ھے... چھوٹا ھوتا ھے تو فصل بری ھوتی ھے اور بڑا ھوتا ھے تو ٹوٹ کے گر جاتا ھے اور پھر

---

* زارشاھی روس میں کومی قومیت کے لوگوں کو ''زیریانی،، (دھتکارے ھوئے لوگ) کہا جاتا تھا۔ ایڈیٹر

.. کر رکھ دیں اور بھوج کی چھال کے برتن میں
دودھ بھر دیا اور بس۔ واس نے پانی کے لئے ٹین
کا برتن لیا، اپنی ھنسیا، اسے تیز کرنے کے لئے سلی
اور کلھاڑی لے لی اور بیوی سے بھوج کی چھال کا
ایک اور برتن مانگا۔

''وہ تمھیں کس لئے چاھئے؟،،

''مچھلیاں رکھنے کے لئے۔ ایک طرح کا تحفہ۔
تحفہ کے بغیر تو گھر نہیں آنا چاھئے،، واس نے ایک
طرح سے اپنی صفائی دی۔

بس سارا مال و اسباب تیار ھو گیا۔ واس اپنی بیوی
سے رخصت ھوئے، بیٹی کو پیار کیا اور سیدھے جا کر
ناؤ کے پاس آگئے۔ وہ کھڑکھڑاتی ھوئی پتھروں پر
سے گھسٹی اور چھپاک سے پانی میں آگئی۔ تریپان واس
آرام سے ناؤ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے اور انھوں نے
پتوار سنبھال لی... اور چلے گئے۔

ندی میں تریپان واس چلے جا رھے تھے۔ ان کے
چاروں طرف سناٹا تھا۔ کناروں پر ھنسیوں کے پھل
چمک رھے تھے نہ گھاس کاٹنے کی آواز آ رھی تھی۔
گھاس کے ڈھیروں کا تو خیر ذکر ھی کیا، کہیں
نام و نشان تک نہ تھا۔

بس ایک بار کسی نے واس کو آواز دی، ''کہاں
چلے؟ اتنی جلدی گھاس کاٹنے تو جا نہیں رھے ھوگے؟،،

... کے کھانے سے اکثر لوگ مر جاتے تھے خاص کر بچے۔
ایڈیٹر

بیج والا کالا گیہوں چھپا رکھا تھا۔ اب اسے بونے
کا وقت آگیا تھا۔ ویسے تو کوسی میں بہت دنوں سے
کسانوں نے جتائی بوائی کا طریقہ اپنا لیا تھا لیکن
ابھی تک بہت سے لوگوں کے پاس جنگل میں صاف
کئے ہوئے زمین کے قطعے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اس
موسم بہار میں بہت سے قطعوں میں جھاڑ جھنکاڑ
اگ آئے تھے اس لئے کہ بیج تو کھیتوں ھی کےلئے
کافی نہ تھے یہاں کون بیج ڈالتا؟ سارا اناج یہاں تک
کہ بیج والا بھی جاڑوں میں کھا لیا گیا تھا۔ جب
آدمی بھوکوں مر رہا ہو تو صبر کیسے کیا جا
سکتا ہے؟ لیکن تریپان واس نے تو صبر کر لیا تھا۔

انھوں نے بیوی سے کہا، ''تم جب سے جھنکاڑ
کاٹ کر رکھنا بس میں اتنے میں آ جاؤنگا۔''

''جا سکتے ہو تو جاؤ... میں تو تمھیں روک
نہیں سکتی۔ کچھ بھی نہیں ہے جو راستے میں
کھانے کے لئے ساتھ کر دوں۔ تم کھاؤگے کیا؟
گھر میں تو پکانے کےلئے کچھ بھی نہیں ہے، دلیا نہ
آٹا۔''

''میں اپنے کھانے کے لئے ندی سے حاصل کر لوں گا،''
واس نے کہا، ''جو ہو وہ دے دو، جو نہیں ہے
وہ میں مانگوں گا بھی نہیں۔''

بیوی نے پیٹھ پر لادنے والی ٹوکری میں کاچ نیانی *

---

* پیڑوں کی چھال کو پیس کر اس کے آٹے کی
روٹی جو قحط کے دنوں میں کھائی جاتی تھی۔ اس

تھے لیکن دھوئیں کے اندر نہیں آتے تھے۔ اگر کوئی سچھر کاٹ بھی لیتا تو بھی واس برا نہ مانتے۔ وہ جانتے تھے کہ سچھر نہ ھوں تو مطلب یہ کہ گرمیاں نہیں ھوئیں اور گرمیاں نہ ھوں تو فصل کیسے ھوگی۔ ڈانس اور سچھر جتنے زیادہ ھوں گے فصل اتنی ھی چنگی ھوگی، شگون تو یہی مانا جاتا ھے۔

ٹھیک ان کے سر کے اوپر کوئل کی کوک سنائی دی۔ تریپان واس کو دوسرا شگون یاد آگیا۔ کوئل اگر دیر تک کوکے تو اس کا مطلب ھے کہ سال اچھا ھوگا، گرمیاں لمبی ھوں‌گی اور اناج کو پکنے کا موقع مل جائےگا۔ واس نے گننا شروع کیا، گنتے رھے، پھر گنتی بھول گئے۔ لیکن کوئل چپ نہیں ھوئی۔ انھوں نے سوچا، ''نہیں، اس سال خدا نے چاھا تو کچ نیانی کے بغیر ھی جاڑے کٹ جائیں گے۔ اب کے تو ٹانگوں سے لاچار ھو جانے میں بس تھوڑی ھی کسر رہ گئی تھی۔ اب میں ھی ھوں، ایسا بوڑھا تو نہیں ھوں لیکن کمزور ھو گیا۔ پتہ نہیں ساری طاقت کہاں گئی؟ دن بھر میں تین چمکوستا مشکل سے طے کر پایا۔ جہاں جانا ھے وھاں تک پہنچنے میں‌تو لگتا ھے تین دن لگ جائیں‌گے...،،

واس بڑی گہری فکر میں ڈوبے ھوئے تھے اور فکر کرنے کی وجہ بھی تھی۔ انھیں کام کرنا کتنا پسند ھے لیکن پھر بھی پیسہ ان کے ھاتھ نہیں لگتا۔ ساری عمر انھوں نے آرام جانا ھی نہیں۔انھوں نے جنگل کاٹ کر قطعے صاف کئے، جوتے، بوئے، گھاس کاٹی،

لیکن جواب انھوں نے پہلے ھی سے سوچ رکھا تھا، ”بھوج کی چھال جمع کرنے جا رہا ھوں، یہیں پاس ھی...“

واس ابھی تین ھی چمکوستا * کے پاس سے گزرے تھے کہ سورج پانی میں غوطہ لگا گیا۔

چوتھے پر اسے رکنا پڑا۔ واس نے ناؤ کو کنارے لگایا اور کگارے پر چڑھ کر جھونپڑی تک گئے لیکن اس کے اندر نہیں گئے۔ گرمیوں میں کوئی کومی کسی قیمت پر بھی جھونپڑی میں رات نہیں بسر کر سکتا — کھٹمل کھا جائیں گے۔ جاڑوں کی بات اور ھوتی ھے جب کبھی کبھی اس طرح کی جھونپڑی میں بیس بیس مسافر تک رہ لیتے ھیں چاھے کھٹمل ھوں یا گھٹن ھو پھر بھی پالے میں اکڑ جانے سے تو بہتر ھی ھے۔ ھاتھ پاؤں گرم ھو جاتے ھیں اور یہ اچھا ھے۔ اور گرمیوں میں جنگل میں رات بسر کرنا کس قدر خوشگوار ھوتا ھے۔

تریپان واس نے الاؤ لگایا تاکہ مچھر نہ حملہ کریں، کچھ ٹہنیاں کاٹ کر رکھیں اور سائبان سا بنا لیا۔ اب آرام کیا جا سکتا ھے۔ واس نے بیٹھ کر کاچ نیانی نکالی۔ یہی رات کا کھانا تھا۔ انھوں نے اپنا چہرہ دھوئیں میں کر لیا۔ مچھر الاؤ کے آس پاس منڈلا رہے

---

* دریائی پڑاؤ جو ۷ سے ۹ کلومیٹر تک کے فاصلے پر غیرآباد علاقوں میں بنے ھوتے تھے۔ کومی لوگ دریائی سفر کی مسافت انھیں سے ناپتے تھے۔ایڈیٹر

وہ اکثر کہا کرتے تھے، ''اس کے بغیر روزی نہ ملے گی،، ۔ مگر وہ محنت بھی کرتے تھے اور پھر بھی بھوکے رہتے تھے...،،

واس ندی کے چڑھاؤ پر دو دن سفر کرتے رہے۔ تیسری صبح کو آخرکار وہ اپنی چراگاہ میں پہنچ گئے۔ وہاں جاڑوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ بس فر کا وہ زبردست درخت، جس کی موٹائی دو کولے بھر رہی ہوگی، جو کنارے پر کھڑا تھا، پانی میں گر پڑا تھا۔ سیلاب کے دنوں میں ندی اس کی جڑوں کو دھوتی تھی... اب وہ گر کر پوری ندی پر چھا گیا تھا۔ اس میں سے ہوکر پانی یوں شور کرتا ہوا گزر رہا تھا جیسے بند سے گزر رہا ہو۔

واس نے فیصلہ کیا کہ ''مچھلیاں پکڑنے کے لئے اچھی جگہ بن گئی !،، لیکن فر کے اس پیڑ کو دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ لڑکپن سے وہ اس پیڑ کے حسن کے شیدائی تھے اور انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ پیڑ ان سے پہلے ہی چل بسے گا۔ ''اور یہی انسان کا بھی ہوتا ہے — جیتا ہے، اپنے سے سارے جتن کرتا ہے، اناج پیدا کرتا ہے، بچوں کو پالتا پوستا ہے اور اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ موت پہلو ہی میں کھڑی ہے۔ اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے؟ فر کا پیڑ تو گرکے بھی کم سے کم بند بن گیا تاکہ میں، ترپیان واس، مچھلی پکڑ سکوں۔ غریب آدمی جب تک جیتا ہے تب بھی اس کی حقیقت کیا ہوتی ہے اور جب وہ نہیں رہ

مچھلیاں پکڑیں، شکار کیا، بیڑے چلائے۔ بس انھوں نے دودھ نہیں دوھا اور کھانا نہیں پکایا، لیکن اس کے لئے تو بیوی تھی ھی۔ پانچ بچے پال پوس کر بڑے کئے۔ یہ امید تھی کہ یہ سہارا ھوں گے۔ لیکن کہاں کا سہارا... بڑی بیٹیاں بیاہ کرکے اپنے گھر چلی گئیں اور بیٹے بھی گھر پر نہیں۔ ایک سرخ فوج میں ھے اور دوسرا سترہ ھی سال کا تھا کہ وہ پیچورا ندی پر سفید گارد والوں کے بیچ میں پھنس گیا اور گھوڑے سمیت لاپتہ ھوگیا۔ لے دے کے بس چھوٹی بیٹی رہ گئی ھے۔

واس نے اپنے بچوں کو بڑے پیار سے پالا۔ کبھی ان پر چیخے چلائے نہیں کہ ''چلو جب تک لڑکپن ھے گھوم پھر لیں، کھیل کھا لیں،،۔ البتہ کچی ھی عمر سے انھیں محنت کرنا سکھایا۔ تریپان واس کو کاھلی نہیں پسند تھی۔انھوں نے بچوں کو یہ تعلیم دی کہ ''جو کام کرو وہ اچھی طرح کرو،،۔کبھی کبھی لوگ سوویت اقتدار کی بات کرنے لگتے کہ آئندہ زندگی کیسی ھوگی لیکن واس صرف یہ کہتے کہ ''نوجوان جیسے چاھیں اپنے لئے بنائیں۔ ھم کیوں اڑنگے لگائیں؟ ھم تو اپنی زندگی جی چکے۔،،

بیٹوں کو واس نے اجازت دے دی کہ اپنے راستے کا انتخاب خود کریں۔ انھیں گھسیٹ کر وہ پرانے طور طریقوں پر لائے نہ ڈھکیل کر نئے کی طرف پہنچایا۔ وہ خود بھی پروھتوں کے خدا پر زیادہ یقین نہیں کرتے تھے۔ان کا اپنا ''خدا،، تھا — محنت۔

نہیں آتے تب تک گھاس ہری رہتی ہے۔ ہفتے بھر
میں ان صاف قطعوں میں گھاس کے ڈھیر نظر آنے لگتے
ہیں۔ ایک گٹھے دو گٹھے بھر کی ڈھیریاں، دو تین
کنیپ بھر کے ڈھیر تو بہت ہی کم ہوتے ہیں۔
لیکن کچھار کی گھاس بڑی اچھی ہوتی ہے اور اسے
لے جانے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ لوگ اپنی
ہنسیا رکھ کر آریاں اور کلھاڑیاں اٹھا لیتے ہیں
اور پیڑ کاٹ کر بیڑے بنا لیتے ہیں۔ اس پر گھاس
لاد کر ندی میں بہا لے جاتے ہیں۔ اس طرح جانوروں
کےلئے چارا بھی آ جاتا ہے اور جاڑوں میں جلانے کے لئے
لکڑیاں بھی۔

تریپان واس کا صاف قطعہ تین طرف سے جنگل سے
گھرا تھا۔ پیڑوں کی گھنی پھننگوں میں سے گزر کر
سورج کی کرن نیچے تک نہ آ پاتی تھی اور کاٹی ہوئی
گھاس صرف ہوا سے سوکھتی تھی۔ واس نے چڑ کر
سوچا، ”دو چار دن انتظار کرنا پڑےگا“۔ ظاہر ہے
کہ وہ گھاس کاٹنے کے لئے پہلی بار نہیں آئے تھے
اور ساری بات اچھی طرح جانتے تھے لیکن ہر سال وہ
عادتاً چڑ جایا کرتے تھے۔ اور اس سال تو انہیں
ویسے بھی کوئی جلدی نہ تھی۔ گھاس کاٹنے کے
بعد کالا گیہوں بھی بونا تھا اور اس میں دو ایک
دن لگ ہی جائیں گے۔ لیکن اب ان کا مزاج ہی ایسا
بن گیا تھا کہ انہیں انتظار کرنا اور خالی بیٹھنا
بالکل پسند نہیں تھا۔

سہ پہر تک واس گھاس کاٹتے رہے۔ دن ڈھلے

جاتا تو کسی چیز میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ ہاں بس یہ کہ عزیز رشتہ‌دار کبھی کبھار یاد کر لیتے ہیں...،،

انھوں نے ناؤ کو گر جانےوالے فر کے پیڑ کے پاس باندھ دیا جس کی جڑیں ابھی تک زمین سے لگی ہوئی تھیں اور اس کی سوئی جیسی پتیاں ابھی تک ہری تھیں ۔ وقت گنوائے بغیر انھوں نے اپنی ھنسیا کی دھار تیز کی اور چراگاہ میں چلے گئے ۔

ھماری ندی کے کگاروں پر چراگاھیں نہ بہت بڑی ہیں اور نہ ہموار ۔انھیں تو چراگاہ کہنا بھی مشکل ھے ۔ جنگل کے صاف کئے ہوئے قطعے زیادہ آسانی‌سے کہا جا سکتا تھا ۔ کچھار بہت تنگ ھے ۔ دریا کے دونوں کناروں پر پہاڑیاں ہیں اور ندی ان کے بیچ میں نالی کی طرح بہتی رہتی ھے ۔ کہیں کہیں پہاڑ ذرا سا ایک طرف کو ھٹ گیا ھے جیسے یہ دیکھنا چاھتا ہو کہ پانی کیا کرےگا؟ بہار میں ندی میں پانی چڑھتا ھے اور جب وہ اترتا ھے تو بس اتنی جگہ میں چراگاہ ہو جاتی ھے — لیکن پہاڑ جیسے اتنی سی بھی عنایت کرنے پر اپنے اوپر خفا ہوتا ھے اور فوراً ھی ندی کو پھر سے دبوچ کر اس کے پیٹے میں پہنچا دیتا ھے اور پھر ایک دو چمکوستا تک ھنسیا چلانے کی کہیں جگہ نہیں رہ جاتی ۔

لیکن لوگوں نے پہاڑی ڈھلانوں پر بھی گھاس کاٹنا اور سکھانا سیکھ لیا ۔زمین پر چھوٹے چھوٹے صاف قطعے ھرے ہو جاتے ہیں اور جب تک گھاس کاٹنےوالے

پرتی چھوڑ دیتا تو! لیکن یہاں تک بھلا ہل کیسے لایا جا سکتا ہے، گھر سے تو بہت دور ہے!،،

واس سر ہلاتے ہوئے آگے چل دئے۔ کوئی کلومیٹر بھر گئے ہوں گے کہ انھیں ایک صاف قطعہ مل گیا۔ انھوں نے خوش ہو کر سوچا، ”یہاں تو سوکھے جنگل کو جلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہاں تو تھوڑے ہی دنوں پہلے آگ لگی تھی... زیادہ سے زیادہ دو ہفتے پہلے۔،، پہلے یہاں پر فر اور لارچ کے پیڑ اگے تھے اور زمین پر کائی کی موٹی تہ جمی تھی۔ واس کو یاد آیا کہ انھوں نے یہاں سے لارچ کے پیڑ کاٹے تھے اور دو دو کولوں کی موٹائی بھر کے ٹھنٹھ چھوڑ گئے تھے اور بہت سی ڈالیں اور ٹہنیاں۔ اسی لئے جب آگ لگی تو سب کچھ جل کر رہ گیا۔

واس نے صاف قطعے کا چکر لگایا اور ڈھونڈا کہ راکھ کی سب سے موٹی تہ کہاں پر ہے۔ ایسی جگہ انھیں مل گئی جہاں پاؤں کے ٹخنے تک دھنس جاتے تھے۔ ”یہ اچھی جگہ ہے۔،، پھر انھوں نے رک کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولے، ”افوہ، کاش بیج ذرا زیادہ ہوتا تو مجھے اناج کی کمی نہ ہوتی۔ میرا اناج کا برتن تو کچھ بھی نہیں چوتھائی قطعے کی بوائی بھی تو نہ کر پائے گا وہ...،،

انھوں نے کھیت کی صفائی کرنی شروع کی۔ ان کےلئے یہ بیج بڑا قیمتی تھا اس لئے انھوں نے ایک ایک گھاس پھوس اور کوئلہ کنکر صاف کرنے کا فیصلہ

فر کے گرے ہوئے پیڑ کے پاس بیٹھ کر انھوں نے
پانچ پرچ مچھلیاں پکڑیں ۔ جلد ھی ٹین کے برتن میں
سے مچھلی کے شوربے کی مہک اٹھنے لگی۔ واس نے
کنکھیوں سے بیج‌والے کالے گیہوں کے برتن کو
دیکھا، ''کاش ایک مٹھی دلیا اور ایک چٹکی نمک
ہوتا!،، پھر انھوں نے فیصلہ کیا، ''نہیں،اسے ھاتھ
لگانا بھی گناہ ھے ۔ یہ کالا گیہوں تو ھماری آخری
آس ھے...،، الاؤ کے پاس بیٹھ کر انھوں نے مچھلی
کا شوربہ پیا اور کاچ نیانی کے ٹکڑے کھائے ۔ بس
رات کا کھانا ھو گیا ۔

بعد کو واس بیج والے برتن کے پاس دیر تک
بیٹھے رھے اور انجلی میں دانے لے کر انھیں گھائیوں سے
گراتے رھے ۔ دانوں کی سنہری، سوکھی، گرم دھار
گرتی رھی ۔ پھر انھوں نے برتن کو اچھی طرح بند
کر دیا، اسے اپنے سائبان کے نیچے سر کے پاس رکھ
لیا اور اطمینان سے سو گئے ۔ خواب میں انھوں نے
اناج کے بڑے بڑے کھیت دیکھے جنھیں زندگی میں
کبھی نہ دیکھا تھا ۔

اگلے دن واس ایسی جگہ ڈھونڈنے لگے جہاں کالا
گیہوں بویا جا سکتا ھو ۔ انھیں ایک ایسے قطعے کی
تلاش تھی جہاں جنگل سوکھ گیا ھو ۔پہلے وہ ایک
پرانی چراگاہ پر پہنچے جو انھوں نے چند برس پہلے
صاف کی تھی ۔ تین سال یہاں سے فصل کاٹی ۔ اب
زمین کمزور ھو چکی تھی ۔ اسے آرام کرنے دینا چاھئے ۔
''اگر میں اسے کسی طرح جوت کر سال بھر کے لئے

سنبھال کر گرانے لگے تاکہ کسی جگہ یکبارگی بہت سا نہ گر پڑے بلکہ ھموار طریقے سے ایک ایک دانہ گرے۔ چلتے چلتے وہ زیرلب ایک دعا بھی پڑھتے جاتے تھے:

"دھرتی ماں اسے پال پوس کر بڑا کر! روشن سورج اسے محبت کی گرمی دے!.."

بوائی کرنے کے بعد انھوں نے زمین کو برابر کیا گویا جیسے تیسے سراون کر دیا۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے سائبان تک پہنچے۔ سورج بہت پہلے ڈوب چکا تھا اور بہت زیادہ اوس گر رھی تھی۔ انھوں نے سوچا، "آج جب میں نے کام شروع کیا تب بھی اوس گر رھی تھی اور کام بند کیا تب پھر اوس گرنے لگی۔"

کوئلیں کوکنے لگیں۔ دن بھر کی گرمی کے بعد ان کے گلوں کو اوس سے ٹھنڈک پہنچی تھی اور نروماده ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔ واس کے پاس ھی ایک بطخ قیں‌قیں کرنے لگی جو اپنے بطخچوں کو جنگل میں سے پکار رھی تھی۔ واس کی سمجھ میں یہ آیا کہ کہہ رھی ھے، "بس ھوا چھپ کے بہت بیٹھ چکے۔ چلو اب ندی کنارے چلو، میں تمھیں تیرنا سکھاؤں‌گی!" بطخچے باریک آواز میں چلائے، "ابھی آئے! ابھی آئے!"

واس آرام کر رہے تھے... وہ بہت تھک گئے تھے اور سارا بدن ٹوٹ رھا تھا اور بھوک سے پیٹ میں اینٹھن ھو رھی تھی لیکن ان کا دل مطمئن تھا۔ جو چاھتے تھے وہ سب کر لیا! اناج کا آٹا پیس کر اسے

گیا تاکہ اناج کے اگنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے... کام کرنے میں اور بھی گرمی لگتی تھی، ڈانس اور مچھر کاٹ رہے تھے۔ دھول میں سانس نہیں لی جاتی۔ لیکن واس نے کسی چیز کی طرف دھیان نہ دیا۔ ان کے دھول سے اٹے چہرے پر پسینہ سٹسیلی نالی کی طرح بہتا اور اس کی بوندیں زمین پر ٹپک پڑتیں۔ واس ذرا دیر دم لیتے اور پھر کام میں لگ جاتے۔ ہر بار جب وہ جھکتے تو ان کی آنکھوں کے سامنے پیلی تتریاں سی ناچ جاتیں، سر چکرا جاتا اور لگتا کہ وہ گر پڑیں گے۔ واس جب اپنی چراگاہ پر لوٹ کر آئے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ کھانے کا ان کا جی نہیں چاھا، سائبان کے نیچے لیٹے اور سو گئے۔ اتنا تھک گئے تھے کہ اس رات انھوں نے کوئی خواب تک نہ دیکھا۔

صبح منہ اندھیرے ھی اٹھ کر پہلے انھوں نے چراگاہ میں گھاس کاٹی اور پھر اپنے صاف قطعے پر جا پہنچے۔ انھوں نے جھکنے کی کوشش کی تو گر پڑے۔ "ایسا لگتا ھے کہ اب اور صفائی نہ کر سکوں گا اور میرے بیج بھر کے لئے تو کافی زمین صاف ہو گئی۔" فر کی ایک ٹہنی لے کر انھوں نے اس سے راکھ اور مٹی کو اچھی طرح ملا دیا۔ "اب بوائی کی جا سکتی ھے۔"

ترپان واس نے بیج کے برتن کو اپنی کمر میں باندھ لیا اور صاف کئے ہوئے قطعے پر چلنا شروع کیا۔ اناج کو مٹھی میں لے کر گھائیوں سے اسے سنبھال

چڑیاں چپ ہو چکی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ بس چیڑ کے جنگل میں اوپر اوپر بگلے اب تک خاموش نہیں ہوئے تھے اور ندی کے اوپر گرے ہوئے فر کے پیڑ میں سے پانی کے غرغراتے ہوئے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔

سورج نکلنے کے قریب واس کے خیالات نے انھیں چھوڑا اور ذرا دیر کے لئے ان کی آنکھ لگ گئی۔

انھوں نے چراگاہ میں دو دن اور گزارے — سوکھی گھاس کا ایک ڈھیر بنایا، برتن بنانے کے لئے بھوج کی چھال جمع کی اور کاچ نیانی پکانے کے لئے چھال اکٹھی کی۔ لعنت ہو ان پر! انھیں کے کھانے سے ترپیان واس بالکل ہی کمزور ہو گئے تھے۔ پیٹ پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا کہ نہ بیٹھ سکتے تھے نہ لیٹ سکتے تھے اور پاؤں سوج کر کندے جیسے ہو گئے تھے... اسی لئے اب انھیں گھر جانے کی جلدی تھی۔ انھوں نے ناؤ پر پورا بوجھ لاد لیا، کاچ نیانی بنانے کےلئے تین کولے چھال، بھوج کی چھال کے سات گٹھے، پانچپے بنانے کے لئے کچھ ڈنڈے اور تھوڑی سی مچھلی، بس ایک وقت کے کھانے کے لئے۔ مچھلیاں پکڑنے کا وقت ہی انھیں کہاں ملا!

ناؤ کو کنارے سے ڈھکیل کر وہ اس کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ ”رخصت، میری چراگاہ! رخصت میرے صاف قطعے! خزاں میں ہمارا انتظار کرنا...“ واس ناؤ کو کھے نہ سکتے تھے۔ بس انھوں نے پتوار اٹھا دی اور کبھی کبھار اسے چلا دیتے تھے کہ ناؤ

کھا نہیں لیا گیا بلکہ وہ پھر دھرتی میں واپس چلا گیا۔ اب ان کی ساری مصیبتوں کا پھل ملے گا!

واس نے اپنے لئے اور کام ڈھونڈ نکالا۔ الاؤ کی روشنی میں بیٹھ کر انھوں نے بھوج کی کھال کے برتن اور کھلونوں جیسے خوبصورت ڈبے بنانے شروع کر دئیے جن میں چھال کا روپہلا رخ اوپر رہتا اور سنہرا رخ اندر کی طرف۔ ان میں چاہے دودھ رکھو، چاہے نمک، چاہے اناج — کومی لوگ کہتے ہیں کہ ''بھوج کی چھال کا برتن ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے، گھر میں بھی، سفر میں بھی۔ اس سے بہتر برتن کہیں نہیں مل سکتا۔ گلتا ہے نہ اس میں زنگ لگتا ہے اور گھستا بھی نہیں ہے!،،

اس رات واس کو بڑی رات گئے تک نیند نہ آئی۔ وہ سائبان کے نیچے لیٹے ہوئے تھے اور ان کے خیالات پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹک رہے تھے۔ انھیں اپنے بیٹے یاد آئے، ''میرے دل کے ٹکڑو! کہاں ہو تم؟ زندہ تو ہو؟ پھر کبھی تمھیں دیکھ تو سکوں گا نہ؟،،

ان کی یاد سے دل میں ٹیس سی اٹھتی تھی۔ دن میں تو کام ایسے خیالات کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا اور کبھی کبھار ہی نگاہوں میں کوئی محبوب چہرہ پھر جاتا ہے لیکن رات کو...

''میں تو تمھارے ہی لئے ہلکان ہو رہا ہوں تاکہ تمھاری زندگی زیادہ اچھی طرح بسر ہو۔ آج کالا گیہوں بو دیا ہے۔ اب جب تم گھر آؤگے تو تمھیں کھلانے کو کچھ تو ہوگا۔ تمھیں کاچ نیانی نہ کھلانی پڑے گی۔،،

ھی کے پیڑ کے نیچے ان کی ماں نے انھیں جنم دیا
تھا اور اسی طرح کے فر کے پیڑ کے نیچے انھوں نے
دم توڑ دیا۔ ان کے سرھانے ان کی بیوی نے بین نہیں
کئے، بچے نہیں روئے۔ ان کا نوحہ صرف اردگرد
بھنبھناتے ھوئے مچھروں نے پڑھا اور فر کے پیڑ کی
پھننگ سے کوئل بڑی دردناک آواز میں کوکی اور
اس نے لمبی گرمیوں کا وعدہ کیا۔ یا شاید وہ گن رھی
تھی کہ تریپان واس کتنے برس جئے؟

اگلے دن واس کے گاؤں والے دریا کے چڑھاؤ پر
گھاس کاٹنے کے لئے روانہ ھوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ
ایک لدی ھوئی ناؤ رسی سے بندھی ھوئی ھچکولے لے
رھی ھے۔ وہ لوگ کنارے پر آ گئے اور فر کے بہت
اونچے پیڑ کے سایے میں انھیں تریپان واس کی لاش
ملی۔ انھیں یہ اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ھوئی
کہ واس کی موت کس چیز سے ھوئی تھی اس لئے کہ
بھوج کی چھال کے گٹھوں کے نیچے انھیں تین کولے
فر کی چھال بھی ملی تھی جس سے کاچ نیانی بنائی
جاتی ھے۔

''روٹی سے تو پوری ناؤ لدی ھوئی ھے!..''

ان لوگوں نے ٹھنڈی سانس بھری، بیٹھ کر اپنے
پائپ پیے اور پھر لاش کو سپرد زمین کر دیا۔

گرمیاں بھی گزر گئیں اور خزاں بھی... جاڑے
آ گئے۔ آسمان پر مٹیالا شامیانہ تن گیا اور زمین پر
سفید چادر بچھ گئی۔ تلخ، سیاہ اور غمناک دن گزرتے
گئے۔ ۱۹۱۹ء کی بہار میں لوگ بھوک سے نہیں

سیدھی چلتی رھے۔ انھوں نے سوچا، ”پانی تو لے ھی جائے گا!“، اس لئے کہ اب وہ بہاؤ پر جا رھے تھے۔ ندی کے موڑ پر ناؤ کے مڑنے سے پہلے انھوں نے اپنی چراگاہ کو ایک بار پھر دیکھا جیسے اس جگہ کو اچھی طرح ذھن‌نشین کر لینا چاھتے ھوں۔

ویچیگدا ندی اپنا کام جانتی ھے۔ ناؤ کو وہ تیزی سے لے چلی۔ واس اگر اس سے پہلے والی شام کو چل پڑے ھوتے تو اپنے گاؤں پہنچ جاتے۔ آدھے راستے پہنچ کر **ان** کی طبیعت سخت خراب ھو گئی اور ناؤ میں کہیں پاؤں پھیلانے تک کی جگہ نہ تھی، ”ٹھہر جاتا ھوں۔ زمین پر لیٹ جاؤں گا تو شاید طبیعت سنبھل جائے گی۔“

ٹھہرنے کو وہ ندی کے کنارے رک تو گئے لیکن ناؤ کو گھسیٹ کر خشکی پر نہ کر سکے۔ انھوں نے اسے ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ خود گھٹنوں کے بل رینگ کر فر کے ایک پیڑ کے پاس پہنچ گئے۔ چاھتے تھے کہ مچھروں کو دور رکھنے کے لئے دھواں کرنے کو لکڑی جمع کریں لیکن یہ بھی نہ کر سکے۔ پیٹ میں ایسا درد تھا کہ وہ تڑپ رھے تھے۔ مچھروں کی اس وقت کسے پروا تھی... ان کا کاٹنا ھوتا ھی کیا ھے؟ ”گھر ... کاش اپنے گھر پہنچ جاتا... گھر!“

تریپان واس اپنے گھر نہ پہنچ پائے۔ انھیں فر کے پیڑ کے نیچے ابدی نیند آ گئی۔

آخرکار ان کے تھکے ھوئے ھاتھ پاؤں کو آرام ملا۔ زمین کے ایک قطعے کو صاف کرتے ھوئے فر

رسول حمزاتوف

میرا داغستان

(قتباسات)

کراہ رہے تھے بلکہ ہوا یہ تھا کہ ویچیگدا کے اوپری حصے پر سفید گارد نے قبضہ جما لیا تھا۔

لیکن پھر بہار آئی، برف پگھلی اور اسی کے ساتھ سفید گارد بھی غائب ہو گئی۔ جیسے جاڑوں میں چلے جانے والے پرندے جنوب کی ہوا کے ساتھ واپس آتے ھیں ویسے ھی سورج کی اولیں گرم شعاعوں کے ساتھ ترپپان واس کے بیٹے واپس آئے۔ وہ ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کے لئے واپس آئے تھے۔

...جنگل کے بیچ میں ایک چھوٹے سے صاف قطعے میں درختوں کے اونچے اونچے سیاہ تنوں کے پاس ھی لمبے ڈنٹھلوں والے کالے گیہوں کے پودے لہلہاتے ھیں۔ فر کے پیڑوں کے چاروں طرف لارچ کے پیڑ شور کرتے ھیں: شائیں شائیں، شائیں، شائیں...

لیکن جنگل کے بالکل سرے پر پیڑوں کی عام آواز میں سے سنائی دیتی ہوئی ایک بہت ھی ھلکی، دبی دبی آواز سنائی دیتی ھے: سرر سرر، سرر سرر۔

کالے گیہوں کی لمبی لمبی بالیاں ھوا کے جھونکے سے دوھری ھو جاتی ھیں، جھک کر اس کی تعظیم کرتی ھیں جس نے اپنی آخری قوت بھی انھیں یہاں اس اکیلے قطعے میں بونے میں صرف کردی تھی۔

چاهئے تاکہ بیٹے کی پیدائش کا اعلان کیا جا سکے۔
جب میں پیدا هوا اور جب میرا نام رکھا گیا تو میرے والد کے ایک دوست نے دو بار گولیاں چلائیں ایک بار چھت پر اور ایک بار فرش پر۔
میری ماں نے مجھے بتایا کہ میرا نام کیسے رکھا گیا۔ میں اپنے گھر میں تیسرا بیٹا تھا۔ ایک بیٹی بھی تھی، میری بہن لیکن هم مردوں کی، بیٹوں کی بات کر رهے هیں۔
پہلوٹھی کے بیٹے کا نام اس کی پیدائش سے بہت پہلے هی سے سارے گاؤں کو معلوم تھا اس لئے کہ دستور یہ هے کہ اسے اس کے مرحوم دادا کا نام دیا جاتا هے۔ یہ بات گؤں کے هر باشندے کو معلوم تھی اور سب کہتے تھےکہ جلد هی حمزہ کے خاندان میں پھر محمد آجائےگا۔
میرے دادا کے صحن میں کبھی کوئی چوپایہ نہیں داخل هوا، سوائے کتوں اور بلیوں کے۔ شاید هی کبھی انھوں نے کمبل اوڑھا هو اور شاید هی انہیں معلوم رها هو کہ زیر جامے کیا هوتے هیں۔ دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر یہ ڈینگ نہیں مار سکتا کہ اس نے محمد کا ڈاکٹری معائنہ کیا تھا، ان کے منهہ کا اندرونی حصہ دیکھا تھا، ان کی نبض دیکھی تھی یا ان سے زور سے سانس لینے اور آهستہ سانس لینے کو کہا تھا یا ویسے کبھی ان کا جسم دیکھا تھا۔ اور اسی طرح همارے گاؤں میں کسی کو ان کی صحیح تاریخِ پیدائش معلوم تھی نہ تاریخ وفات۔ اگر ایک

اس کتاب کے معنی و عنوان کے بارے میں

جشن کے اعلان سے ہوتی تو ہے ہم کو خوشی
اس میں پوشیدہ ہے لیکن اک بھیانک آگہی
(گھڑیال پر نقش عبارت)

باپ تھا جانباز اور تازندگی حق گو رہا
اور یہ بچہ کرے گا نام روشن باپ کا
سر کے اوپر باپ کا خنجر ہے آویزاں یہاں
لوریوں میں ہے اسی کے کارناموں کا بیاں
(گہوارے پر نقش عبارت)

پہاڑ والوں کو دو چیزوں کی حفاظت ضرور کرنی چاہئے: اپنی پپاخ کی اور اپنے نام کی۔ اپنی پپاخ کو وہی سنبھال سکتا ہے جس کی پپاخ کے نیچے دماغ ہو اور نام کی حفاظت وہی کر سکتا ہے جس کے سینے میں آگ ہو۔

ہماری چھوٹی سی ساکلیہ کی چھت میں گولیوں کے بہت سے نشان ہیں۔ میرے والد کے دوستوں نے پستول سے چھت پر گولیوں کی بوچھار کر دی تاکہ آس پاس کے پہاڑوں میں بسیرا کرنے والے عقاب ضرور جان لیں کہ ان کا ایک بھائی پیدا ہوگیا ہے اور داغستان میں ایک عقاب کا اضافہ ہوگیا ہے۔

ظاہر ہے کہ گولی چلانے سے، کارتوس سے بیٹا تو نہیں پیدا ہوتا لیکن کارتوس ڈھونڈ کر ضرور رکھنا

بنائی ہوئی ایک ایک صراحی لئے تھے اور صراحی میں
ظاہر ہے کہ جھاگ‌دار مشروب تھا ۔ بس ایک شخص
کے ہاتھ خالی تھے جو سب سے بوڑھے تھے اور جن کے
سر کے بال اور داڑھی بالکل سفید تھے اور جو اس
قدر معمر تھے کہ باوا آدم کے زمانے کے معلوم
ہوتے تھے ۔

ماں نے دوسرے کمرے سے نکل کر مجھے لے
جاکر انھیں بوڑھے شخص کے ہاتھوں میں دیا ۔ میں
ان بڑے میاں کے ہاتھوں میں مچل رہا تھا اور میری
ماں نے انھیں ان لفظوں میں مخاطب کیا :

”میری شادی میں آپ نے گیت گائے تھے، کبھی
پندور بجاکر اور کبھی جھانجھ بجاکر۔ آپ کے
گیت بہت اچھے تھے ۔ اب آپ میرے بچے کو ہاتھوں
میں لےکر کون‌سا گیت گائیں‌گے؟“

”اے عورت، گیت تو اس کےلئے تو گائےگی جو
ماں ہے، اس کا گہوارہ ہلا ہلاکر، اور پھر کاش
اس کےلئے چڑیاں اور ندیاں گیت گائیں اور اس کے
لئے کاش تلواریں اور بندوقیں بھی گیت گائیں ۔ اور
سب سے اچھا گیت اس کے لئے کاش اس کی دلہن
گائے!“

”تو پھر اس کا نام رکھئے تاکہ میں اس کی ماں،
سارا گاؤں اور سارا داغستان اس کو اسی نام سے جانے
جس نام سے آپ اس کو اس وقت پکاریں ۔“

بڑے میاں نے مجھے اوپر اٹھایا، ساکلیہ کی چھت تک
اور کہا :

عرضی پر اعتبار کیا جائے جو میرے والد کو بدنام کرنے کےلئے لکھی گئی تھی تو دادا محمد تھوڑی بہت عربی جانتے تھے۔ انھیں کا نام میرے والد نے اپنے پہلوٹھی کے بیٹے یعنی میرے بڑے بھائی کو دیا۔

میرے والد کے ایک چچا بھی تھے جو دوسرے بیٹے کے پیدا ہونے سے تھوڑے ہی دنوں پہلے مرے تھے۔ ان کا نام تھا اخیلچی۔

جب اس گھر میں دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو گاؤں والوں نے خوش ہوکر کہا کہ "لو، اخیلچی کو نئی زندگی مل گئی! ہمارے اخیلچی واپس آگئے۔ اب اگر کوا اس کی ساکلیہ پر اترے تو کاش یہ اچھا شگون ہو، برا شگون نہ ہو۔ کاش یہ لڑکا بڑا ہوکر ایسا ہی نیک دل شخص بنے جیسے وہ تھا جس کا نام اس کے حصے میں آیا ہے۔"

چنانچہ جب تک میں میری پیدائش کا وقت قریب آیا تب تک میں میرے والد کے پاس کوئی رشتہ‌دار تھا نہ دوست جو کچھ ہی دن ہوئے مرا ہو یا پردیس میں گم ہو گیا ہو اور جس کا نام مجھے دیا جا سکے تاکہ میں اسی وقار کے ساتھ اسے روئے زمین پر لئے پھروں۔

جب میں پیدا ہوا تو میرے والد نے نام رکھنے کی تقریب میں گاؤں کے سب سے معزز لوگوں کو اپنی ساکلیہ میں مدعو کیا۔ وہ بڑے اہتمام اور اطمینان کے ساتھ ساکلیہ میں بیٹھے رہے۔ایسا لگتا تھا جیسے انھیں پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہو۔ وہ لوگ اپنے اپنے ہاتھ میں ہمارے بلخار کے ظروف سازوں کی

لے جانے والا،، بلکه زیاده صحیح یوں هوگا که ''بات پہنچانے والا،،۔ تو میں کس کا پیغام‌بر اور کونسی بات پہنچانے والا هوں؟

قسمت مجھے چاهے کسی بھی علاقے میں لے گئی هو میں نے اپنے آپ کو اسی زمین، اسی پہاڑ، اسی گاؤں کی بات پہنچانے والا محسوس کیا جہاں میں نے گھوڑے پر زین کسنا سیکھا۔ هر جگه میں خود کو اپنے داغستان کا نامه‌نگار خصوصی سمجھتا هوں۔

لیکن اپنے داغستان میں لوٹ کر آتا هوں تو پوری انسانی تہذیب کے نامه‌نگار خصوصی کی حیثیت سے، اپنے پورے ملک کی بلکه ساری دنیا کی بات پہنچانے والے کی حیثیت سے۔

موضوع

دروازه مت توڑو — وه کنجی سے
به‌آسانی کھل جاتا هے۔

(دروازے پر نقش)

مت کہو که ''مجھے موضوع دیجئے،،
کہو که ''مجھے چشم بینا دیجئے،،
(نوجوان ادیب کے لئے صلاح نیک)

''رفیقان عزیز، میری شدید آرزو هے که میں لکھوں۔ لیکن میں نہیں جانتا که کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ مجھے کوئی ایسا موضوع دیجئے جو

''لڑکی کا نام ہونا چاہئے روشن ستاروں کی طرح یا خوشبودار پھولوں کی طرح۔ مردوں کے نام میں تلواروں کی جھنکار اور کتابوں کی دانائی ہونی چاہئے۔ میں نے کتابیں پڑھ کر بہت سے نام جانے اور تلواروں کی جھنکار میں میں نے بہت سے نام سنے ہیں۔ میری کتابیں اور میری تلواریں میرے کان میں ایک نام کہہ رہی ہیں —رسول۔''

ان بزرگ صورت بڑے میاں نے جھک کر میرے ایک کان میں آہستہ سے کہا، ''رسول''۔ پھر انھوں نے جھک کر میرے دوسرے کان میں زور سے کہا، ''رسول''۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ روتے ہوئے کو ماں کی گود میں دیا اور ان سے اور ساکلیہ میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا، ''یہ ہے رسول''۔

ساکلیہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی خاموشی نے میرے نام کی تصدیق کر دی۔ بوڑھوں نے اپنی اپنی صراحی خالی کی، ہر ایک نے اپنی سونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بلند آواز میں تائید کر دی۔

پہاڑ والوں کو دو چیزوں کی حفاظت ضرور کرنی چاہئے: اپنی پپاخ کی اور اپنے نام کی۔ پپاخ سر کےلئے بہت بھاری ہو سکتی ہے۔ اور نام بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان سفیدریش نے جنھوں نے دنیا دیکھی تھی اور بہت کتابیں پڑھی تھیں، میرے نام میں معنی و مقصد رکھے تھے۔

عربی زبان میں رسول کے معنی ہوتے ہیں ''پیغام

میں اس میٹنگ میں موجود تھا۔ ابوطالب کی بات میرے دل کو لگ گئی۔

مجھے ان لوگوں پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے جو ادیب کو یہ سوال کرکے عاجز کرتے ہیں کہ وہ انھیں اگلے چند برسوں کے اپنے تخلیقی منصوبے کے بارے میں بتائیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادیب کے ذہن میں اپنے کام کا ایک عام نقشہ موجود ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ ناول یا سہ جلدی ناول لکھنے کا منصوبہ بھی تیار کیا جا سکتا ہو لیکن نظم... نظم تو غیر متوقع تحفے کے طور پر مل جاتی ہے۔ شاعر کی دنیا میں قطعی منصوبوں کا دور دورہ نہیں ہوتا۔ اپنے لئے اس طرح کا منصوبہ بنانا ممکن ہی نہیں ہے کہ آج دس بجے صبح میں ایک لڑکی سے محبت کروں گا جو مجھے راستے میں ملےگی۔ یا کل پانچ بجے شام کو میں فلاں لفنگے سے نفرت کروں گا۔

شاعری کسی گلستان کے پھولوں یا رنگ برنگی جھاڑیوں سے مشابہ نہیں ہوتی۔ وہاں سب کچھ آپ کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے اور کسی چیز کو تلاش نہیں کرنا ہوتا۔ شاعری تو میدان کے پھولوں سے، پہاڑی چراگاہوں سے مشابہ ہوتی ہے جہاں ہر قدم پر کسی نئے اور زیادہ خوبصورت پھول کی توقع ہوتی ہے۔

احساس موسیقی کو جنم دیتا ہے، موسیقی احساس کو جنم دیتی ہے۔ کس چیز کو اولیت دی جائے؟ ابھی

ضروری اور بروقت ہو اور میں ایک قابل ذکر کتاب لکھ دوں گا۔،،

اس طرح کی استدعا اکثر نوجوان لوگ ادیبوں کی انجمن کو، رسالوں اور اخباروں کی مجلس ادارت کو یا ذاتی طور پر ادیبوں کو بھیجتے رہتے ہیں۔ ایسے خطوط مجھے بھی ملتے ہیں۔ ایسے خطوط میرے والد کے پاس بھی آیا کرتے تھے۔ وہ اپنا سر ہلاتے اور کہتے:

''یہ نوجوان شخص شادی کرنا چاہتا ہے لیکن کیا بدنصیبی ہے کہ نہیں جانتا کس کے ساتھ۔ اس کے واہمے میں بھی کوئی لڑکی نہیں ہے تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ نسبت کہاں بھیجی جائے۔،،

ایک واقعہ۔ ایک بار داغستان کی ادیبوں کی انجمن کو ابوطالب کا ایک خط ملا جس میں اس شاعر نے درخواست کی تھی کہ انھیں انجمن کے خرچ پر ایک مہینے کےلئے دور کے پہاڑی گاؤں میں تخلیقی کام کے واسطے بھیجا جائے۔ بورڈ کی میٹنگ میں ابوطالب سے پوچھا گیا کہ وہ کس چیز کے بارے میں، کس موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں۔ بزرگ شاعر ناراض ہو گئے:

''کیا واقعی کوئی شکاری یہ بتا سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ کیا لگے گا، خرگوش، بطخ، بھیڑیا یا لال لومڑی؟ کیا واقعی سپاہی کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑائی میں کون سا کارنامہ انجام دے گا؟،،

وہ پہاڑی بکری نہیں رہ گئی۔ جو ٹراؤٹ مچھلی گھر میں تیرتی ہے وہ ٹراؤٹ نہیں رہ گئی۔ جو ہوائی جہاز میوزیم میں رکھا ہوا ہے وہ ہوائی جہاز نہیں رہ گیا۔

بالکل اسی طرح بغیر نغمۂ بلبل کے کوئی بلبل نہیں ہو سکتا۔

آخری بات جو میں موضوع کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک موضوع ہے جسے دعا کی طرح جتنی بار دوہرایا جاتا ہے وہ اتنا ہی بیش قیمت، بلند تر اور متمول تر ہوتا جاتا ہے۔ موضوع جو دعا ہے وہ ہے وطن۔

اگر بچے کو کسی شرارت کی سزا دی جائے تو ہمارے پہاڑی رواج کے مطابق اسے جسم کے کسی بھی حصے پر مارنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن اجازت نہیں ہوتی تو چہرے پر مارنے کی۔ انسانی چہرہ مقدس ہوتا ہے۔ اور ہر پہاڑوالا اس قانون کی پابندی کرتا ہے۔

داغستان — تو میرا چہرہ ہے۔ اور میں اس بات کو روا نہیں رکھ سکتا کہ کوئی تجھ پر ہاتھ اٹھائے۔

پہاڑ کے لوگ جھگڑا کرنے میں بڑے ضبط سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بہت کچھ برا بھلا کہتے ہیں اور ہر ایک اس سب کو برداشت کرتا ہے اور اپنی طرف سے اور برا بھلا کہتا ہے۔

تک یہ سوال طے نہیں ہوا کہ کونسی چیز پہلے وجود میں آئی، انڈا یا مرغی۔ بالکل اسی طرح ادیب موضوع کی تخلیق کرتا ھے یا موضوع ادیب کی تخلیق کرتا ھے؟ موضوع تو ادیب کی ساری دنیا ھے، یہ کل کا کل ادیب ھے۔ موضوع کے بغیر اس کا کوئی وجود نہیں۔ ہر ادیب کا اپنا الگ موضوع ہوتا ھے۔

خیالات و احساسات پرندے ھیں، اور موضوع آسمان ھے۔ خیالات و احساسات ہرن ھیں، اور موضوع جنگل ھے۔ خیالات و احساسات سانبھر ھیں، اور موضوع پہاڑ ھے۔ خیالات و احساسات راستے ھیں، اور موضوع وہ شہر ھے جہاں یہ راستے لے جاتے ھیں اور جہاں جا کر یہ مل جاتے ھیں۔

میرا موضوع میرا وطن ھے۔ مجھے اسے تلاش کرنے اور انتخاب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے وطن کا انتخاب ہم نہیں کرتے، وطن تو بالکل ابتدا ھی سے ہمارا انتخاب کر چکا۔ بغیر آسمان کے کوئی عقاب نہیں ھوسکتا، بغیر پہاڑی ڈھلانوں کے پہاڑی بکریاں نہیں ھوسکتیں، بغیر تیز رو اور صاف ندیوں کے ٹراؤٹ مچھلی نہیں ھوسکتی، بغیر ھوائی اڈے کے ھوائی جہاز نہیں ھو سکتا۔ اسی طرح بغیر وطن کے ادیب بھی نہیں ھو سکتا۔

جو عقاب سست رفتاری سے صحن میں مرغیوں کے بیچ میں گھومتا پھرتا ھے وہ عقاب نہیں رہ گیا۔ جو پہاڑی بکری اجتماعی فارم کے گلے میں چرتی ھے

کتب‌خانوں اور تھیٹروں کی، اور تیرے محنت کے کارناموں کی باتیں کروں۔

اس کے بارے میں نہ اس کے بارے میں، ماضی کے بارے میں نہ حال کے بارے میں میں الگ الگ باتیں نہیں کر سکتا۔ میرے لئے صرف ایک ھی داغستان ھے جو ھزاروں سال جی چکا ھے۔ اس کا ماضی، حال اور مستقبل میرے لئے یکجان ھو چکے ھیں۔

دوسری ریاستوں، دوسرے ملکوں کی تاریخ بہت عرصہ پہلے صرف خون سے نہیں بلکہ روشنائی سے بھی پارچوں اور کاغذوں پر لکھی جا چکی ھے۔ یہ تاریخ صرف سپاھیوں اور سپہ‌سالاروں نے نہیں بلکہ ادیبوں اور مورخوں نے بھی لکھی ھے۔ داغستان کی تاریخ تلواروں سے تو لکھی جا چکی تھی لیکن قلم داغستان کو صرف بیسویں ھی صدی میں ملا۔

داغستان، میں تیری قدیم لڑائیوں کی جگہ گیا، میں بے‌شمار لڑائیوں کے میدانوں میں گیا ھوں جہاں تیرے بیٹوں کی ھڈیاں بوئی ھوئی ھیں۔ ھمارے اجتماعی فارموں کے کھیت، جن میں گیہوں یا مکئی بوئی جاتی ھے، میری اس بات کا برا نہ مانیں۔ اس لئے کہ جب میں نظموں میں آج کے داغستان کی بات کرتا ھوں تو ماضی مجھے ملامت نہیں کرتا۔

جب میں دوردراز بیرونی ملکوں سے واپس آتا ھوں تو پہاڑوالے مجھے گھیر لیتے ھیں اور کہتے ھیں کہ میں نے جو کچھ دیکھا ھو اس کا حال سناؤں۔ وہ

لیکن یه سب اس وقت تک ہوتا رہ سکتا ہے جب تک اس برے بھلے کا تعلق صرف جھگڑنےوالوں کی ذات سے ہو۔ مصیبت آجاتی ہے اگر کہیں اتفاق سے بےخیالی میں کوئی گستاخی کا لفظ ماں یا بہن کی شان میں نکل جائے — تب تو نوبت خنجروں کی آجاتی ہے۔

داغستان تو میرے لئے ماں کی طرح ہے۔ اس بات کو وہ سب لوگ یاد رکھیں جو مجھ سے جھگڑنا چاہتے ہوں۔ مجھے کسی بھی توہین‌آمیز لفظ کا نشانہ بنا کر میری ہتک عزت کی جا سکتی ہے۔ میں سب برداشت کر لوں‌گا۔ لیکن میرے داغستان پر چوٹ نہ کرنا۔

داغستان تو میری محبوبہ ہے اور میرا عہد وفا، میری عبادت ہے اور میری دعا۔ تو میری تمام کتابوں کا، میری ساری زندگی کا واحد اور اہم‌ترین موضوع ہے۔

مجھ سے کبھی کبھی فرمائش کی جاتی ہے کہ میں صرف تیرے ماضی کی بات کروں، پرانے رسوم و رواج کی، قصوں اور گیتوں کی، شادیوں اور تلواروں کی، لڑائیوں کی اور دوستیوں کی، سخت‌جان مریدوں کی اور وفا شعار حسینوں کی، شرافت و شجاعت کی اور جوانوں کے خون اور ماؤں کے آنسوؤں کی باتیں کروں۔

اور کبھی کبھی فرمائش کی جاتی ہے کہ میں صرف تیرے حال کی بات کروں، ریاستی فارموں اور اجتماعی فارموں کی، ٹیم لیڈروں اور ممتاز کارکنوں کی،

بہت معمولی، میری سچائی حقیر ہو یا بہت گہری، میرا احساس قدیم ہو یا معاصرانہ، بہرحال، داغستان، میں لکھتا تیرے ہی بارے میں ہوں ۔ اور جب میں لکھتا ہوں تو قلم میرے ہاتھ میں بے اختیار کانپنے لگتا ہے ۔

مجھے گھیرے میں لے کر بیٹھ جاتے ھیں اور سننے لگتے ھیں — میرے لئے زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کافی ھوتے ھیں وہ چاھے فرانس ھو، ھندوستان ھو، جاپان ھو، یا ترکی ھو۔ لیکن تین گھنٹے بعد بات اپنے آپ ھی داغستان تک پہنچ جاتی ھے۔ میں خود پہاڑوالوں سے داغستان کے بارے میں بات کرتا ھوں اور وہ میری باتیں سنتے ھیں، اس طرح جیسے بالکل پہلی بار سن رھے ھوں حالانکہ وہ تو خود ھی داغستانی ھیں۔

محمود بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا خاص موضوع تھا — مریم سے عشق۔ محمود کے سب سے بڑے دوست نے ان سے ایک لوری لکھوائی اس لئے کہ دوست کے گھر میں بیٹا پیدا ھوا تھا۔ محمود نے کوشش کی لیکن ان سے کچھ نہ بنا۔ جب محمود کی لکھی ھوئی لوری گائی جاتی تو بچہ رونے لگتا حلانکہ اس کو نیند آ جانی چاھئے تھی۔ ایک اور دوست نے محمود سے درخواست کی کہ وہ ان کی بیوی کے مرنے پر مرثیہ لکھ دیں۔ محمود نے کوشش کی لیکن ان سے کچھ نہ بنا۔ محمود کا مرثیہ سن کر کوئی بھی نہ روتا تھا بلکہ کچھ لوگ تو ھنس بھی پڑتے تھے۔

لیکن آج تک جب مریم سے ناکام محبت کے بارے میں محمود کے اشعار گائے جاتے ھیں تو لوگ رونے لگتے ھیں۔

محمود کا خاص موضوع تھی مریم۔ اور میرا خاص موضوع ھے داغستان۔ محبت میری عظیم ھو یا

حصے میں آباد ہے۔ یوری ریتخیو چوکوت خانہ بدوشوں
کی چھاؤنیوں کی روزمرہ زندگی کا اور قدیم روایتوں
اور عقیدوں کے ساتھ آج کی زندگی کے، بیسویں صدی
کی ٹکنیک اور تہذیب کے امتزاج کا بیان بڑے
شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں۔

یوری ریتخیو آج سب سے مشہور اور مقبول سوویت
ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

مصنفین کے بارے میں

یوری ریتخیو

یوری ریتخیو ایک بااستعداد سوویت نثر نگار اور متعدد کتابوں کے مصنف ھیں۔ انھیں سوویت قارئین میں بڑی مقبولیت حاصل ھے اور دوسرے ملکوں کے قارئین بھی ان کی تخلیقات سے اچھی طرح واقف ھیں۔

ریتخیو رینڈیر کی کھالوں سے بنائی جانےوالی جھونپڑی یارانگا میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ھوئے تھے اور شمنوں کے ٹونےٹوٹکے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ھیں۔ انھوں نے ایک سوویت اسکول میں تعلیم حاصل کی جہاں انھوں نے روسی زبان پڑھی اور چوکوتکا سے سوویت یونین کی پوری پہنائی پار کرکے لینن گراد آئے، وھاں کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور چوکوت قومیت کے پہلے ادیب بن گئے۔

اپنی تخلیقات، افسانوں، ناولوں، طویل افسانوں میں وہ اپنی قومیت کی بےلوث اور جانفشاں محنت کا حال بیان کرتے ھیں جو ملک کے برفانی، سرد اور بےرحم

جانسی کیمونکو

اودیگے ادیب جانسی کیمونکو نے آزادی کی زندگی حاصل کرنے سے پہلے ایک طویل اور دشوار گزار راستہ طے کیا۔ وہ مشرق بعید میں تائیگا کے گھنے جنگلوں میں ۱۹۰۰ء میں سوکپائی ندی کے کنارے پیدا ہوئے تھے۔ مستقبل کے اس ادیب نے وھیں شکار کرنے کے پہلے سبق پڑھے اور وہ اپنے ہم‌قومیت اودیگیوں کی طرز زندگی کے شریک رہے۔

اکتوبر سوشلسٹ انقلاب اور اس کے بعد خانہ‌جنگی کے شعلوں میں اودیگے قومیت کے لوگوں کے لئے، جیسے کہ بہت سے دوسرے قومی گروھوں کے لئے، نئی زندگی کی سحر ھوئی۔ جب مشرق‌بعید میں خانہ‌جنگی ختم ھوئی تو جانسی کیمونکو، جو سوویت اقتدار کی فتح کے‌لئے لڑے تھے، شمالی تہذیبوں کے لینن گراد انسٹی‌ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے روانہ ھوئے اور بعد کو انھوں نے سوویت تعمیرات کے مرکزی اسکول سے ڈگری حاصل کی ۔ وہ اپنے وطن واپس آ گئے اور ۱۹۶۹ء میں اپنی موت تک (ان کی وفات شکار کے دوران میں ھوئی) اودیگے بستی گواسیوگی میں اجتماعی فارم کے صدر رھے۔ سابق خانہ‌بدوشوں کا یہ پڑاؤ ایک بڑا قصبہ بن گیا۔ یہاں تائیگا میں اسکول، اسپتال، خوش تعمیر مکانات اور بجلی گھر نمودار ھوگئے۔ ان سب چیزوں کے بارے میں جانسی کیمونکو نے اپنی نگارشات میں لکھا ھے۔

علیم کیشاکوف

کباردینو بلکاریہ کے قومی شاعر اور روسی فیڈریشن کے ریاستی انعام موسوم بہ میکسم گورکی کے حامل، علیم کیشاکوف ایک کسان کے خاندان میں ۱۹۱۴ء میں شالوشکا کی پہاڑی بستی میں پیدا ہوئے تھے جو کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے۔

کیشاکوف کی تخلیقات ۱۹۳۵ء میں شائع ہونی شروع ہوئیں اور اپنی طویل ادبی زندگی میں انھوں نے نظموں کے بیس سے زیادہ مجموعے شائع کئے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں انھوں نے نثر بھی بڑی کامیابی کے ساتھ لکھی ہے۔ کیشاکوف نے اپنے آبائی کباردینو بلکاریہ کے تاریخی واقعات اور اس کی معاصرانہ زندگی کے بارے میں روشن و واضح اور طبعزاد تخلیقات کا پورا سلسلہ پیش کیا ہے، مثلاً تین ناول ''پہاڑی چوٹیاں نہیں سوتیں،،، ''معجزے کا لمحہ،، اور ''گھوڑے کی ٹوٹی نعل،، اور سوانحی ناول ''سفید پہاڑوں سے دکھائی دینےوالا منظر،،۔

اپنے سوانحی ناول ''سفید پہاڑوں سے دکھائی دینےوالا منظر،، میں کیشاکوف نے اپنے آبائی کباردہ میں سوویت اقتدار کے قیام کے پیچیدہ کام کی انجام دھی کا اور اس راستے کا حال بیان کیا ہے جو خود انھوں نے ایک ان‌پڑھ گڈریے سے ایک مشہور سوویت شاعر بننے تک طے کیا ہے۔

چیمیت تسیدنداامبائیف

بریات ادیب چیمیت تسیدنداامبائیف جنوبی کوهستان التائی میں تاباگتائی کے پاس ایک رینڈیر پالنےوالے کے گھرانے میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔

ان کا شاعرانه جوہر کم‌عمری ہی میں نمایاں ہوگیا۔ جب وہ خور کے ثانوی اسکول میں پڑھتے تھے تبھی سے شاعری کر رہے ہیں اور ۱۹۳۷ء سے ان کی نظمیں ان کی جمہوریه کے ایک اخبار میں باقاعدگی سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعه ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانے سے انهوں نے بہت سی نظمیں لکھیں، بریات زبان میں روسی کلاسیکی ادب کا ترجمه کیا اور بریات اور روسی میں ان کی کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ یه کہانیاں بہت ہی غنائی ہیں، ان میں ہلکا سا مزاح اور فطرت سے بےانتہا محبت ہے۔ بعد کو انهوں نے رزمیه صنف میں تصنیفات کیں۔

تمبوت قراشیف

سوویت آدیگئی کے معمر ادیب اور آدیگئی نثر کے بانی تمبوت قراشیف ۱۹۰۲ء میں قاش حبل نامی آؤل (گاؤں) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ساری تخلیقی اور سماجی سرگرمیاں اپنے عوام کی زندگی اور تہذیب سے قریبی طور پر وابستہ رہی ہیں۔ تمبوت قراشیف نے جب ثانوی اسکول کی تعلیم مکمل کر لی تو انہیں مزید تعلیم کےلئے ماسکو بھیجا گیا جہاں انہوں نے صنعتی معاشیات کے انسٹیٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی۔

چوتھی دھائی میں قراشیف نے آؤلوں کی اجتماعیت‌بندی کےلئے اور سوویت آدیگئی میں نئی زندگی کی تعمیر کرنے کےلئے سرگرمی سے انتھک کام کیا۔

قراشیف کے ناول ''خوشی کا راستہ'' کو ۱۹۴۸ء میں سوویت یونین کا ریاستی انعام ملا۔ یہ آدیگئی گاؤں کی اجتماعیت‌بندی سے متعلق بہت مفصل اور پہلودار تصنیف ہے۔ اسی داستان کا منطقی تسلسل قراشیف کے ایک اور ناول ''خواب سے مقابلہ'' میں ملتا ہے جو ایک جدید آدیگئی گاؤں، گاؤں والوں کی آزمائشوں اور مشکلوں، اور ان کی روحانی دنیا کے متمول ہونے کے بارے میں ہے۔ قراشیف آدیگئی لوک ساھت اور کلا کے بھی مسلم الثبوت ماھر ھیں اور ان کے بہت سے افسانے قومی قصوں کہانیوں اور روایتوں پر مبنی ھیں جیسے ''شپسوق کی بیٹی''، ''آبریک''، ''گھوڑوں کے نگراں کا انتقام'' وغیرہ۔

ان ناولوں کے بیانیہ تانے بانے میں لوک کہانیاں
اور قصے اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ انھیں کا جز
معلوم ہوتے ہیں اور انھیں یووان شیستالوف اپنے خاص
کرداروں کی پیچیدہ دنیا کو بے نقاب کرنے کےلئے
استعمال کرتے ہیں ۔

یووان شیستالوف

یووان شیستالوف شمال کی چھوٹی سی قومی جماعت مانسی کے پہلے ادیب ہیں - وہ دریائے اوب کے ساحل پر خانہ‌بدوشوں کے دورافتادہ شمالی پڑاؤ میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے - یووان شیستالوف کے آبا و اجداد مچھیرے اور شکاری تھے - شیستالوف کی تصنیفات میں ان کے آبائی وطن کی قدرت کی حیرت‌انگیز محاکات رچی بسی ہوئی ہیں - درخت اور جانور، مچھلیاں اور ندیاں گھاس اور پودے ایسا لگتا ہے جیسے انسان ہی کی طرح سوچتے اور عمل کرتے ہیں...

یووان شیستالوف کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''میسنے،، کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کے معنی ہوتے ہیں، ''پری،، - ''میسنے،، کی تمثیل مانسی لوک ادب سے مستعار لی گئی ہے - مانسی لوگوں نے اس تمثیل میں خوشی کے بارے میں اپنے سارے دیرینہ خیالات کو مجسم کر دیا ہے - یووان شیستالوف کی شاعری میں ''میسنے،، ایک مزید معنی کی حامل ہے، وہ مانسی قومیت کا آبائی وطن ہے -

یووان شیستالوف کی نثر بھی ان کی شاعری ہی کی طرح طبعزاد اور قومی احساسات سے مملو ہے — ان کے ناول ''سورج میرا پالنا تھا،،، ''نیلی ہوا،، اور ''شمال کا عالم عجائبات،، اس کی مثال ہیں -

26*

رچی بسی ہوتی ہے اور ان سب کی عکاسی وہ نیک نیت
مزاج اور ایک ذرا سی اداسی کے ساتھ کرتے ہیں
اور وہ ایک رومانی روشنی میں دمکتے ہوتے ہیں۔
احمدخان ابوبکر مقبول سوویت ادیب ہیں جنہیں
بیرونی ممالک میں بھی شہرت حاصل ہے۔

احمدخان ابوبکر

مشہور دارگین ادیب احمدخان ابوبکر داغستان کے ایک آؤل (گاؤں) کوباچی میں، جو بلند پہاڑوں میں واقع ہے، موروثی سناروں کے ایک خاندان میں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں ثانوی اسکول کی تعلیم ختم کرکے وہ داغستان کے دارالحکومت مخچ قلہ چلے آئے جہاں انھوں نے ایک مقامی اخبار کے ادارتی عملے میں کام کرنا شروع کیا۔ ان کی ادبی استعداد جلد ہی نمایاں ہوگئی اور ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ماسکو میں گورکی نامی ادبی انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔

ابوبکر کی پہلی کتاب نظموں کا مجموعہ تھی جس کا نام تھا ''آسمان پر نور'' (۱۹۵۴ء) جسے انھوں نے اپنے آؤل کے اجتماعی کسانوں کے نام معنون کیا۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جنھیں پورے سوویت یونین میں سراہا گیا۔ ''دارگین لڑکیاں''، ''محبوبہ کے لئے تحفہ''، اور دوسری طویل کہانیاں معاصرانہ داغستان سے اور اس کی سماجی زندگی میں، اس کے عوام کی نفسیات میں، اور اس کی روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق ہیں۔ ابوبکر کی نثر بہت ہی شاعرانہ ہوتی ہے اور اس میں مصنف کی آبائی جمہوریہ اور اس کے عوام سے گہری محبت

انقلاب کے بعد سے یوکاگیر لوگوں کی نئی زندگی شروع هوئی - ان کی تہذیب پھیلی، انھوں نے ایک تحریری زبان حاصل کی، ان کے اولیں ادیب نمودار هوئے اور ان ادیبوں میں دو بھائیوں گورئیل اور سیمیون کوریلوف کو ممتاز مقام حاصل هوا - کوریلوف برادران کی نظمیں اور کہانیاں اپنے هم‌قومیت یوکاگیر لوگوں کی تصویرکشی دلچسپ اور اچھوتے انداز میں اور سب سے بڑی بات یہ هے کہ محبت اور سچائی کے ساتھ کرتی هیں - سیمیون کوریلوف کی وفات ۱۹۸۰ء میں هوئی -

سیمیون کوریلوف

سیمیون کوریلوف یوکاگیر لوگوں کے پہلے ادیب ھیں ۔یہ ایک چھوٹی سی قومی جماعت ھے جو شمالی یاقوتیہ میں کولیما ندی کے کنارے رھتی ھے ۔ سیمیون کوریلوف ۱۹۳۵ء میں اولیرا جھیل کے کنارے کی ایک بستی میں ایک اجتماعی کسان کے خاندان میں پیدا ھوئے ۔

انھوں نے صرف ثانوی اسکول تک کی تعلیم مکمل کی لیکن اپنے طور پر تعلیم کا سلسلہ بعد کو بھی جاری رکھا ۔ انھوں نے یاقوت، چوکوت، ایوینک اور روسی زبانوں میں مکمل دستگاہ بہم پہنچائی اور ایک گلہ بان اور رینڈیر پالک کی حیثیت سے کام کیا ۔ بعد کو وہ ایک تعلیمی اور تہذیبی ادارے میں کام کرنے لگے اور اپنے ادبی کام کو زیادہ سنجیدگی سے دیکھنے لگے ۔

قدیم روایات سے پتہ چلتا ھے کہ کسی زمانے میں یوکاگیر لوگوں کی تعداد بہت تھی ۔ ٹنڈرا میں ان کے الاؤں سے یہ وسیع پہنائی تاروں بھرے آسمان کی طرح دکھائی دیتی تھی ۔ لیکن زارشاھی روس میں ان کے کٹھن حالات زندگی نے انھیں بالکل معدوم ھو جانے کے قریب پہنچا دیا ۔ پہلے کی کثیر تعداد قومی جماعت میں سے صرف چند سو لوگ باقی رہ گئے ۔ اکتوبر

رئیسہ احمدووا

مشہور و معروف چیچین شاعرہ رئیسہ احمدووا کی پیدائش ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی کام اور محنت کی زندگی کا آغاز اپنے آبائی گاؤں کے اجتماعی فارم کی رکن کی حیثیت سے کیا۔ اس کے بعد ایک ابتدائی اسکول میں معلمہ رہیں اور پھر اخباری کام کے سارے مراحل طے کئے — پروف ریڈر سے لے کر ادبی معاون، مضمون‌نگار اور صحافی تک۔ احمدووا نے اعلی ادبی نصاب کی تکمیل ماسکو میں کی۔

رئیسہ احمدووا کی نظموں کا پہلا مجموعہ چیچین زبان میں ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ تب سے اب تک ان کی تخلیقات قارئین کی کثیر تعداد میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں اور متعدد بار روسی زبان میں نیز سوویت یونین کی دوسری قومیتوں کی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

زیرنظر مجموعے میں ہم نے جو ادبی خاکہ ”کوہستانیوں کا فرزند“ شامل کیا ہے اس میں شاعرہ نے اپنے ہم‌وطن محمود ایسامبائیف کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے ہیں جو ہمارے عہد کے ایک مشہور رقاص ہیں۔

انور بیکچنتائیف

انور بیکچنتائیف قومیت کے اعتبار سے بشکیر هیں۔ ان کی پیدائش اوفا کے ایک دیوانی عہدیدار کے خاندان میں ۱۹۱۳ء میں هوئی۔ انهوں نے اورنبورگ میں تعلیم حاصل کی اور ٹیچرس ٹریننگ کالج سے فارغ التحصیل هونے کے بعد شمال اور مشرق بعید کے اسکولوں میں پڑھانے لگے۔

۱۹۳۳ء میں انور بیکچنتائیف اپنے آبائی شہر اوفا واپس آگئے اور انهوں نے مختلف اخباروں کے ادارتی شعبوں میں کام کیا۔ ادب کی دنیا میں وہ مضمون‌نگار اور افسانہ‌نویس کی حیثیت سے داخل هوئے۔

جب حب‌الوطنی کی جنگ عظیم شروع هوئی تو انور بیکچنتائیف پہلے هی دن اپنی مرضی سے محاذ پر چلے گئے۔ چنانچہ یہ اتفاقی بات نہیں هے کہ ان کی ساری کتابوں میں جنگ کا موضوع ایک اهم مقام رکھتا هے۔

انور بیکچنتائیف کے پہلے هی افسانے ”حیات دوام کا حق،، کو، جو حب‌الوطنی کی جنگ عظیم کے سورما الکساندر ساتروسوف کے بارے میں هے، بجا شہرت و مقبولیت حاصل هوئی۔ تاحال وہ جنگ کے اور جنگ کے بعد کے برسوں کے بارے میں متعدد کتابیں لکھ اور شائع کر چکے هیں۔

بہت سے قصوں کہانیوں، موضوعات اور گیتوں کی
دولت لے کر واپس آیا جس سے اسے اپنی کتابوں کے
لئے بےمثال مواد ملا۔
ولادیمیر سانگی کی پہلی کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع
ہوئی اور اب تک ان کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع
ہوچکی ہیں۔ انسان اور قدرت نیوخ قومیت کے اس
باکمال ادیب کی تخلیقات کا ایک اہم موضوع ہے۔

ولادیمیر سانگی

شاعر اور نثرنگار ولادیمیر سانگی نیوخ قومیت کے پہلے ادیب ھیں۔

نیوخ قومیت کے لوگ جزیرۂ سخالین پر آباد ھیں۔ وھیں شمالی سخالین میں بحیرۂ اخوتسک کے کنارے خانہ بدوشوں کے ایک پڑاؤ نوائبل میں ولادیمیر سانگی ۱۹۳۵ء میں پیدا ھوئے۔ ان کا لڑکپن جنگ کے کٹھن زمانے میں گزرا۔ جب وہ بورڈنگ اسکول میں پڑھتے تھے تبھی انھوں نے اپنی پہلی نظم لکھی۔ ۱۹۵۴ء میں ان کی پہلی کہانی رسالہ ''کستیور،، (الاؤ) میں شامل ھوئی۔ لینن گراد میں اصول تعلیم کے گیرتسن نامی انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل ھونے کے بعد ولادیمیر سانگی سخالین واپس آگئے جہاں وہ ایک ٹیچرس ٹریننگ کالج میں معلم کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے پوری سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ ادبی کام بھی شروع کیا۔

ایک بار سانگی کو خانہ بدوشوں کے پڑاؤ لونوہ میں ریچھ کے تہوار میں مدعو کیا گیا جہاں اپنی قسم کی واحد ابتدائی قدیمی پنچایتی بستی میں ساک کوانگیوں کی نسل کے نیوخی رہتے تھے۔ اس پڑاؤ میں وہ قصہ گویوں سے ملے۔ مستقبل کا ادیب اس تہوار سے

حلیمہ بیراموکووا

قراچائی چیرکیسیا برفپوش پہاڑی چوٹیوں، پہاڑی چراگاہوں، شفاف ندیوں اور تازہ پہاڑی ہوا کا علاقہ ہے۔ یہیں ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں قراچائی شاعرہ اور نثرنگار حلیمہ بیراموکووا ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا بچپن آبائی گاؤں میں گزرا۔ اس علاقے کے قدرتی مناظر کے حسن نے مستقبل کی ادیبہ کے روحانی ارتقا اور شاعرانہ استعداد پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔ علاقائی اخبار میں کام اور اکثر گاؤں گاؤں کے سفر نے نوجوان شاعرہ کے روزمرہ زندگی کے تاثرات میں اضافہ کیا۔ حب الوطنی کی جنگ عظیم کے اولیں ہی دنوں میں حلیمہ بیراموکووا محاذ پر چلی گئیں۔

جنگ کے بعد کے برسوں میں حلیمہ بیراموکووا نے ماسکو میں میکسم گورکی نامی ادبی انسٹی ٹیوٹ کی تعلیم پوری کی۔ ان کی نگارشات ۱۹۳۷ء سے شائع ہونے لگی تھیں اور اب وہ نظموں، کہانیوں اور طویل افسانوں کے متعدد مجموعوں کی مصنفہ ہیں۔

الکسیئی تالویر

چواش ادیب الکسیئی تالویر چواشیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں باتیریوہ میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد الکسیئی تالویر ماسکو آکر ماسکو ریاستی یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی جب وہ ابھی یونیورسٹی کے پہلے ہی سال کے طالب علم تھے۔ اور ۱۹۳۱ء میں ان کا طویل افسانہ ''غلطی'' شائع ہوا۔

یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد الکسیئی تالویر نے کچھ دنوں تک ماسکو میں اخبار ''گدوک'' (سیٹی) کے ادارتی عملے میں کام کیا۔ پھر وہ چواشیہ واپس آگئے جہاں انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ بہت سی نثری تخلیقات کیں۔ ان کی تخلیقات کا اہم‌ترین موضوع ہے سوویت چواشیہ میں مزدور طبقے کی وجودپذیری اور اس کا استحکام۔

الکسیئی تالویر کی خصوصیت یہ ہے کہ ادیب کی حیثیت سے ان کے تخلیقی کام میں اور چواش قومیت کی معاصرانہ زندگی کے درمیان بڑا قریبی اور گہرا رشتہ ہے۔

سالچک توکا

توو‌ا قومیت کا ادب بھی ان کی تحریری زبان کے ساتھ ھی ساتھ (۱۹۳۰ء میں) وجود میں آیا جس سے اس جمہوریہ میں تہذیبی انقلاب کی ابتدا ہوئی۔

توو‌ا کے سوویت ادب میں ادبی نثر کی بنا سالچک توکا (۱۹۰۱ء تا ۱۹۷۳ء) نے ڈالی جو عظیم نثری رزمیہ ''اندھیرا اجالا،، کے مصنف ھیں۔ یہ توو‌ا قومیت کی تاریخ کے اہم‌ترین دور کا، جو ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ھے، وقائع‌نامہ ھے۔ کتاب الگ الگ کہانیوں پر مشتمل ھے جنھیں مرکزی کردار کی غنائی شخصیت نے ایک رشتے میں منسلک کر دیا ھے۔ مرکزی کردار توو‌ا کی ایک عام عورت اور اس کے پانچ بچے ھیں۔ انھیں کہانیوں میں مصنف اپنے بارے میں، اپنے حصول علم اور ادبی تخلیق کے راستے کے بارے میں اور اس بارے میں بھی بتاتے ھیں کہ کیسے وہ طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے ماسکو پہنچے، انھوں نے مشرق کی قوموں کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وھاں تندھی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد توو‌ا واپس آئے اور اھم تخلیقی اور سماجی کام میں مصروف ہوئے۔

گینادی کراسیلنیکوف

اودمورت ادیب گینادی کراسیلنیکوف (۱۹۲۸ء تا ۱۹۷۴ء) والگا علاقے میں ایک کسان خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کم عمری ھی میں لکھنا شروع کر دیا تھا، جب مڈل اسکول کے طالب‌علم تھے تبھی۔ گینادی کراسیلنیکوف نے اپنے افسانوں اور خاکوں کا موضوع نوجوانوں کو بنایا اور ان کے کردار کی تشکیل کی طرف خاص توجہ کی۔

۱۹۵۲ء میں گینادی کراسیلنیکوف نے ماسکو کے گورکی نامی ادبی انسٹی‌ٹیوٹ میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۳ء میں ان کے وطن میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ھوا۔ جلد ھی اس کا ترجمہ روسی زبان میں بھی شائع ھوگیا۔ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے اپنا طویل افسانہ ''پرانا گھر،، شائع کیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد کی دھائی کے شروع میں گینادی کراسیلنیکوف نے ناول کے صنف کی طرف توجہ کی۔ معاصرانہ تنقید نے اس اودمورت ادیب کے رزمیہ فن کو بہت گرانقدر قرار دیا اور انھیں ''طویل نثرنگاری کا استاد کامل،، کہا۔

ونیامن چیستالیف

بنی کوئی سو برس پہلے بہت کم ھی لوگ ایک
چیوٹی سی قومیت کے بارے میں جانتے تھے جو
بےاورچھور شمالی جنگلوں کے بیچ میں چھپی ہوئی
تھی۔ اس قومیت کو زیریانی کہا جاتا تھا جس کے
لفظی معنی ہوتے ہیں ”دھتکارے ہوئے لوگ،،۔ کومی
قومیت کے لوگوں کو واقعی روس کی زارشاھی حکومت
نے ھر اس چیز سے دھتکار دیا تھا جو کسی بھی
قوم کے حسب معمول ارتقا کےلئے ضروری ھوتی ھے۔ ان
کی اپنی نہ صرف یہ کہ کوئی تحریری زبان نہ تھی
بلکہ وہ سرکاری دفتروں میں اپنی زبان میں بات بھی نہ
کر سکتے تھے۔

کومی قومیت کے اولیں ادیبوں میں سے ایک تھے
ونیامن چیستالیف (۱۸۹۰ء تا ۱۹۳۹ء)۔وہ پموزدینو
گاؤں میں ایک ضلع کلرک کے گھر میں پیدا ہوئے۔

انھوں نے اپنے آبائی وطن کے قدرتی مناظر کے حسن
کو دل سے محسوس کیا اور اپنی نثرونظم میں انھیں
مناظر قدرت کے،ان کے عظیم حسن کے گیت گائے ھیں۔

ان کی نثری نگارشات میں سے ”بیتے دنوں کی
کہانی،، کو اھم قرار دیا جاتا ھے جس میں مفلس کسان
کی نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ھے جو محتاجی
سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بھی دینے پر
آمادہ تھا۔

خیزگل اوشالیموف

داغستان کے نثرنگار، جمہوریائی انعام کے حامل خیزگل اوشالیموف ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔

نوجوانی میں انھوں نے اجتماعی فارم کی کھیتوں میں کام کرنےوالی ٹولی میں کام کرنا شروع کیا، پھر علاقے کے اخبار میں کام کیا اور تات لوک ادب کے نمونے جمع کئے۔

انھوں نے حب‌الوطنی کی جنگ عظیم میں حصہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں فوجی خدمت سے سبکدوش ہونے پر اخبار ''داغستانی پراودا'' کے ادبی معاون بن گئے۔ وہ تات زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کی نگارشات ۱۹۳۶ء سے شائع ہو رہی ہیں۔

پہاڑی گاؤں میں نئی طرز زندگی اور لوگوں کے درمیان نئے رشتوں کے قیام کا عمل خیزگل اوشالیموف کا خاص موضوع ہے۔ ان کی کہانیوں میں مزاح اور توازن و تقابل کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ اپنی تحریروں میں پہاڑی قومیتوں کے لوک ادب سے استفادہ بڑے پیمانے پر کرتے ہیں۔

عیارانہ بھی ہیں اور غمناک بھی، دانشمندانہ بھی ہیں اور سبق آموز بھی اور عوامی کہاوتوں اور اقوال سے بھری ہوئی ہیں۔

رسول حمزاتوف صحیح معنوں میں سوویت داغستان کے رسول ہیں۔ وہ اپنے علاقے اور عوام کی حکایات و کوائف کی ترسیل دنیا کے کونے کونے میں کرتے ہیں۔

رسول حمزاتوف لینن انعام یافتہ، داغستان کے عوامی شاعر، سوشلسٹ محنت کے ہیرو اور مقبول ترین اور معروف ترین سوویت ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے نام سے صرف سوویت یونین ہی میں نہیں بلکہ اس سے باہر بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں بیشمار لوگ واقف ہیں۔

رسول حمزاتوف

داغستان کے لوگ کوهستان قفقاز میں بہت بلندی پر رہتے ہیں۔ اس علاقے میں ۳۶ قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں جن میں ایک قومیت کا نام ہے آوار۔ یہیں کوهستان قفقاز کی بلندترین چوٹیوں کے سایے میں آوار کے ایک پہاڑی گاؤں تسادہ میں عوامی شاعر حمزہ تساداسہ کے گھر میں رسول حمزاتوف کی پیدائش ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ جب وہ ۱۱ سال کے تھے تب انھوں نے اپنی پہلی شعری تخلیق کی۔ داغستان میں اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد رسول حمزاتوف نے اعلی تعلیم ماسکو کے گورکی نامی ادبی انسٹی ٹیوٹ میں حاصل کی۔

رسول حمزاتوف کی نظموں کے مجموعوں ''بلند ستارے''، ''تسبیح سہ و سال''، ''مشمن نظمیں'' اور دوسرے مجموعوں کا ترجمہ سوویت یونین کی اور دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

رسول حمزاتوف کی پہلی نثری کتاب ''میرا داغستان'' بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ زندگی اور فن کے بارے میں رسول حمزاتوف کے افکار کا مجموعہ ہے۔ کتاب بڑے رواں انداز میں اور مشرقی طرز کی حکایات و لطائف کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ جگہ جگہ اشعار نقل کئے گئے ہیں اور حکایات شامل کی گئی ہیں جو